Acc No.
9812

نہایت دلچسپ پاکیزہ معاشرتی ناول

صائقہ

1613
ناول

Azad
URDU LIBRARY
Peerbahore Patna-6.

رضیہ بٹ

قیمت

۱۶/

سولہ روپیہ

ناشر:- مکتبہ اردو (ستمبر ۱۹۷۶ء) پرنٹر:- نظامی پریس لکھنؤ

Govt. Urdu Library
9872

ریاض بھائی کے نام

جن کے پرخلوص مشورے سے "صاعقہ"
کا حسن اور نکھر گیا۔

رضیہ بٹ

Azad
Women
URDU LIBRARY
Peerbahore Patna-6.

اونچی نیچی سبزہ پوش پہاڑیوں کے دامن میں پھیلے ہوئے طویل و عریض میدان میں الحمرا کی خوبصورت عمارت اک وقار سے استادہ تھی چاروں طرف قدرت نے حسن کے انمول خزینے لٹائے تھے۔ یہ قطعۂ زمین قدرت کی صناعی کا شاہکار تھا سبزے کی مخملی فرش، رنگ برنگے پھول، لہلہاتی بیلیں، جھومتے درخت اور پتلی سی آبشار کی صورت میں گرتا ہوا پہاڑی ندی کا چمکتا ہوا پانی چار طرف حسن ہی حسن تھا۔ رعنائی ہی رعنائی تھی۔

ایسی جگہ میں رہائشی عمارت کی تعمیر کسی حسن پسند طبع ہی کا انتخاب تھا سرخ سرخ گنبدوں اور سنہری ستونوں والی عمارت اس دلفریب ماحول میں گھری ہوئی کسی البیلی حسینہ کی طرح دکھائی دیتی تھی۔

کشادہ کمرے، وسیع برآمدے، خوبصورت گیلریاں، نفیس ڈرائنگ روم ماربل ڈائننگ ہال، آراستہ و پیراستہ عمارت اپنے مکینوں کے اعلیٰ ذوق، امارت اور عظمت کی مظہر تھی۔

نواب فاروق علی خاں کو فوت پائے تقریباً بیس برس گزر چکے تھے۔ لیکن انکی بیوہ حسن بانو حیات تھیں۔ انکی عمر تقریباً ساٹھ برس سے متجاوز تھی سرخ و سپید چہرے اور چاندی کی طرح چمکتے ہوئے سفید بالوں نے انکے رعب، وبدبے اور وقار میں اضافہ کر دیا تھا۔ صدیوں پرانی روایات کی

قائل تھیں۔ زمانہ بدل چکا تھا۔ ذہن بدل چکے تھے۔ سوچ کی راہیں بدل چکی تھیں لیکن انکے سوچنے کے ڈھنگ نہیں بدلے تھے۔ نام نمود، وقار اور ظاہری آن بان کے لئے جان کی بازی لگا دینے کی حامی تھیں۔ زندگی میں اس نظریئے کی بنا پر بڑے بڑے روح فرسا حادثات سے دوچار بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے نظریئے میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی خدا نے سعادتمند اولادی تھی۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، منجھلا بیٹا طاہر اپنی یادگار صاعقہ کی صورت میں دیکر داغ مفارقت جوانی ہی میں دے گیا تھا۔ بڑا بیٹا اظہر اور چھوٹا فخر۔ دونوں بیٹیاں نجم آرا اور حسن آرا سب کے جوان سالہ اولادیں تھیں۔ لیکن ماں کے ادب و احترام میں کوئی فرق نہ آیا تھا حسن بانو کی چھوٹی بڑی شادیاں تھیں۔ بہلہاتے پھولوں، کھلی کونپلوں اور پھوٹتے شگوفوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہوتی تھیں۔ بچوں کے بچے انھیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھے دونوں بیٹوں سے سگی بھابیاں بیاہی تھیں۔ اس لئے محبت اور مستحکم ہو گئی تھی۔

یوں تو سبھی بچے ان کی آنکھوں کا تارہ تھے لیکن سب پر فوقیت ریحان کو حاصل تھی۔ جوان سال ریحان تو جیسے انکی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کے بڑے بیٹے کے پہلے بیٹے تھے۔

ریحان دادی کے التفات کو جانتے تھے۔ شوخ تو بچپن ہی سے تھے اس التفات نے اور شہ دے رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب اور جو بات بھی کہہ دیتے، دادی کو اتنا پڑتی۔ دادی حضور کے رعب اور دبدبے نے اگر کسی سے مرعوب ہونا سیکھا تھا تو وہ صرف ریحان کے چچا تھے ورنہ اور سب کے لئے وہ ایک مطلق العنان فرمانروا سے کم نہ تھیں۔

محل کی فضا بڑی خوشگوار تھی۔ فخر کے چھوٹے بچوں اور حسن آرا کی آخری بچی کے علاوہ سبھی حصولِ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ زراعت تہیقوں کے طوفانوں اور خونیکوں کے سیلابوں کی صورت میں پھوٹ رہی تھی۔ اٹھراہ کے در و دیوار فکرِ فردا سے بے نیاز اور غمِ ماضی سے ناآشنا حال کی آسودگی سے ہم کنار جانیوں کے لہکتے شب و روز گواہ تھے۔

ہر دن عید اور ہر شب شبِ برات تھی زندگی انکے لئے گلہائے رنگین کا مہکتا ہوا دستہ تھی۔ پھول ہی پھول بکھرے تھے۔ چاروں طرف حسن ہی حسن تھا گرد و پیش، کھیل تماشے، سیر و تفریح۔ دلچسپ صحبتیں۔ خوشگوار نشستیں یہی منتہائے زندگی تھا۔ ماحول فردوسی رعنائیوں کا عامل تھا لیکن ۔ اسی فردوسی رعنائیوں کے ماحول میں ۔۔۔ جہاں قہقہے طوفانوں کی صورت میں اٹھتے تھے جہاں خوشیوں کے نا پیدا کنار ٹھاٹھیں مارتے تھے۔ جہاں زندگی کے حسن پر کوئی تلخی سایہ فگن نہ تھی۔ جہاں اہلِ خانہ تو ایک طرف کنیزیں اور خدام بھی لطفِ زندگی لے رہے تھے۔ ایک ہستی ایسی بھی تھی جو اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی اسکی دلفریبیوں سے فیضیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اور وہ تھی صاعقہ ۔۔۔ صاعقہ ۔۔۔ صاعقہ ۔۔۔ طاہر مرحوم کی واحد یادگار۔ بن ماں کی بچی جس نے اس عشرت کدے میں جنم لیا۔ پلی، بڑھی اور جوان ہوئی ۔ لیکن اسے زندگی کے گلہائے رنگین نہ ملے۔ چاروں طرف کانٹے ہی کانٹے نظر آئے۔ طنز و تمسخر نے قدم قدم پر اس کا پیچھا کیا۔ نفرت و حقارت برسائی، نظروں نے ہمیشہ اس کا تعاقب کیا۔ بیس سال پورے بیس سال گذر چکے تھے۔ یہ بیس سال اس کیلئے لمحاتِ نشاط کے حامل نہ تھے۔ جو گزرتے پتہ بھی نہ چلتے۔ یہ بیس سال تھے جنکے ہزاروں دن لاکھوں گھنٹے اور کروڑوں منٹ تھے۔ یہ ہزاروں، لاکھوں

اور کروڑوں اذیتیں تھیں جو صاعقہ نے سہیں۔ زندگی کے لمحے لمحے نے اس کے خون کے قطرے قطرے کا امتحان لیا تھا۔

صاعقہ دست قدرت کا شاہکار تھی۔ اس کا ملکوتی حسن اک خاص شان کا حامل تھا۔ چمپئی رنگ۔ جو دائمی ادا سے اک کشش بے پناہ لیے ہوئے تھا۔ حسین سرمئی آنکھیں جن میں خوابیدہ جادو چونک اٹھنے کو بیتاب تھا۔ نرم و گداز جسم، انتہائی مرزوں قد، رعنائی و دلفریبی کا مرقع تھی وہ۔

آواز میں نغموں کا رس تھا۔ زیر و بم میں سلگتا ہوا اضمحلال دل میں کسک پیدا کرتا تھا۔ وہ عمر کے محشر بداماں دور میں داخل ہو چکی تھی — اس کے حسن کی محشر سامانیوں سے جیسے کوئی آگاہ ہی نہ تھا۔ نہ ریحان نے کبھی اسے اپنے تصورات میں بسایا تھا۔ نہ اسد و فرخ نے اپنے سینوں میں اسے کھونے سے جگہ دی تھی۔ نہ فریدوں و شاہد نے اس کے متعلق کسی رومانی خیال کو ذہن میں آنے دیا تھا۔ یہ تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ کسی نے کبھی اسے نگاہ لطف و کرم تک نہ بخشی تھی۔ صاعقہ نے ہمیشہ ان کی نظروں میں اجنبیت پائی تھی یا طنز کی چمک دیکھی تھی۔

وہ جب تک شعور کو نہ پہونچی تھی، اس نادر اسلوک کو یہ نہ سمجھی تھی۔ وادی سے لیکر آخری فرد تک اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے۔ صرف اکبر کبھی کبھی تھیں یا فخرہ چچا جن کا رویہ اہل خانہ سے کچھ مختلف تھا لیکن اس سے صاعقہ زندگی کا سکون نہ پا سکتی تھی۔ اکبر پھوپھی دور رہتی تھیں۔ کبھی کبھار آتا تھا۔ اور فخر چچا ماں جلال اور بھتیجے کے تیوروں کو دیکھ کر اس سے کھلم کھلا یا خانہ سلوک نہ کرتے تھے۔

صاعقہ بچی تھی۔ تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ اپنے ہم عمروں سے کھیلنے کودنے کی تمنائی تھی۔ اور بار بار اس تمنا کی اسے تلخ سزا ملی تھی۔ اسکے شعور نے جب ہی

ان تلخیوں کو جانچنا سیکھ لیا۔ وہ خود بخود اپنے ہم عمروں سے دور ہٹتی گئی۔
اس نے اپنی ذات کو الگ تھلگ کر لیا۔ اس کے مزاج میں اپنے باپ کا سا
شاہانہ وقار تھا۔ وہ بلا ضرورت کسی سے بات کرتی نہ کسی کے پاس بیٹھتی۔ اس
کھنچاؤ کا ایک فائدہ ضرور ہوا۔ ہم عمروں کا یہ رویہ گو بدل نہ سکا۔ ہاں کچھ نرم
ضرور ہو گیا لیکن اس کے رویے کی معمولی سی تبدیلی صاعقہ کی المناک زندگی میں
رنج و غم کے سیاہ سائے نہ ہٹا سکی۔ اس کی ذات کو اب تک اسی شدت سے
منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ تنفر ابھی موجود تھا۔ بعض اوقات تو اس کا بے اختیار
جی چاہتا کہ اس ناقابل برداشت ماحول سے کہیں دور بہت دور بھاگ
جائے۔ لیکن اس کے لئے جائے پناہ کہیں بھی نہ تھی۔ اکثر مایوس ہو کر سوچا کرتی کہ
اپنے آپ کو پہاڑی ندی کے تیز رفتار پانی کے حوالے کر دے۔ کبھی کبھی ماں کی
سے اس ندی میں کود جائے۔ جو محل کے نشیبی حصے سے ٹکرا کر گزرتی ہے لیکن یہ سوچ
اور شے ہے اور عمل اور۔ زندگی ہزار بار بے رنگ سہی۔ لیکن پھر بھی اپنی
جاذبیت نہیں کھوتی۔ انسان جیتا ہے اور جیے چلا جاتا ہے۔ صاعقہ بھی
انسان تھی اس کے سینے میں گوشت پوست کا دھڑکتا دل تھا۔ دل۔ جو
زندگی کی تال سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے کی آرزو رکھتا تھا اور۔ اور جب
سے اس دل نے ایک مرکز چن لیا تھا۔ صاعقہ کی زندگی بیشک بوجھل تو کچھ
زیادہ ہی ہو گئی تھی۔ تاہم اس بوجھ میں بھی اک حسن کھنچ آیا تھا۔ انگیٹھی دہکنے آئی
تھی۔ جینے کی تمنا جینے کے بجائے کچھ شدید کی ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے دل نے
انجانے میں جو مرکز منتخب کیا ہے۔ وہ اس کی دسترس سے کہیں بہت دور ہے
ہے۔ ریحان۔ کہاں وہ اور کہاں ریحان۔
ریحان، جسے نے نفس کی خاطر ہمیشہ اسے تختۂ مشق بنایا تھا جس کی

آنکھوں میں اس نے ہمیشہ اجنبیت پائی تھی۔ جس نے ہمیشہ اسے حقارت سے دیکھا تھا وہ جانتی تھی۔ سب کچھ جانتی تھی۔ لیکن دل تو آخر دل ہی تھا کہنے سے باز آنے کی چیز تھوڑی ہی تھی۔

صاعقہ کی زندگی کچھ عجیب طرح ڈوبتے ابھرتے گزر رہی تھی۔ احمق دل کی گستاخانہ حرکت پر کبھی تو ہنسی آجاتی ــــ کبھی رونا ــــ کوئی مونس و غمگسار نہ تھا۔ حالات کی یہ نئی افتاد تو بعض اوقات اسے اس قدر پریشان کر دیتی کہ اسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گی۔ لیکن ان پریشانیوں کے لمحوں میں تسکین کا سرمایہ آیا کی آغوش تھی۔ اس کی آیا واحد ہستی تھی جو اس کے زخموں پر پھایا رکھ دیتی تھی۔ آیا نے اسے پالا پوسا تھا۔ اس کے دکھ کو دکھ جانا تھا۔ ماں کی سی شفقت کے داس اس کے لئے پھیلائے تھے۔ تیز اور قہر برساتی نظروں سے اسے حتی المقدور دور رکھنے کی کوشش کی تھی۔ آیا کا وجود ہی تھا جو صاعقہ ایسے ناسازگار ماحول میں زندگی کی ڈوری تھامے بڑھتی چلی گئی تھی۔

دیکھنے میں آیا جتنی کریہہ المنظر تھی۔ دل کی اتنی ہی حسین تھی۔ کسی حادثے میں جل جانے سے اس کی ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ چہرے کا بچا کھچا گوشت کہیں سے سفید کہیں سے سیاہ تھا۔ ایک آنکھ اوپر کو کھنچ گئی تھی۔ بال چھوٹے چھوٹے اور کھردرے سے تھے۔ دیکھنے میں خاصی ہیبت ناک تھی۔ لیکن صاعقہ نے اس آغوش میں ہمیشہ پیار کی ٹھنڈک اور سکون پایا۔ وہ اسکی سچی ہمدرد اور غمگسار تھی۔ اسکا دل جب گھبراتا تو آیا کی ممتا بھری آغوش میں آتے حقیقی سکون ملتا۔ رونے کو دل مچلتا تو آیا کا دامن چھلکتے آنسوؤں کا سہارا دیتا۔ گھر والوں کے بے رحم رویے اور ناروا سلوک سے جب وہ دل برداشتہ ہو جاتی تو صرف آیا ہی اسکی سچی ہمدرد تھی کیفیتوں پر

پیار کی ٹھنڈک کے چھینٹے دیتی۔

زندگی اسی ڈھنگ سے گزرتی چلی جا رہی تھی۔ صاعقہ ناکردہ گناہ کی بھگت رہی تھی۔ ان واقعات کی تلخی سہہ رہی تھی۔ جو اس کی پیدائش سے قبل وقوع پذیر ہوئے تھے۔ اس کا کوئی دوش نہ تھا۔ کوئی قصور نہیں تھا لیکن وہ مورد الزام ٹھہرائی گئی تھی۔ انتقامی جس اک ناکردہ گناہ کو جھیل کر شاید تسکین پا رہی تھی:۔

اکیس بائیس برس ادھر کی بات ہے۔ نواب فاروق علی خاں زندہ تھے اختر کی حیات افروز رفقیہ بانی کے قدم سے تھیں۔ لیل و نہار کی گردشیں ان دونوں اک خاص حسن کی حامل تھیں۔ اور اصول ان کی زندگی کے اہم جزو تھے لیکن یہ گھریلو زندگی کی دل کشی پر اثر انداز نہ ہوئے تھے بڑے لڑکے اور دونوں لڑکیوں کی شادیوں سے فارغ ہو چکے تھے۔ ان دنوں منجھلے بیٹے طاہر کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ چوبیس پچیس سالہ خوب رو فاروق علی خاں کو دوسرے بچوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی عزیز تھے اس کی پیدائش نے طاہر کی طبیعت بیمار پڑ گئی تھی اور ضد کو جنم دیا تھا من مانی کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ ماں کی مخالفت کے باوجود پچھلے سال یورپ کے تفریحی دورے پر نکل گئے تھے۔ فوٹو گرافی کا شوق جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا یورپ سے جب لوٹے تو آدھے سے زیادہ سامان چھوٹے بڑے کیمروں ـــــ اپنی بنائی ہوئی بیشمار تصویروں اور فوٹو گرافی کی دوسری چیزوں پر مشتمل تھا۔ طاہر جب سے یورپ سے

بنے شغل ہی یہی رہ گیا تھا۔ اکثر صبح ہی صبح کیمرہ کندھے پر ڈال کر نکل جاتے۔ قدرت کے بکھرے ہوئے انمول خزینوں کو سلولائیڈ پر منعکس کرتے اونچی نیچی گل پوش پہاڑیاں گنگناتی ندی مترنم شور پیدا کرتے ہوئے جھرنے ۔۔۔ جنگلی خودرو پودے ۔۔۔ دیہاتی دوشیزائیں، جانوروں کے ریوڑ سورج کی ڈوبتی ابھرتی روشنی، کبھی کبھی انکے کیمرے کی آنکھ میں مقید ہو جاتے۔ رقص و نغمہ کا فسوں خیز حسن انھیں للکارتا اور وہ چپ چاپ اپنا کیمرہ اٹھا کر باہر نکل جاتے۔ رات گئے تک ماحول کے حسین عکس کیمرے کی آنکھ میں جلوہ گر رہتے۔ فن کی لگن فنکار کو اپنی ہستی سے بیگانہ بنائے جا رہی تھی اور یہی بیگانگی جہاندیدہ نظروں میں کھٹکنے لگی۔ حسن بانو بحیثیت ماں اس بیگانگی کو دل ہی دل میں محسوس کرتی تھیں جسکی فوری روک تھام کیلئے انکی نظر میں شادی ضروری تھی۔

وہ موسم کی ایک خوشگوار رات تھی۔ چاند کا سفینہ سینۂ چرخ پر آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ خنک ہوا دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ دن بھر سورج کی تمازت سے گھبرایا ہوا ماحول فرحت بخش سکون میں ڈوب رہا تھا۔ الحمرا کے دالان میں نواب فاروق علی خاں، اور حسن بانو بیٹھے تھے۔ پاس ہی رکھی انکی تو صد و دلچسپی کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسکی طفلانہ حرکتوں سے دونوں محظوظ ہو رہے تھے۔ "اسے دیکھ کر مجھے اکثر طاہر کا بچپن یاد آجاتا ہے۔" حسن بانو نے شفقت سے ریحان کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ "بالکل باپ پر گیا ہے۔۔۔" نواب فاروق علی خاں پیار سے پوتے کو دیکھ کر بولے۔ "شکل صورت میں بھی تو انیس بیس ہی کا فرق ہے ۔۔۔ وہی ناک نقشہ۔ بچپن میں وہ تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔"

"بال تو بھی بالکل طاہر کے ہیں ۔۔۔" حسن بانو نے ریحان کو گود میں لیا

جو تھک کر اب سو جانے کو تھا۔

"مزاج بھی اسی کا ہے"

"ہائے اللہ ــــ مزاج تو اس جیسا نہ ہو۔ ضدی جہاں کا ــــ"

"ضدی ضرور ہے مگر گستاخ نہیں"

"میں نے کب کہا گستاخ ہے لیکن ضد ــــ تو یہ یا اللہ۔ جو بات ایک بار دل پہ پتھر پہ لکیر ہو جاتی ہے ــــ کیا مجال جو پوری نہ ہو جائے"

"یہ تو اس کے کردار کے مضبوط ہونے کی نشانی ہے بیگم"

"دھت ــــ آپ نے یہ ہی کہہ کر اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ ہر بات ہی سے اس کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرتے آئے ہیں"

"یہ سراسر زیادتی ہے بیگم"، نواب پیار سے بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرائے "اس کی جائز بات ہم نے ہمیشہ مانی ہے۔ میں تو کہوں گا کہ ناجائز خواہش کبھی کی ہی نہیں ــــ"

"کیا کہنے"

"اور کیا ــــ اس کا مطالبہ ہمیشہ جائز اور معقول ہوتا ہے۔ ہم ذرا ذرا ضد بھی سے کام لیتے ہیں ــــ مناسب ــــ"

"فلاک مناسب ــــ"

"کیوں؟"

"اور کیا"

"کون سا نامناسب مطالبہ ہم نے پورا کیا ہے، اس کا؟"

"صبا کبھی کچھ زیادہ دیر تو نہیں ہوئی"

"کس بات کو؟"

"اس کی ہٹ ــــ جو آپ نے پوری کر دی۔"

"کون سی ہٹ؟"

"ابھی پچھلے سال کیا ہوا تھا ــــ"

"اوہ ــــ نواب پھر دھیرے سے مسکرا کر بیوی کی طرف دیکھ کر بولے

"تو را مطلب اس کے یورپ جانے سے ہے۔"

"اور کیا۔"

نواب فاروق علی خاں نے ہنس کر کرسی کی پشت سے کمر ٹکا دی۔

"بڑی جائز بات تھی نا"، بیوی پیار بھرے شکایتی انداز میں بولی۔

"نامناسب بھی تو نہ تھی۔ اس عمر میں سیر و سیاحت کا کسے شوق نہیں ہوتا۔"

"یہاں شادی کی بات شروع تھی اور وہ سیر کے پروگرام بنا رہا تھا۔

کر پٹخا میں نے ــــ لیکن بات آخر اسی نے منوائی۔"

"کوئی بات نہیں بیگم ــــ شادی بھی کر دیں گے۔"

"جانے کب کر دیں گے ــــ"

"انشاء اللہ اب کے سردیوں میں اس فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں گے۔"

"اور اگر سردیوں میں اس نے پھر کوئی مناسب و معقول مطالبہ پیش و تجویز کر دیا ــــ" بیگم نے تیکھی مسکراہٹ اور پیار بھری نظروں سے شوہر کو دیکھا

"تو پھر شادی اگلی سردیوں تک ملتوی کر دی جائے گی۔" نواب فاروق نے ہنسنا بیگم کو چھیڑا۔

"اگلی کیوں ــــ اس سے بھی اگلی سردی میں کہئے۔" بیگم خفا ہو گئیں۔

"دیا سوئے ریحان کو سنبھالا۔ دیا کو تھپکی کہ نواب نے ہنستے ہوئے ہاتھ پکڑ لیا۔ "خفا ہو گئیں؟"

"خفگی کس بات کی؟ ــــ وہ بدستور خفا تھیں ــــ "بچہ سو گیا ہے گود میں نیند خراب ہو رہی ہے۔"

"کنیز لے جائے گی۔ ٹھہرو میں بلاتا ہوں ــــ وہ جا رہی ہے۔" انھوں نے بیٹھے بیٹھے کنیز کو پکارا۔ وہ لپک کر آئی۔ حسن بانو کی گود سے ریحان کو لیکر چلی گئی۔ حسن بانو روٹھی روٹھی بیٹھی رہیں۔ نواب نارو ق چند لمحے انھیں دیکھتے رہے پھر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"ناراض کیوں ہو گئیں۔ کہہ جو دیا۔ اب کے سردیوں میں شادی ہو جائیگی گھبرانے کی کیا بات ہے۔"

"ابھی کوئی بات ہی نہیں ــــ چھ سال ہو گئے منگنی کو۔"

"وہ تو ہونا ہی تھے۔ کل گیارہ برس کی تھی فوزیہ۔ جب یہ نسبت ٹھہرائی۔"

"اب تو سترہ اٹھارہ برس کی ہو رہی ہے۔"

"معقول عمر ہے ــــ طاہر بھی ماشاء اللہ پچیس سال کا ہو گیا۔"

"پچیسویں میں ہے۔ اس کی عمر میں تو اظہر کے ماشاء اللہ تین بچے بھی ہو گئے تھے۔"

"وہ ہم نے اس کی عمر ہی میں شادی کر دی تھی۔ بیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا۔" "کوئی بُری بات تو نہیں۔ کسی خوبصورتی سے اپنی ذمہ داریوں کو نباہ رہا ہے، اک یہ ہے کہ سارا دن آوارہ گردی ــــ"

"بیگم ــــ اس کے شوق کو آوارہ گردی نہ کہو۔ تمھارا بیٹا اک عظیم فنکار ہے ــــ تمھیں اس بات پر فخر ہونا چاہیئے ــــ"

بیگم نے برا سا منھ بنایا۔ طاہر کی فنکارانہ صلاحیتوں کو پرکھنے یا انکی تعریف کرنے سے زیادہ انھیں اس کی شادی کا فکر تھا۔

دیر تک حسن بانو اور نواب فاروق اسی شادی کی باتیں کرتے رہے حسن بانو کی بہن کی دونوں لڑکیاں انھوں نے اپنے بیٹوں سے بچپن ہی میں منسوب کر دی تھیں۔ بڑی کی تو شادی ہوئے عرصہ ہو گیا تھا ــــ ریحانہ ماہ رخ اور شاہ رخ تین بچے بھی ہو گئے تھے۔ لیکن فوزیہ کا معاملہ التوا میں تھا حسن بانو یہ شادی جلد کرنے کی متمنی تھیں۔ بہن کی طبیعت اکثر ناساز رہا کرتی تھی۔

"نگہت بانو بیمار رہتی ہیں۔ انکی خواہش ہے کہ جیتے جی اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔" حسن بانو نے کہا۔

"ہمیں خود اس بات کا احساس ہے۔" نواب سنجیدگی سے بولے۔ "اس دفعہ چھٹیوں میں یہ کام بھی نپٹا جائے گا۔"

"نگہت بانو سے کہدوں۔ تیاری کرلیں۔" بھی مدت ہوئی۔ ہے۔ پھر چند مہینے ہی تو ہیں۔"

"ضرور کہدو۔" نواب نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔ "تم خود بھی تیاری شروع کر دو۔ ہم یہ شادی ایک خاص شان سے کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیوں؟" بیگم تیکھی نظروں سے دیکھ کر مسکرائی۔

"ہمارے طاہر کی شادی ہے۔"

"بڑا آیا لاڈلا۔"

"وہ تو سب جانتے ہیں۔ ہمیں اعتراف بھی ہے۔ ساری اولاد سے زیادہ عزیز ہے ہمیں۔"

بیگم نے اک فخر سا محسوس کیا۔ محبوب شوہر کے عزیز ترین بیٹے کی ماں جو تھیں۔

دوپہر کچھ گرم سی تھی۔ ظاہر حسب عادت کیمرہ کندھے پر لٹکائے اونچی نیچی گلپوش پہاڑیوں پر گھوم رہے تھے، دھوپ چھاؤں کے امتزاج کو مختلف زاویوں سے جانچ رہے تھے۔ آج کچھ ایسے دلآویز اور دلکش مناظر دکھائی دے رہے تھے، کہ ظاہر کو وقت اور گرمی کا احساس ہی نہ رہا۔ چاکلیٹی، تپلون اور سفید قمیضیں پہنے کبھی پہاڑیوں کے نشیب میں نظر آتے، کبھی چوٹیوں پر۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی، لیکن ڈوبتے سورج کی آڑی ترچھی کرنوں کی حدت بھی کافی تھی۔ یہاں موسم گرمیوں میں بھی خاصا خوشگوار ہوا کرتا تھا صرف چند دن سورج کی تمازت ماحول کو جھلسا دیا کرتی تھی۔ پھر کہیں نہ کہیں سے ابر باراں آجاتے، تیز ہوائیں چلتیں۔ بارش برستی اور موسم پر چھانا پھر چھا جاتا۔

آج گرمی خاصی تھی۔ ظاہر کو اس کی شدت کا احساس اس وقت ہوا جب ان کا حلق سوکھ گیا۔ پیاس محسوس ہوئی، وہ اس وقت خود رو پھولوں کے کنج کے قریب کھڑے تھے، وہیں کھڑے کھڑے انھوں نے گرد و پیش نظر دوڑائی کوئی قدرتی جھرنا قریب دکھائی نہ دیا۔

وہ گھوم کر دوسری طرف مڑ گئے۔ کچے راستے پر پہاڑیوں پر چڑھنے لگے۔ پیاس شدت اختیار کر گئی۔ اپنے خشک ہونٹوں کو انھوں نے کئی بار زبان سے تر کیا۔

قدرے ہموار حصے میں آکر انھوں نے پھر متجسس نظریں ادھر ادھر دوڑائیں اوپر دو تین موڑوں پر چند کچے مکانوں کے کواڑ نظر آرہے تھے۔ پیاس سے

تک نڈھال کر دیا کہ وہاں تک جانے کے خیال ہی سے انھیں گھبراہٹ ہونے لگی، مڑ کر دائیں جانب دیکھا۔ دوسری پہاڑی پر سبزے میں گھرا ہوا جھرنا دکھائی دیا۔ پانی چھوٹ چھوٹ کر بہہ رہا تھا۔ چمکتا ہوا پانی دیکھ کر انھیں سکون اور ٹھنڈک کا احساس ہوا، لیکن دوسرے ہی لمحہ ان پر وہی پہلی سی گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ اس جھرنے تک پہونچنے کے لئے انھیں پھر نیچے اتر کر دوسری پہاڑی پر چڑھنا تھا۔ طاہر تھک چکے تھے، درختوں میں گھرے ہوئے بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر سستانے لگے، چند منٹ آرام کرنے کے بعد بدن میں تازگی آ سکتی تھی جو انھیں جھرنے تک پہونچنے کی ہمت دلا سکتی۔ درختوں کی چھاؤں میں ہوا خوشگوار تھی۔ طاہر نے کیمرہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور درخت سے ٹیک لگا کر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اطمینان سے نیم دراز ہو گئے، آنکھیں بند کر کے وہ پیاس بجھانے کا کوئی نفسیاتی علاج سوچنے لگے۔ اچانک انھیں یوں محسوس ہوا جیسے قریب ہی کہیں نقرئی گھنٹیاں جھنجھنا اٹھی ہوں، ہلکے ہلکے نسوانی قہقہوں کا مترنم اور نغمہ بار شور سکوت کے سینے میں گدگدی سی کرنے لگا۔ طاہر نے آنکھیں کھول دیں۔ اب سکوت طاری تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئے، چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ اک بار پھر وہی نغمہ بار اور مترنم سا شور گویا جیسے رنگین ساغر کھنک گئے ہوں۔ اب آواز اور قریب سے آ رہی تھی۔

اس قربت نے سمت سے آگاہ کیا، طاہر کی نظریں اس ٹیڑھے میڑھے کچے پہاڑی راستے کی طرف اٹھ گئیں، جو اوپر کی طرف سے آ رہا تھا، اور جس کے کنارے وہ بڑے سے پتھر پر خود بھی بیٹھے ہوئے تھے، یہ راستہ اوپر کے گاؤں کو جاتا تھا، طاہر کی نظریں اس راستے پر لگی تھیں قہقہوں اور باتوں کی آواز قریب آتی جا رہی تھی، طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فضا میں شہنائیوں کی گونج بس رہی

ہو ۔ اور پھر۔ طاہر کے قریب ہی موڑ پر مین پار نسوانی مجسمے ابھرے پہاڑی گاؤں کی لڑکیاں جوانیاں سردی پر پانی کی گاگریں اٹھائے خراماں خراماں اوپر چلی آرہی تھیں۔ ان کے جوان سال جسم سر پر رکھے ہوئے بار کی وجہ سے بار بار ربڑ کی طرح سے لچک رہے تھے۔ پانی چھلک چھلک کر گر رہا تھا۔ اور انکے لالی پیلے ڈھیلے ڈھالے لباس جسم سے چپک چپک جاتے تھے۔

طاہر نے ایک نظر انھیں دیکھا۔ انھیں یوں محسوس ہوا۔ جیسے زندگی کے افق پر بیک وقت کئی چاند طلوع ہو گئے ہوں۔

لڑکیاں ہنستی مسکراتی ایک دوسرے سے میٹھی میٹھی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی۔ بے دھڑک چلی آرہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو طاہر اس حسین جلوے کو ضرور سلوٹ لائیڈ پر منتقل کر لیتے۔ لیکن! اس وقت انھیں شدت سے پیاس لگ رہی تھی، گاگروں سے چھلکتے پانی نے بے صبر بنا دیا۔ زندگی کی ازلی ضرورت پورا کرنے کا خیال مقدم تھا۔

جھرنے کی طرف جانے کا تکلیف دہ مسئلہ قدرت نے خود ہی حل کر دیا۔ طاہر بالوں کو جھٹک کر ماتھے سے پیچھے ہٹاتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے لڑکیاں موڑ مڑتے ہی انکے سامنے تھیں۔ اک اجنبی کو اس طرح راستے میں کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں بے اختیار سب کے ہاتھ اپنے اپنے ڈوپٹوں کی طرف گئے۔ بھیگے ڈوپٹے لاشعوری طور پر سب نے اپنے سینوں پر پھیلانے کی کوشش کی۔ وہ سمٹیں، کترائیں۔ اور تنگ راستے پر آگے پیچھے ہو کر طاہر کے قریب سے گزرنے کے لئے بڑھیں۔ انھیں اوپر جانا تھا۔

"ذرا سنیے" طاہر نے بڑی لجاجت سے پہلے لڑکی کو مخاطب کیا۔ لیکن وہ بغیر رکے آگے بڑھ گئی۔ اس کے حواس پر گھبراہٹ تھی۔ طاہر نے

اچھی طرح محسوس کی تھی یہ بات۔ دوسری لڑکی بھی رُکے بغیر آگے بڑھ گئی۔
تیسری نے جیسے دو قدم اک لمحے میں اٹھا کر عجلت سی بھری اور دوسری کو ڈھکیل کر پہلی کے برابر ہو گئی۔
"مجھے تھوڑا سا پانی پلا دیجئے۔" طاہر انھیں اس بے اعتنائی سے جاتے دیکھ کر قدم بڑھا کر چوتھی لڑکی کے برابر ہو گئے۔
وہ لڑکی رکی اور پھر تن کر کھڑی ہو گئی۔
طاہر نے اس کے سراپا کو دیکھا۔ حسن و جمال کی مکمل تصویر انکے سامنے تھی۔ سرخ و سفید چہرے پر بھیگے بالوں کی لٹیں چپک رہی تھیں شبنمی آنکھوں میں فسوں انگیز چاندنی کا عکس تھا۔ طاہر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی لڑکی نہیں بلکہ فطرت کا ایسا روپہلی جال ہے جو روحوں کو عقید کرنے کیلئے ساری فضا میں پھیلا دیا گیا ہے طاہر مشدد رہے اس پیکر جمال کو دیکھتے رہے۔
"کیا کہتے ہو۔" لڑکی نے خالص دیہاتی انداز میں پوچھا، اسکی ساتھی لڑکیاں اگلا موڑ مڑتے ہوئے دہشت زدہ ہرنیوں کی طرح گردنیں گھما کر انھیں دیکھ رہی تھیں۔
"تھوڑا سا پانی پلا دو۔" طاہر نے اس کی شبنمی آنکھوں میں جھانک کر کہا لڑکی کا اکھڑا سا لہجہ جانے کیوں دل کو بھا گیا تھا۔
"پانی" وہ ابرو کھینچ کر بیگانگی سے پوچھنے لگی۔
"ہاں"
"کیا کرو گے"
"پیوں گا"
"پیاس لگی ہے"

"ہاں"

"وہ سامنے دیکھو"

بلور بین گردن کو دائیں رخ موڑ کر اس نے دوسری پہاڑی پر چھوٹے چھوٹے گرنے والے جھرنے کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا دیکھوں۔؟"

"جھرنا نظر نہیں آتا ہے"

"تو جاؤ۔ پانی پی لو"

"وہاں تک جا سکتا تو پھر بات ہی کیا تھی" طاہر جلدی سے بولے۔

"کیوں نہیں جا سکتے؟" حیرت سے لڑکی کی حسین آنکھیں پھیل سی گئیں۔ طاہر کو سر تا پا بڑی معصومیت سے گھور کر دیکھا۔ نگاہوں کا یہ حسین انداز دیکھ ہی میں تو اتر گیا، پیاس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی روح بھی تشنہ محسوس ہوئی

"میں وہاں تک نہیں جا سکتا، پیاس سے زبان سوکھ رہی ہے، مجھ میں ہمت نہیں"

"ہوں" لڑکی نے تمسخرانہ انداز میں اپنی کومل کی ناک سکوڑی اور پھر انھیں گھور کر بولی "اتنے ہٹے کٹے تو ہو، وہاں تک نہیں جا سکتے"

اور وہ اک شان بے نیازی سے آگے بڑھ گئی، تیز قدم اٹھا کر وہ اپنی رنگولیوں سے جا ملی، جو موٹر پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

طاہر اس کا حسین کو دیکھتے رہ گئے۔

"کیا کہتا تھا؟" لڑکی کی بھی سی سرگوشی ابھری۔

"کہتا تھا پانی پلا دو۔ پیاس لگی ہے" لڑکی بے پروائی سے بولی۔

"پلا دو انھیں ناجی۔ بیچارے کو اللہ جانے کتنی پیاس تھی"

"تم پلا دو" ناجی اٹھ پڑی۔

"مجھ سے تو اس نے مانگا ہی نہیں ۔" پہلی لڑکی بولی۔

"کھڑی کیوں ہو گئی ہو۔ آگے بڑھو۔" دوسری لڑکی نے کہا۔

"دیکھو تو بیچارہ کتنی حسرت سے دیکھ رہا ہے، تیسری نے رُک کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا، ناجی نے گاگر سمیت گردن موڑ کر دیکھا۔ طاہر کی نگاہیں بھی انھیں پر لگی تھیں۔

"ہونہہ" وہ آگے بڑھنے لگی۔

"ناجی"

"کیا ہے"؟۔

"بری بات ہے۔"

"کیا ۔۔۔؟"

"اسے پانی پلا دینا چاہیئے۔"

"ہاں ہاں۔ ہمارے پاس پانی ہے۔"

"کسی کی پیاس بجھانا ثواب کا کام ہے۔"

"بیچارہ آدمی۔"

ناجی کے خوبصورت ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں "بیچارہ بیچارہ نہ کہو یہ شہری لوگ جتنے ہی چالاک ہوتے ہیں، ماں کہتی ہے ان سے بچ کر رہنا چاہیئے پانی کے بہانے باتیں کرنا چاہتا ہے۔"

"ہوں" لڑکیوں نے اپنا سر گردنوں کو اس طرح گردشیں دیں جیسے ناجی کی بات سے متفق ہو گئی ہوں۔

چاروں سست سست قدم اٹھاتی ہوئی اور سرگوشیاں کرتی جانے لگیں پھر جاتے جاتے کچھ سوچا چاروں رک گئیں۔

پانی پلانا ثواب کا کام ہے، شاید اس بات پر چاروں متفق ہو گئی تھیں۔

"تم جاؤ!"

"نہیں تم!"

"نا جی تم ہی چلی جاؤ۔ چھوٹی سی تو گاگر ہے تمہاری۔ ہمارے سروں پر دو دو گاگریں ہیں۔"

"ہاں ہاں جاؤ بھی۔ دیکھو تو بیچارہ اب بھی ادھر ہی دیکھ رہا ہے۔ ہم یہاں پر رکتی ہیں۔ تم جلدی سے پانی پلا کے آجاؤ۔"

"جاؤ بھی ثواب کا کام ہے۔"

اور۔

مجبوراً نا جی کو اپنی چھوٹی سی گاگر سمیٹ کر اٹھانا پڑا۔

طاہر کے چہرے پر مسرت کن جذبات کی جھلک سی دکھائی دی۔ انھیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ جذبۂ دل کی کشش واقعی اثر انگیز ہوتی ہے۔

نا جی سر پر گاگر اٹھائے محشر خیز چال چلتی ہوئی، طاہر کے قریب آ رہی تھی، طاہر نے اسے مڑتے دیکھ کر ہی منھ دانستہ پھیر لیا تھا، جیسے کہ وہ اسکی آمد سے بے خبر ہوں۔

"اے بابو!" نا جی ان کے قریب آتے ہی بولی۔

"کیا ہے؟" طاہر مڑے اور چہرے پر مصنوعی تناؤ پیدا کیا۔

"پانی پی لو۔" سر پر سے گاگر اتارتے ہوئے وہ بولی۔ اس کا گداز جسم لچک گیا طاہر جھکی جھکی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔

"پی لو نا!" ہاتھ میں گاگر پکڑے وہ کھڑی تھی۔

طاہر بغیر کچھ کہے ٹک ٹک اسے دیکھے گئے۔

صاعقہ

"کیا دیکھ رہے ہو۔؟ پی لو نا پانی!" ناجی جیسے لڑ پڑنے کو تھی۔

"مجھے نہیں چاہیئے تمہارا پانی۔ ہٹا کٹا تو ہوں جھرنے پر جا کر خود پی لونگا"۔

طاہر اس کی حسین آنکھوں کے سحر سے مسحور ہوتے ہوئے بولے۔

"اے واہ! نہیں پیتے تو نہ پیو۔ بڑے آگئے کہیں سے" اس نے بازو کو گردش دیکر گاگر سر پر رکھی چھلکتا ہوا پانی چھلک کر اسکے بالوں کو بھگوتا ہوا کپڑے تر کر گیا۔

وہ جانے کو مڑی لیکن قدم اٹھانے سے پہلے ہی طاہر نے بڑھ کر اسکا راستہ روک لیا۔

"لاؤ پلا دو"

ناجی نے قہر آلود نگاہوں سے انھیں دیکھا۔

غصے میں وہ کتنی دلکش نظر آرہی تھی، طاہر کا جی چاہتا تھا کہ وہ یونہی کھڑی رہے اور وہ اسے دیکھتے رہیں، برابر دیکھتے رہیں۔ حتیٰ کہ ساری عمر بیت جائے تیوری چڑھا کر اس نے پھر طاہر کی طرف دیکھا۔

"لاؤ نا۔ پلا بھی دو اب!"

ناجی تذبذب میں تھی۔

طاہر نے اسی پتھر پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اوک سی بنا دی۔

ناجی نے انکی طرف دیکھا، کچھ جذبۂ ترحم آنکھوں میں ابھرا۔ بغیر کچھ کہے اس نے گاگر سر سے اتاری اور ایک ہاتھ سے گاگر کا منھ پکڑتے ہوئے دوسرے سے گاگر کو نیچے سے سہارا دیا۔ اور پھر اس نے اوک میں دھیرے دھیرے پانی ڈالنا شروع کر دیا۔

پانی کی خمیدہ دھار اوک میں پڑنے لگی قدرے جھکی ہوئی ناجی کسی

شاعر کا اچھوتا تخیل معلوم ہو رہی تھی، جھکنے سے بالوں کی لمبی لمبی آوارہ لٹیں شانوں سے کھسک کر آگے جھک آئی تھیں۔ دو ایک بار بالوں کے سرے طاہر کے ہاتھوں سے بھی چھو گئے۔

پانی جتنا ادک میں گر رہا تھا۔ اتنی ہی زمین پر گر رہا تھا۔ طاہر عالم وارفتگی میں اس بت طناز کو دیکھے جا رہے تھے، پانی پینے کا ہوش ہی کہاں تھا۔

"بس" ناجی انکی نظروں کے انہماک سے شاید گھبرا گئی تھی۔

"نہیں۔ اور۔" طاہر اسی طرح دیکھتے ہوئے بولے۔

ناجی نے دوسرے ہاتھ سے گاگر کو قدرے اونچا کیا، اور پھر پانی انڈیلنے لگی، گاگر آدھی ہو گئی تھی۔ لیکن طاہر کی پیاس اب تک نہ بجھی تھی۔ پیاس پانی سے بجھنے کا سوال ہوتا تو کب کی بجھ چکی ہوتی، یہاں تو روح کی تشنگی تھی جو اس قربت سے بھڑک اٹھی تھی۔

"بس؟" ناجی نے گاگر میں جھانکتے ہوئے پوچھا!"

"نہیں۔ اور۔" طاہر وارفتہ سے کہتے۔

"پیٹ ہے یا تنور۔ ساری گاگر خالی کر دی اور پیاس ہی نہیں بجھتی۔"

جھلا کر ناجی نے گاگر سیدھی کر لی۔ اس کے ماتھے پر واضح شکنیں تھیں اور آنکھوں میں غصہ کی چنگاریاں۔

"احسان کر کے جتلایا نہیں کرتے" طاہر مسکراتے ہوئے اٹھے اور جیب سے رومال نکال کر ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے "شکریہ"

ناجی نے غصہ سے انکی طرف دیکھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"سارا پانی ختم کر دیا، اور اب مجھے پھر پانی لانا پڑے گا۔"

ناجی کی معصومیت، سادگی لوحی۔ اور کھڑا سا انداز تخاطب طاہر کے سینے

میں گدگدی کی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

"لاؤ میں بھر کے لادوں۔" طاہر نے گاگر لینے کو ہاتھ بڑھایا۔

"اب وہاں جانے کی ہمت آ گئی ہے۔" وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

"ہاں" طاہر محظوظ ہوتے ہوئے بولے "اب تو اس سے بھی زیادہ دور جا سکتا ہوں۔ لاؤ گاگر دے دو۔ بھر کر تمہارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

"گھر" ناجی مشتبہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں"

"وہ کیوں۔؟"

"تمہارے احسانوں کا بدلہ چکا دوں گا نا"

"رہنے دو۔" ناجی نے ایک حسین انداز میں ناک سکوڑ کر ہونٹوں کو دلفریب گردش دیتے ہوئے طاہر کی طرف دیکھا۔ "سب جیسے میں جانتی نہیں۔"

"کیا؟" شوق تجسس سے طاہر نے پوچھا۔

"تمہاری چالاکی"

"چالاکی"

"اور کیا۔"

"وہ کیسے؟"

"اس طرح تم میرے گھر کا پتہ لگانا چاہتے ہو نا" اس نے جیسے بہت بڑا انکشاف کیا، طاہر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"مجھے تمہارے گھر کا پتہ لگانے کی کیا ضرورت ہے بھلا، سلسلہ کلام جاری رکھنے کی غرض سے طاہر بولے۔

"جیسے میں جانتی نہیں" شکوک نظروں سے طاہر کو دیکھتے ہوئے وہ قدرے مسکرائی

"کیا؟"

"ماں کہتی ہے شہری لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھروں کے بچے لگا لیتے ہیں۔ ماں کہتی ہے ان سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ اسی لئے تو میں نے تمھیں پانی نہیں پلایا تھا۔"

"اچھا۔" دلچسپی سے دیکھتے ہوئے وہ بولے۔

"ہاں تو؟" اکھڑپنے سے کہا گیا۔

"لیکن پھر کیوں آ گئیں؟"

"تمادو کہتی تھی۔ پانی نہ پلانے سے گناہ ہوگا۔"

"ناجی!" دور مورچہ پر کھڑی لڑکیوں نے آواز لگائی۔

"ہاں" لمبی سے ہاں ناجی کے ہونٹوں سے نکلی۔

"آؤ بھئی اب" پھر ان لڑکیوں نے کہا۔

"آؤں کیسے — ساری گاگر تو خالی ہو گئی۔ تم ٹھہرو میں بھر لاؤں۔" طاہر پر غصہ سے تلخ سی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ چنچل ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی نیچے اتر گئی قاہر اس کے لال ڈوپٹے کے لہراتے آنچل اس وقت تک دیکھتے رہے جس وقت تک وہ نظر آتے رہے

وہ جا چکی تھی، طاہر نے مڑ کر اپنا کیمرہ اٹھایا اسکے بٹنوں پر "ناجی" لکھا

حسن کی پُرطراز یاں جوانی کے جنون کو ہوا دیتی ہی آئی ہیں طاہر بھی حسن کی نوجوان ناجی کے الہڑ پن سے بے پروا اور اتنول حسن سے صرف متاثر ہی نہ ہوئے

بلکہ پہلی ہی نظر میں دل کو گھائل کر لیا، حسن جہاں سوز کے کرشمے بار بار دیکھتے تھے بے تکلفی سے کبھی اور چھپ چھپ کر کبھی، یورپ کے تفریحی درے میں حسن کی نمائش دیکھی تھی، گھریلو ماحول میں حسن کی آنکھ مچولی سے کبھی لطف اندوز ہوئے تھے لیکن جس سکون بخش ٹھنڈک کا احساس انھیں ناجی کو دیکھ کر ہوا پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

تصنع و بناوٹ سے بے نیاز۔ تکلفات سے عاری۔ قدرت کا عکس ناجی میں اصلی روپ میں جلوہ گر نظر آیا۔ رات بھر وہ رنگین رنگین خواب دیکھتے رہے، حسن شوخی، ہستی اور دادا میں قوس قزح کے رنگوں کی طرح سپنوں میں بکھر بکھر جاتے تھے۔

صبح وہ اٹھے تو حواس پر کسی تند و تیز شراب کا سا نشہ تھا، دل ایک انوکھے انداز سے دھڑک رہا تھا، اور روح انھیں ٹیڑھے ٹیڑھے پہاڑی راستوں پر گھر سے نکلنے کے لیے ہمک رہی تھی، جہاں کل انھیں دست قدرت کا شاہکار نظر آیا تھا۔ اور سورج ابھی پوری طرح طلوع بھی نہ ہوا تھا تو بھی اور لالی لالی روپہلی کرنیں فضا میں جال سا بن رہی تھیں، طاہر کسی مقناطیسی کشش سے انہی پگڈنڈی راستوں پر کھنچے چلے جا رہے تھے۔

موسم بلا کا حسین اور رومان پرور تھا۔ رات ہلکی سی بارش ہو جانے سے اک خوشگوار صبح طلوع ہوئی تھی، ٹھنڈی سہانی سہانی اور رومانی سی صبح۔

طاہر دل میں اک جہاں آرزو لئے جھرنے کی طرف جا رہے تھے انکا قیافہ تھا کہ دیہی لڑکیاں صبح ہی صبح جھرنے پر پانی لینے آتی ہوں گی۔

چند لڑکیاں جھرنے کے قریب اپنی پیتل کانسی اور مٹی کی گاگریں لئے کھڑی تھیں۔ طاہر نے گھنے درختوں کی آڑ لیتے ہوئے دیکھا کہ کوئی پہرہ نظر نہ

آیا۔ طاہر نے اک لذت آمیز انجانی سی بے قراری محسوس کی۔
لڑکیاں گھڑے بھر بھر کر جانے لگیں، کچھ ہی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ صرف بھرنے کے پانی کا مترنم شور ہمتا ظلم کر رہا تھا۔
طاہر کا انتظار مایوس نہیں ہوا۔ وہیں ٹہلتے ہوئے وہ کل والی لڑکی کا انتظار کرنے لگا۔ ناجی ضرور آئے۔ ان کا دل کہہ رہا تھا۔
طاہر ٹہلتے رہے، خودرو پودوں کی مہک مستانہ ہوا اور قریب ہی پانی گرنے کی مسلسل نغمگی نے انتظار کی لذت کو بار بننے نہ دیا۔ دل بار بار سرگوشیاں کر رہا تھا، وہ آئے گی ضرور آئے گی۔
دل کی آواز صادق تھی، کچھ ہی دیر بعد کھنکتے قہقہے اور رسیلی ہنسی فضا میں گونج گئی۔ طاہر نے آواز سنی اور ۔۔۔ دل کہہ اٹھا!
"وہ آگئی"
وہ واقعی آگئی تھی، سہیلیوں کے جھرمٹ میں سورج سنوام کی طرح ہر دل کھاتی، لہراتی، اٹھکیلیاں کرتی وہ چلی آرہی تھی، لال گلابی، نیلے پیلے آنچل ہوا سے اڑ رہے تھے، سنہرے میں گھری ہوئی پکڈنڈی پر آگے پیچھے چلتی یہ مدہوش جوانیاں مستی بھری ادائیں بکھیرتی چلی آرہی تھیں۔
طاہر جھاڑیوں کی قدرتی باڑ میں خود کو چھپائے یہ جلوے نگاہوں میں سمیٹ رہے تھے۔ نگاہوں کا مرکز وہی الڑ اکھڑ سی دیہاتی ناجی تھی۔
لڑکیاں اس کے انتہائی قریب سے گزریں، طاہر دبکا کر بیٹھ گئے۔ وہ گذر گئیں۔ ان کی موجودگی سے بے خبر گزر گئیں۔
جھرنے پر پہونچ کر سب نے گاگریں رکھ دیں، اور سب نے پانی میں نرم نرم پیروں کو پتھروں پر بیٹھ کر کپڑے سمیٹ کر ننگی پنڈلیاں پانی میں ڈالی دیں۔

یوں تو سبھی لڑکیاں خوبصورت تھیں، لیکن طاہر کی نگاہِ انتخاب ناجی پر پڑی تھی، یوں بھی جو فسوں ناجی کے حسن میں تھا، جو تپش ناجی کی جوانی میں تھی اور کسی میں نہ تھی۔

لڑکیوں کو شرارت سوجھی۔ پانی کے چھینٹے اڑانے لگیں۔ ناجی نے شادو کو بھگو دیا۔ شادو نے ناجی کو گھسیٹ کر سین جھرنے کے نیچے لا کھڑا کیا۔ سانولی نے لپک کر شادو کی مدد کی اور دونوں نے ناجی کو اس وقت نہ چھوڑا جب تک کہ وہ سرتاپا بھیگ نہ گئی۔ بھیگی ہوئی ناجی کو دیکھ کر طاہر کو جل پریوں کے وجود کا یقین آ گیا۔ کافی دیر تک لڑکیاں پانی میں کھیلتی رہیں۔

سورج کافی اونچا ہو گیا۔ لڑکیوں کو وقت کا احساس ہوا۔ کپڑے کر سب نے بھیگے ڈوپٹے اور کھیر دار قمیضوں کے سائن نچوڑے ڈوپٹے سر پر اوڑھ کر سکھائے پھر باری باری سے اپنی اپنی گاگریں سب نے بھریں اور باری باری گاگریں سر پر اٹھا کر آگے پیچھے پگڈنڈی پر چل دیں۔

چند لمحوں بعد فضا سونی ہو چکی تھی۔ ماحول کا حسن اب ماند پڑ چکا تھا۔ طاہر یوں چونکے جیسے خواب سے بیدار ہوئے ہوں، جل پریوں کا رقص ختم ہو چکا تھا طاہر نے نیچے دیکھا، پہاڑی کے دامن میں چاروں لڑکیوں کے دامن لہرا رہے تھے، جانے کیا سوجھی، اپنی جگہ سے اٹھے اور دوسری ڈھلان پر تیزی سے اترنے لگے۔ دریا نی راستے کو پھلانگتے ہوئے ختم کر کے وہ اسی پہاڑی کے عقب سے اوپر چڑھنے لگے جس پر لڑکیاں نمودار تھیں۔

پتھروں کو پھلانگتے بڑے بڑے قدم اٹھاتے طاہر اپنی کل والی جگہ پر جا پہنچے ــــ لڑکیوں کو ادھر سے ہی گزرنا تھا دل میں ناجی سے باتیں کرنے کی خواہش جو تڑپ رہی تھی۔

اسی پتھر پر بیٹھتے ہوئے طاہر نے گھاس کے کچھ تنکے نوچے اور ان سے اس بے خیالی سے کھیلنے لگے جیسے کہ وہ ان لڑکیوں کی آمد سے قطعاً بے خبر ہو۔ قہقہے قریب آ گئے اپنے آپ کو اور بے تعلق ظاہر کرنے کیلئے طاہر نے چند کنکر اٹھائے اور دوسری جانب کو یونہی پھینکنے لگے۔ آوازیں قریب آ گئیں۔

طاہر بظاہر انجان بنے بار بار دزدیدہ نظروں سے کچے راستے کو دیکھ رہے تھے، جہاں سے لڑکیوں کی آمد متوقع تھی۔ پھر لڑکیاں آ گئیں، آگے پیچھے گاگریں اٹھائے۔

طاہر کو دیکھ کر وہ کچھ سمٹ سی گئیں، گھبرائیں، اور کترا کر نکلنا چاہا۔

"اے لڑکی!" طاہر نے ایک دم اکھڑ کر ناجی کو پکارا۔

لڑکیاں تیز قدم اٹھا کر بڑھنے لگیں، لیکن ناجی رک گئی۔

"تھوڑا سا پانی چاہئے!" ناجی کو رکتے دیکھ کر طاہر کی ہمت بندھی۔ ناجی کے گداز جسم میں ایک تھرتھراہٹ سی آ گئی۔ چہرے پر ناگوار سے تاثرات کی جھلک واضح نظر آئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ طاہر کے بظاہر لاپروا انداز تخاطب کو جان گئی ہو۔

غصیلی نظروں سے طاہر کو گھور کر دیکھا۔

شادو بھی رک گئی تھی، ناجی کے تیور دیکھ کر اسکی کمر میں ٹھوکا دیا۔

"چلو بھی!" لیکن ناجی قہر آلود نگاہوں سے طاہر کو گھورنے لگی۔

"پانی پلا دو!" طاہر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔

"آؤ ناجی۔" شادو شریر مسکراہٹ سے بہت کچھ سمجھ گئی۔

لیکن ناجی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"خواہ مخواہ منہ نہ لگانا آؤ!" شادو نے سرگوشی کر کے اسکا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ٹھہرو تم"۔ ناجی نے غصہ سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
شادو آگے بڑھ گئی، چند ہی قدم پر دوسری لڑکیاں بھی کھڑی تھیں، جو گاگر کے بوجھ سے دبی دبی گردنیں بمشکل موڑ کر طاہر و ناجی کو دیکھ رہی تھیں۔
"کیا کہتے ہو۔؟" ناجی بھنویں بھینچ کر بڑے اکھڑے لہجہ میں بولی۔
"پیاس لگی ہے؟" طاہر شوخ نظروں سے اسے دیکھ کر بولے۔
"پانی پیو گے۔؟"
"ہاں"
"اتنی صبح صبح تمھیں پیاس لگی ہے۔؟"
"ازلی پیاسا ہوں"
"کیسے؟"
"سخت پیاسا ہوں"
"پیو۔!"
ناجی نے گاگر سر سے اتاری۔ طاہر متبسم نظروں سے اسے دیکھتے کل کی طرح پتھر پر بیٹھ گئے۔ ہاتھوں کی اوک بنا کر انھوں نے نظریں صبیح چہرے پر گاڑ دیں۔
بازو کی خفیف سی گردش سے گاگر گھما کر ناجی نے دوسرے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے پانی اوک میں انڈیلا۔
پیاس کسے تھی، یہ تو تقریب بہر ملاقات تھی۔ پانی سارے کا سارا اوک سے گر رہا تھا۔ ہونٹ اوک سے لگے تو ضرور تھے، مگر نگاہیں ناجی کے روشن رخسار حسن کی داد دے رہی تھیں۔
"بس!" ناجی نے گھڑی بھر بعد پوچھا۔
"نہیں" بلا تامل طاہر کہہ اٹھے۔

ناجی نے پھر پانی چھلکایا۔ پانی کی موٹی سی دھار اوک میں پڑی ــــ چھینٹوں سے طاہر کی قمیض اور پتلون کے پائنچے گیلے ہو گئے۔

"لیں؟" ناجی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا، اور اسکی شبنمی آنکھوں میں دلفریب چمک تھی۔

"نہیں!" طاہر اسی انداز میں بولے۔

"اچھا" ناجی نے کہتے ہوئے اک لمحہ ضائع کئے بغیر پوری اوک طاہر کے سر پر انڈیل دی۔

"ارے ــــ ارے ــــ ارے ــــ" طاہر ہڑبڑا کر اٹھے۔

"اب تو پیاس بجھی؟" ناجی ہنستے ہوئے بولی۔ اور طاہر کے ارد گرد مجتمع کرنے سے پیشتر ہی قہقہہ لگا کر اپنی ہمجولیوں کی طرف بھاگی۔ جو طاہر کی گھبراہٹ اور ناجی کی حرکت پر کھلکھلا کر قہقہے لگا رہی تھیں۔

طاہر نے ماتھے سے گیلے بال ہٹائے اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ پونچھا۔ کپڑے جھاڑے جو خفیف سے تر ہو گئے تھے۔ لڑکیوں کے قہقہے فضا میں اضافہ کر رہے تھے، لیکن اسکے باوجود یہ جوان کی چیٹرل کے تاروں پر انوکھے اور رسیلے نغموں کا اضافہ کر گئی تھی۔

لڑکیاں تیزی سے اوپر جا رہی تھیں۔ طاہر انھیں دیکھتے رہے۔ اگلے موڑ پر ناجی نے درخت پر تقریباً جھولتے ہوئے دیکھا اور پھر اسکی دلنشین ہنسی فضا میں گونج گئی۔ طاہر اسے دیکھتے ہی رہ گئے۔

رات تیز بارش ہوئی، فضا دھل کر نکھر گئی، صبح بارش تھم گئی تھی، لیکن مطلع تا ہنوز ابر آلود تھا۔ کوہ پیما پہاڑیوں پر جو بن آگیا تھا، پھول اور سبزے سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں نگاہ کو حلاوت و طراوت بخش رہی تھیں۔

پہاڑی نالے کا سرخ سرخ پانی تیزی سے بہہ رہا تھا، جھاگ اور جھینٹے اڑتا نالہ بستیوں کی طرف جا رہا تھا، شاں شاں کی آوازیں یوں محسوس ہوتی تھیں جیسے خود دار نالہ بلندیوں سے پستیوں کی طرف جانے پر غصے سے چیخ رہا تھا۔

طاہر حسب عادت کیمرہ کندھے پر ڈالے اس گھاٹی میں گھوم رہے تھے۔ جس سے کف بدہن نالہ سر کے بل نیچے گر رہا تھا۔ نالے کے کنارے نوکیلے پتھروں اور خار دار جھاڑیوں میں سے راستہ بناتے طاہر اوپر چڑھ رہے تھے۔ طاہر نالے کے اس حصے تک پہونچنا چاہتے تھے جہاں جھکے درختوں نے ایک محراب سی بنا رکھی تھی، اور پہاڑی نالہ اس تنگ جگہ سے رہائی پانے کے لئے بڑے جوش سے جدوجہد کر رہا تھا۔

دوربین آنکھوں سے لگا کر انھوں نے پھر اس فردوسی محراب کو دیکھا قدرت کاملہ کے خاموش حسن نے ہمت دلائی اور پھر دشوار گزار راستے سے اوپر چڑھنے لگے۔

طاہر اس جگہ اکثر آیا کرتے تھے، لیکن اب تو اک کشش تھی۔ جو کشاں کشاں یہاں کھینچ لاتی۔ گھاٹی میں گھومتے پھرتے کہیں ٹوٹا جی نظر آ ہی جاتی، گو اس دن کے بعد وہ اسکے راستے میں نہ آئے تھے۔ لیکن اسکے ارد گرد منڈلاتے ضرور رہتے تھے دن میں ایک دو بار تو ضرور وہ نظر آجاتی، کبھی جھرنے کے قریب کبھی گھاٹی میں اور

کبھی پہاڑی راستے کے کچے موڑ پر، وہ کہیں دور کبھی، ہوتی تو دوربین ایک مخلص دوست کی طرح اسے ان کی آنکھوں میں لا بٹھاتی تھی۔

اس سے پھر بات کرنے کا موقعہ تو نہ ملا تھا لیکن وہ اکثر انھیں دیکھ کر شوخی سے یوں مسکرا دیتی، جیسے اس دن کی چھیڑ کا کوئی سرا اب تک اسکے ہاتھ میں ہو، طاہر سنبھل سنبھل کر پیر رکھتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔

"رانی ــــ رانی ــــ او ــــ و ــــ رانی ــــ ٹھہر ــــ جا ــــ رانی ــــ"

کوئی دور سے پکارتا چلا آ رہا تھا۔ آواز نسوانی تھی، گھبراہٹ کا عنصر غالب تھا۔ آواز وادی میں گونج رہی تھی۔

طاہر نے اس سمت دیکھا جدھر سے آواز آ رہی تھی:

"رانی ــــ رــــ انی ــــ!"

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی تیزی سے پھیلتے ہوئے چیخ رہا ہو طاہر متعجب تھے۔ چند ہی سکنڈ بعد انھوں نے دیکھا۔

بکری کا خوبصورت سا بچہ پتھروں کو پھلانگتا، اچھلتا، کودتا انہی کی طرف آ رہا تھا: "ر ــــ ا ــــ نی ــــ" چیڑ کے درختوں میں گلابی آنچل لہرائے۔

طاہر نے دیکھا۔ ناجی گھبراہٹ اور سراسیمگی کے عالم میں رانی رانی پکارتی، درختوں کا سہارا لیتی۔ پتھروں سے ٹکراتی، اترنے سے زیادہ لڑھکنے کے انداز میں ادھر کو لپک رہی تھی۔

ناجی نے طاہر کو دیکھا: "بابو ــــ اے بابو!" وہ چیخی۔

"رانی کو پکڑ تا بابو ــــ" نالے میں گر جائے گی ــــ" وہ چیخی!"

"رانی کو پکڑ تا بابو ــــ" نالے میں گر جائے گی۔

طاہر نے ایک نظر ناجی کو دیکھا اور پھر بکری کے بچے کو جو ان سے چند قدم کے فاصلہ پر کسی بے جان پتھر کی طرح لڑھکتا ہوا نالے کی طرف بڑھ رہا تھا

"ر ـــــ ا ـــــ فی ـــــ ہ"

طاہر نے بکری کے بچے کو دیکھا۔ برق کی سی تیزی سے بڑھ کر وہ اسے پکڑ نہ لیتے تو وہ یقیناً تیز رفتار نالے میں گر جاتا۔

بکری کا بچہ اب طاہر کے ہاتھوں میں تھا، ناجی اپنا توازن بمشکل تمام رکھتے ہوئے ایک پتھر سے دوسرے پر چھلانگیں لگاتی نیچے اتر رہی تھی۔

قریب آتے ہی اس نے طاہر سے جھپٹ کر بکری کا بچہ لے لیا۔ "رانی۔ میری رانی۔!" بڑے والہانہ انداز میں وہ اسکے ملائم جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

طاہر ایک ٹک ناجی کو دیکھے جا رہے تھے، ہانپتی ہوئی ناجی کا یہ انداز بالکل نیا تھا، تیز سانس لیتے ہوئے اسکے سینے کا مدوجزر طاہر کے جذبات کی دنیا میں ہلچل مچا رہا تھا، براق سی پیشانی پر پسینے کی کچھ بوندیں چمک رہی تھیں اس پر گھبراہٹ ابتک طاری تھی، رانی کو پیار کرتے ہوئے اسکے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر اس نے طاہر کی طرف دیکھا اسکے بھیگے بھیگے لبوں پر دلنواز تبسم بکھر گیا۔

وہ قریب ہی پتھر پر بیٹھ گئی۔ رانی کے پاؤں دوپٹے کے آنچل سے باندھ کر پاؤں کے قریب رکھتے ہوئے بولی "تو اگر نالے میں گر جاتی تو میں کیا کرتی رانی۔؟"

سر اٹھا کر ناجی نے پھر طاہر کی طرف دیکھا شاید یہ نظر اظہار تشکر کے طور پر تھی۔

طاہر اسے تکے جا رہے تھے، ڈھیلے ڈھالے گلابی کپڑوں میں وہ سبزہ میں

بیٹھی گلاب کا نو شگفتہ پھول لگ رہی تھی۔

"تم بڑے اچھے ہو بابو۔۔۔!" لجا کر ناجی نے کہا۔

"اچھا ہوں۔" طاہر دلچسپی سے اسے دیکھ کر بولے۔

"ہاں بابو۔" تم نے میری رانی کو بچایا ہے۔!

"رانی کو بچایا تو ہے، لیکن اسے پھر اٹھا کر نالے میں پھینکوں گا۔" شوخ نگاہوں سے ناجی کو گھور کر بولے۔

"کیوں؟" ناجی کی آنکھیں پھیل گئیں اور غیر شعوری طور پر اس نے جھک کر بچے کے اوپر ہاتھ رکھ لئے۔

"میں آج اپنا بدلہ لوں گا۔" طاہر نے غصیلی آواز بنا کر اسے گھورا۔

"بدلہ۔۔۔؟" وہ سہم گئی۔

"اس دن مجھے بھگویا کیوں تھا۔"

ناجی سہم کر پلکیں جھپکا جھپکا کر انھیں دیکھنے لگی۔

طاہر جھکے اور بکری کے بچے کو اٹھانا چاہا۔

"اے بابو۔" وہ منت سے بولی۔

"چھوڑ دو اسے!" طاہر غصیلے بنتے ہوئے بولے "میں اسے نالے میں پھینک کر ہی دم لوں گا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں بابو۔۔۔!" ناجی کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

طاہر نے بکری کے بچے کو کھینچا۔

ناجی نے بے اختیار طاہر کی دونوں کلائیاں پکڑ لیں، بھیگی آنکھوں سے انھیں دیکھتے ہوئے بولی "بڑے ظالم ہو بابو۔۔۔ بڑے ظالم ہو۔"

طاہر جیسے بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئے، نرم گداز صندلی ہاتھوں کا

خون رگ رگ میں برقی رو کی طرح دوڑ گیا۔ لیکن یہ احساس کسی کرب کا حامل نہ تھا بلکہ یہ احساس لطف و انبساط کے نقطۂ عروج کو چھو رہا تھا، اور مضبوطی سے انکی کلائیاں پکڑے ناجی انکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر التجا کر رہی تھی۔

طاہر کی نظریں ان نظروں سے ملیں، نہ جانے کونسا خاموش پیغام تھا جو دلوں میں اترا۔ اور روحوں میں جذب ہو گیا۔

ناجی کی پلکیں جھک گئیں۔ سر بھی جھک گیا اور اسکے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ جانے کب اور کیسے ناجی کے ہاتھ طاہر کے مضبوط ہاتھوں میں آ گئے

ساری فضا۔ سارا ماحول اور ساری کائنات ایک طلسماتی سکتے میں آ گئی اس سکتے میں بڑی ہی خاموشی سے روحوں کے ابدی بندھن کا معاہدہ ہو گیا۔

بکری کا بچہ ممیایا۔

سکتہ ٹوٹ گیا۔

ناجی نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑا لئے جھکی جھکی حیا بار نظروں سے اس نے طاہر کی طرف دیکھا اور پھر کچھ بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناجی!" طاہر نے جیسے سرگوشی کی۔

ناجی نے اس کی طرف دیکھا اسکی آنکھوں میں سرخی چھلک آئی تھی۔ اور وہ اس مدہوش شرابی کی طرح بہکی بہکی نظر آ رہی تھی جس نے اپنی شدید پیاس پانی کے بجائے تیز و تند شراب سے بجھانے کی کوشش کی ہو۔

"ابھی نہ جاؤ!" طاہر آہستگی سے بولے۔

"ماں غصہ ہو گی۔" ناجی نے بڑی سادگی سے کہا۔

"پھر آؤ گی؟" التجا جست آمیز التجا تھی۔

ناجی میں نہ اقرار کی ہمت تھی نہ انکار کی۔

"ضرور آتا ناجی۔ میں تمہارا انتظار کروں گا، وہ جذباتی لہجہ میں بولے۔

"ماں آنے نہ دے گی بابو۔!" وہ اکھڑے انداز میں بولی۔

"ناجی!" طاہر پریشان ہو گئے۔

"ماں کہتی ہے غیر مردوں کے پاس نہیں بیٹھا کرتے" اس نے بڑی ہی معصومیت سے کہا۔

طاہر نے اس کی آنکھوں میں اس طرح دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں،

"مجھے اب بھی غیر ہی سمجھتی ہو؟"

ناجی شاید ان نظروں کی پکار سمجھ گئی اس کے ہونٹوں پر اک شرمیلا سا تبسم کھیل گیا۔ اور اک نگاہ جو بظاہر سادہ سی تھی طاہر پر ڈالتے ہوئے پھر سے مسکرا دی۔

"کل آؤ گی نا؟" طاہر نے اسکے قدم اٹھاتے ہی بے صبری سے اس کا آنچل پکڑ لیا۔

"ہاں" وہ آنچل چھڑا کر چل دی۔ اس کی ہاں میں اک اعتماد تھا۔

دوسرے دن ناجی حسب وعدہ آ گئی۔ وہی شوخ و شنگ ناجی۔ الہڑ بے پروا اور اپنے حسن سے غافل ناجی — آج اسکی کل والی کیفیت نہ تھی وہ بات بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی، بے تکلفی سے طاہر سے باتیں کر رہی تھی اور طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے ناجی انھیں اب ہی نہیں ملی بلکہ وہ تو ان کے جنم جنم کی ساتھی ہے۔

دونوں تالے کے کنارے اکی پتھر پر آ بیٹھے۔

"اگر تم پھسل جاتیں تو۔؟" طاہر نے ڈھلانی رستے کو دیکھ کر کہا۔

"کیوں؟"

"جس بے احتیاطی سے اس کمبخت بکری کے بچے کیلئے بھاگی آ رہی تھیں،

گرنا یقینی ہی تو تھا۔

ناجی کھلکھلا کر ہنس دی۔

"ہنستی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بچہ سمجھتے ہو۔"

"کیوں؟"

"جیسے مجھے گھاٹی میں اترنا نہیں آتا۔"

"اترنا اور بات ہے تمہاری طرح بھاگتے آنا اور بات۔ خدا سا باد رہے پھسلا تو بس۔!"

"رانی اگر ڈوب جاتی تو؟"

"رانی کے لئے جان کی بازی لگادی۔"

"رانی تیری کیا ہے؟"

"بڑا پیار ہے اس سے؟"

"ہاں"

"کتنا؟"

"اتنا!" اس نے معصومیت سے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"اور بھی کسی سے اتنا پیار ہے؟" طاہر نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔

"ہاں" وہ آنکھیں گھما کر مسکرائی۔

"کس سے؟" طاہر نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا

"اپنی ماں سے!" وہ سادگی سے بولی۔

"صرف ماں سے باپ سے نہیں"

"باپ تو ہے ہی نہیں؟"

"بھابو"

"ماں کہتی ہے۔ میں اتنی سی تھی۔" اس نے زمین سے فٹ بھر کی اونچائی پر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "جب میرے بابا مر گئے۔"

"بہت چھوٹی سی تھیں تو یاد بھی نہ ہوگا۔"

"بالکل ہی نہیں۔ ماں کہتی ہے بابا مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ شہر سے میرے لئے ڈھیروں چیزیں لاتے تھے۔"

"شہر میں؟"

"ہاں بابا شہر میں کام کرتے تھے نا۔ وہ مر گئے۔ تو ماں اکیلی کیسے رہتی وہاں۔ ماں گاؤں میں آ گئی۔"

بڑی سادی ناجی اچھی خاصی باتونی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے اپنے گھر بار۔ گاؤں اور سہیلیوں کے متعلق طاہر کو بہت کچھ بتا دیا۔

طاہر اس کی دلفریب باتوں میں کھو گئے تھے۔ زندگی کی حقیقت کو اتنے قریب سے دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا، فطرت اپنے اصلی روپ میں جلوہ گر تھی، تصنع اور بناوٹ نے زندگی کو ملوث نہ کیا تھا۔ ظاہر داری نے فطرت کی شکل مسخ نہ کی تھی۔

گھنٹہ بھر کی معصوم قربت کے بعد دونوں کل کے وعدہ پر جدا ہو گئے۔

"اے بابو۔" پھر پر بیٹھے ہوئے ناجی نے طاہر کو پکارا۔

"میرا نام بابو نہیں ہے۔" طاہر کیمرہ کھولتے ہوئے بولے

"تو پھر کیا کہوں تمہیں؟"

"طاہر۔"

"طاہر۔" ناجی نے بڑا سا منہ بنایا

"کیوں پسند نہیں آیا میرا نام؟" طاہر مسکرائے۔

"ناجی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ طاہر اس سادگی پر مسکرا دئے۔

"میرے اور بھی نام ہیں۔ طاہر پسند نہیں تو کسی اور نام سے پکار لیا کرو۔"

"اور نام بھی ہیں؟"۔

"ہاں۔"

"کون کون سے۔ بتاؤ نا؟"

"بتاؤں؟"

"سنتی جاؤ۔"

"ناجی ہمہ تن گوش ہو گئی۔"

"طاہر کے علاوہ میرے نام ہیں۔" بجن۔ سجنوا۔ پیا۔ سیاں۔"

"اتنے بہت سے نام ہیں تمہارے۔؟"

"جو پسند ہو۔ اسی سے پکارا کرو۔"

ناجی نے زیر لب سارے نام دہرائے، جیسے ناموں کی نغمگی کا جائزہ لے رہی ہو۔ پھر خوشی سے بھرپور آواز میں بولی۔

"سیاں۔"

"میں تمہیں سیاں کہوں گی۔ کتنا اچھا نام ہے تمہارا۔"

"مجھے پکارو۔" طاہر جوش مسرت سے بولے۔

"سیاں۔" فضا میں ترنم بکھر گیا۔ آواز میں موسیقی کا رس تھا۔ طاہر مسرت سے جھوم جھوم گئے۔

ملاقاتیں بڑھیں۔ رازو نیاز ہوئے اور دونوں ایک دوسرے میں کھو کر رہ گئے۔

اس دن موسم سہانا تھا۔ ظاہر کافی دیر سے ناجی کے حسن کو سلولائیڈ پر منتقل کر رہے تھے۔ وہ ان سے کتنی باتیں پوچھ رہی تھی۔ کیمرہ اسکے لئے عجیب سی شے تھی، حیرانگی سے وہ اسکے متعلق سوال پہ سوال کئے جا رہی تھی، ظاہر اس کے معصوم سوالوں کے بڑے دل نشین انداز میں جواب دے رہے تھے

"تمہارے پاس کتنی عجیب عجیب چیزیں ہیں یہاں" ناجی نے کیمرہ ظاہر کو دیکر دوربین اٹھالی۔

"بہت"

"اور بھی ہیں؟"

"ہاں"

"کہاں ہیں؟"

"گھر پر"

"تمہارا گھر کہاں ہے یہاں؟"

"میرا گھر"

"ہاں"

"شہر میں"

"کیسا ہے؟"

"بڑا خوبصورت ہے"

ناجی چپ ہو گئی

"دیکھو گی؟"

"ماں شہر کہاں جانے دے گی۔!"

"یہاں سے بھی نظر آتا ہے"

جھوٹے۔"

آؤ دکھاؤں تمھیں۔"

طاہر اٹھے۔ ناجی کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا۔

کہاں جاؤ گے؟"

"ذرا پیچھے۔ وہاں سے میرا گھر صاف نظر آتا ہے۔"

"اچھا؟"

"میں نے جھوٹ کبھی بولا ہے۔"

دونوں نشیب کی طرف اترنے لگے۔ نالے کے پہلے گھاؤ پر طاہر رک گئے۔

"اس پتھر پر کھڑی ہو جاؤ۔"

ناجی اوپچے سے پتھر پر چڑھ گئی، پھر طاہر بھی اسکے برابر کھڑے ہو گئے۔

"ادھر دیکھو۔" طاہر نے نیچے شہر کی طرف اشارہ کیا۔

شہر کی آبادی کے غیر واضح سے نشان یہاں سے نظر آ رہے تھے لیکن اتنی دور سے طاہر کا گھر کیسے نظر آتا۔ ناجی آبادی کی بجائے عدم اعتمادی سے طاہر کی طرف دیکھنے لگی۔

"وہ دیکھو!" طاہر نے روشنی میں نشیبی علاقہ کی طرف اشارہ کیا۔

ناجی یونہی دیکھنے لگی۔

"اس طرف نہیں — ادھر —" طاہر نے پھر اشارہ کیا سرخ سرخ نظر آ رہے ہیں؟"

"ہوں۔"

گول گنبد؟ — سرخ سرخ — چمک رہے ہیں نا؟"

"ہاں، ہاں۔"

"وہی میرا گھر ہے۔"

ناجی نے پلٹ کر طاہر کی طرف دیکھا، اور پھر جیسے اسے طاہر کی بے تکی بات کا پتہ چل گیا ہو۔ مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں آنکھوں کی شوخ چمک اور دلآویز ہو گئی۔ تیکھی نظروں سے اٹکا مذاق اڑاتے ہوئے بولی "وہ تمہارا گھر ہے؟"

"ہاں" طاہر متعجب اسے دیکھنے لگے۔

"لال لال گنبدوں والا" وہ جیسے ہنسی روک رہی تھی۔

"ہاں۔ ہاں" وہی! طاہر حیران ہو کر اسے دیکھ رہے تھے، "تم بھی تو دیکھو نظر آ رہے ہیں!"

"وہ تمہارا گھر ہے ....؟" ناجی بے قابو ہنسی کو روک رہی تھی۔

"ہاں"

اور

ناجی۔

کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں میں ہنسنے سے نمی آ گئی تھی۔

"جھوٹے"

"کیوں"

"سب جیسے میں جانتی نہیں۔!" اس نے آنکھیں مٹکا کر گردن ہلائی۔

"ناجی" طاہر اس کی ہنسی کا مطلب نہ سمجھ سکے!

"وہ تو محل ہے محل" ناجی نے شوخی سے انکی ٹھوڑی کو چھو کر اس طرح کہا جیسے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا ہو۔ "نواب صاحب کا محل ہے، نواب صاحب کا۔

اور طاہر کے لب متبسم ہو گئے، چھلانگ لگا کر وہ پتھر سے کود پڑے اور پھر

ہاتھ کا سہارا دیکر ناجی کو اتارا۔

ناجی اپنی فتح پر نازاں تھی۔ اٹھلاتی ہوئی بولی "میں نے نواب صاحب کو دیکھا بھی ہے۔"

"کہاں۔؟" شوق سے طاہر بولے۔

"شہر گئی تھی ایک دفعہ ماں کے ساتھ۔ محل بھی دیکھا تھا۔ نواب صاحب کو بھی۔ مجھے تو بڑا ڈر لگا ان سے۔"

"کیوں۔؟"

"بس ان کی شکل دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ ناجی یوں کہہ رہی تھی جیسے اس ڈر کا احساس اسے اب بھی ہو رہا ہے۔

"ڈرنے کی کیا بات تھی، طاہر تجسس سے کرید کر رہے تھے۔

"ان کی شکل ہی ایسی تھی، میں تو ڈر کر ماں کے پیچھے چھپ گئی۔ موٹی موٹی لال لال آنکھیں، اتنی بڑی بڑی مونچھیں، اور اتنے موٹے۔ توبہ۔ توبہ۔"

ناجی باتوں کے ساتھ آنکھیں پھیلائے ہاتھوں سے اشارہ بھی کر رہی تھی۔

طاہر ہنسی روکے سن رہے تھے، جب اس نے ہاتھ پھیلا کر نواب صاحب کی موٹائی کا اندازہ بتایا تھا۔ تو طاہر کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

"وہ میرے ابا ہیں ناجی۔"

اور ناجی نے چونک کر ایک دم طاہر کی طرف دیکھا۔

طاہر مسکرائے۔

ناجی ششدر رہ گئی۔ تذبذب کے عالم میں اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر طاہر کو دیکھا۔ ناجی کی آنکھوں میں اب کچھ عدم اعتمادی کی جھلک تھی۔

طاہر نے اس کی ذہنی و قلبی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ وہ

اپنے متعلق اسے سب کچھ بتا دیتے۔ طاہر نے پیچیدگی سے مختصر الفاظ میں اپنے متعلق سب کچھ بتایا۔ لیکن۔ ناجی خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گئی۔ گرے پتلون اور سلک کی قمیض میں ملبوس طاہر اسے پہلی بار نواب زادے کی شکل میں دکھائی دیئے شاید لاشعوری طور پر اسے اپنے اور ان کے درمیانی خلاء کا احساس ہو گیا تھا۔

"ناجی!" وہ بیتاب ہو کر بولے۔

"ہوں" ناجی سر جھکائے چپ چاپ کھڑی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئی ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ بھی۔"

"سوچ رہی ہوں۔"

"کیا۔ ناجی۔ کیا سوچ رہی ہو۔؟"

"تم بہت۔ بڑے آدمی ہو۔ ہاں۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے طاہر کو دیکھنے لگی "نواب ہو نا۔" محل میں رہتے ہو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ناجی۔" طاہر نے بے قرار ہو کر کہا۔

"مجھے چھوڑ تو نہ دو گے یاں۔" اچانک ناجی نے طاہر کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر روہانسی آواز میں کہا۔

"ناجی۔" طاہر کی تڑپ دید کے قابل تھی۔ ناجی کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ جو اس کے قلبی ہیجان کا غماز تھا۔

"تم نے ایسی بات کیوں کر سوچی ناجی۔" طاہر کی ادا فرط جذبات سے مغلوب تھی۔ "ماں کہتی ہے، امیر غریب کا کوئی جوڑ۔ نہیں یاں۔" ناجی ایک دم سسکنے لگی

"ناجی!" طاہر نے جوش جذبات سے کانپتی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے۔ ناجی کے

دونوں ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑ لئے جیسے اس طرح اس اٹوٹ بندھن کا احساس دلانا چاہتے ہوں، جو دنیا کی دسترس سے دور دلوں کو جکڑے ہوئے تھا۔

"تم میری ہو ناجی۔ ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ تمہارے بغیر تو میں زندہ رہنے کا خیال بھی نہیں کر سکتا ناجی۔ تم نے کیا بات کہدی؟"

اور بڑی ہی عقیدت سے طاہر نے اپنی آنکھیں ناجی کے ہاتھوں سے لگا دیں۔ ناجی بڑی متاثر ہوئی۔ اک انجانے سکون کا احساس اسکے حواس پر چھا گیا۔

"ناجی" طاہر نے سر اٹھا کر اسکی آنکھوں میں جھانکا "میں تمہارا ہوں۔ تم میری ہو۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ تم میری رانی بنو گی میں اپنی خاندانی اور روائتی شان و شوکت کے ساتھ تمہیں اپنے محل میں لے جاؤنگا۔"

ناجی کی آنکھیں اس اقرار پر یوں چمکنے لگیں، جیسے چودھویں کے پورے چاند کی چاندنی گھل گھل کر ان کی آنکھوں میں سما رہی ہو۔

دن گزر رہے تھے۔

طاہر و ناجی دنیا و مافیہا سے بے خبر راہ عشق پر رواں دواں تھے، اس راہ پر نہ تو انھیں کانٹے نظر آئے نہ پتھریلی رکاوٹیں۔ انھیں تو چاروں طرف بہاروں کا حسن ہی دکھائی دیتا تھا۔

لیکن۔

ماں کی جہاندیدہ نگاہیں ناجی کی بہکی بہکی حرکات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ ناجی کی ماں تھی، ناجی کو اس نے جنم دیا تھا، پالا پوسا۔ پروان چڑھایا تھا، وہ اس

کی ایک ایک عادت سے واقف تھی۔ اسکے ذہن کی رجحانات سے آگاہ تھی۔ ناجی اس سبک رفتار ندی کی طرح تھی، جو ایک متعینہ رفتار سے متعینہ راستے پر بہا چلی جاتی ہے۔ لیکن اب ماں کو محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ندی کا پانی چڑھ رہا ہو، سبک رفتار ندی سیلاب زدہ ہوتی جا رہی ہو۔

ماں سخت متفکر تھی۔ زندگی نے تلخیوں سے دوچار کر رکھا تھا تجربے کا ایک وسیع اثاثہ انہی تلخیوں نے تو اسے بخشا تھا۔ ناجی کی ناسمجھی اور معصومیت کا تو اسے ڈر ہو سکتی تھی۔ وہ اشارتاً، کنایتہً اسے سمجھانے لگی، زیادہ سے زیادہ دیر گھر کے کاموں میں مشغول رکھنے لگی، گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا لیکن ناجی پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ دھوپ کے انداز سے اپنے باہر جانے کے اوقات میں تبدیلی نہ کر سکی۔ کبھی روٹھ کر کبھی لڑ کر کبھی سانولی کے گھر اور کبھی شادو کے بہانے گھر سے نکل جاتی۔

ماں اسکی دبی گھبراہٹ اور کھوئے کھوئے انداز سے سوچ میں ڈوب جاتی، وہ شک لے یہ تو نہ جانتی تھی کہ ناجی نے اپنی زندگی کی بازی کسی اجنبی کے قدموں میں ہار دی ہے، لیکن اسکو بارہا ایسا شک گزرا۔ مگر اس نے اپنے رویہ میں غیر معمولی سختی برتی، گھر سے ناجی کا نکلنا بند کر دیا۔

اپنی دانست میں اس نے ناجی کو بھٹکنے سے بچانے کا موثر قدم اٹھایا لیکن ناجی محبت کی سحر آفرینیوں کے سامنے بے بس ہو چکی تھی، سیلاب طوفان اختیار کر جائے تو کوئی بند اسکے بہاؤ کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا شوریدہ سر موجیں کنارے توڑ کر اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔ ناجی کو دن میں نکلنے سے روکا گیا۔ تو وہ اپنی منزل کی طرف رات کو کھینچنے لگی۔

ناجی کی سہیلیاں اسکی کھیل میں عدم دلچسپی اور بے توجہی سے نالاں تھیں۔

سارا مزہ تو اسکی چنچل چھیڑ چھاڑ اور مستی میں تھا، وہ اس مسئلے کو سلجھانے کے متعلق سوچ رہی تھیں، لیکن اب تاجی نے رات کو آنا بھی چھوڑ دیا تھا، گھڑی بھر کو دکھائی دیتی پھر غائب۔ اور اب تو متواتر تین راتوں سے وہ کسی کو نظر نہ آتی تھی، لڑکیاں ماں کی پابندی پر تبصرہ و تنقید کرتی ہوئی اسکے گھر چل دیں۔ آج وہ ماں کو منا کر تاجی کو اپنے ساتھ لانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

ماں ابھی ابھی بستر میں لیٹی تھی، تاجی کھیل کھیلنے کو جا چکی تھی۔

"ماں جی" چھوٹا سا دروازہ کھولتے ہوئے شادو نے اندر جھانکنا چاہا۔

"آؤ شادو ماں بیٹی" ماں نے سر ابھار کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر لڑکیوں کو اندر آتے دیکھ کر بستر میں سے اُٹھ بیٹھی۔

لڑکیوں نے کمرہ میں ادھر اُدھر دیکھا۔ دوسرا بستر خالی تھا، سرسوں کے تیل کا چھوٹا سا دیا ٹمٹما رہا تھا، ہلکی ہلکی روشنی کمرے کی تاریکی سے الجھ رہی تھی۔

"تاجی کہاں ہے ماں جی؟" شادو نے پوچھا، ماں کے جواب دینے سے پہلے سانولی نے شکوہ کیا۔ "آپ اسے کھیلنے کیوں نہیں دیتیں ماں جی؟"

"پہلے تو دن کو نہیں نکلنے دیتی تھیں، اب رات کو بھی بند کر دیا۔" رخشی کا انداز شکوے کا تھا۔

"سارا لطف تو اکا کے دم سے تھا۔ آج پندرہ راتیں ہو گئیں، اللہ قسم جو اس کے بغیر کھیل کا لطف آیا ہو۔"

لڑکیاں بغیر ماں کا جواب سنے شکوہ کئے جا رہی تھیں۔

اور

ماں

ماں کا جیسے کسی نے گلا دبا دیا۔ حیرت زدہ سی وہ سب کا منہ دیکھ رہی تھی پھر

کی کپکپی سی اس کے وجود پر طاری ہو گئی۔ اس کا دماغ سن سا ہو گیا تھا۔

"وہ کوئی اکیلی تو نہیں ماں جی، ہم بھی ہوتے ہیں نا۔ تم خواہ مخواہ اسے روک لیتی ہو۔ اپنا ہی تو گاؤں ہے، سب ہی لڑکیاں تو کھیلنے آتی ہیں، دن کو نہ سہی، رات کو تو کھیلنے دیا کرو!"

"زیادہ دیر نہیں تو تھوڑی ہی دیر کے لئے ماں جی!" آخر بالکل تو آنا بند نہ کرو۔ ہماری سکھی ہے، ہمیں اس کے بغیر کیسے مزہ آسکتا ہے۔"

چاروں لڑکیاں گلہ کئے جا رہی تھیں۔ ماں کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، دیئے کی ناکافی روشنی اس کے چہرے کے تاثرات چھپانے میں مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ چہرہ جو وسوسوں۔ اندیشوں اور خدشوں کے گمبھیر سایوں سے بھیانک نظر آرہا تھا۔ ناجی لڑکیوں کے کھیل میں شریک نہ ہوتی تھی، وہ کونرا کھیل کھیل رہی تھی۔ ماں کی تجربہ کار نظریں بہت کچھ سمجھ گئی تھیں۔ اسکے ان شبہات کو تقویت مل گئی تھی جو ناجی کے بدلے تیوروں کو دیکھ کر ایک عرصہ سے اسکے ذہن میں رینگ رہے تھے۔

لڑکیاں باتیں کر رہی تھیں، اور ماں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گدلے پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کر اس کی بیوگی کی چادر کو داغدار بنا رہی ہیں۔

گھبرا کر اس نے سب کے چہروں کو گھورا۔

"ناجی کہاں ہے ماں جی؟؟"

"وہ۔۔۔۔" ماں کا دماغ چکرا گیا۔

"کمرے میں تو نہیں، کہیں باہر گئی ہے؟"

"ہاں، جلدی سے ماں نے کہہ دیا۔

"کہاں۔؟"

"ریشماں کے گھر۔ اتنی دور۔؟"

"ہاں۔"

"کوئی کام تھا ماں جی۔؟"

"ہاں۔"

"اکیلی گئی ہے۔؟"

"آں۔ نہیں۔ نہیں تو۔ ریشمان کی ماں آئی تھی۔"

"رات کو آجائے گی۔؟"

"شاید۔"

شاید رات وہیں رہ جائے۔ ماں ہنکلاتی رہی۔

"کل آنے دو گی نا ماں جی۔؟"

لڑکیوں کا لہجہ التجا آمیز تھا۔

"دیکھوں گی۔"

"ضرور بھیجنا ماں جی۔ تھوڑی دیر کے لئے سہی۔"

"اچھا"

لڑکیاں وعدہ لے کر ماں جی کو سلام کر کے رخصت ہو گئیں، انکے جانے کے بعد ماں اس عمارت کی طرح دھڑام سے گر گئی جس کی بنیادیں کسی نے کھوکھلی کر دی ہوں۔

ماں جی گلاب کا مہکتا ہوا پھول تھی، اس کی شادابی و رعنائی ماں کی نظروں سے مستور نہ تھی، لیکن ماں اتنا بھی جانتی تھی کہ باد سموم کا ایک ہی جھونکا یہ شادابی و رعنائی ختم کر دے گا، ماں پر کسی وحشت ناک خیال سے رزہ طاری تھا۔ اضطراب بڑھتا گیا۔

بیقراری سے وہ بستر میں سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے خون میں تیزی آ رہی تھی غم و غصہ کی لہریں اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں۔

"ناجی ۔ ناجی۔ اس کی زندگی کا روشن چراغ تھی۔

لیکن

یہی چراغ اگر اس کی عزت کا دامن جلانے کو لپکے تو وہ اپنے ہاتھوں اس چراغ کو گل کر دے گی۔

ابال اٹھتا رہا۔ ہونٹ کاٹتے، دانت پیستے خشمگیں نگاہوں سے دروازے کو گھورتے ہوئے ناجی کا انتظار کر رہی تھی۔

اک اک لمحہ اس کے دل و دماغ پر سنگ گراں کی طرح پڑ رہا تھا اسکا جگر چھلنی ہو رہا تھا۔ اسکی بندشوں اور پابندیوں کے باوجود ناجی بہک گئی تھی۔ ناجی۔ جو اسکی سولہ سالہ بیوگی کی پارسائی اور ریاضت کا ثمر تھی۔

ماں کی بیقراری بڑھتی گئی، ناجی ابھی تک نہ آئی تھی، وہ بستر سے نکلی اپنی موٹی سی چادر اوڑھی اور گھر سے باہر نکل گئی۔

کھیل کا میدان کسی ویرانے کی طرح سنسان تھا۔ رات کی سیاہی گھل رہی تھی، بوڑھے درخت سوگوار سے کھڑے نظر آ رہے تھے، ماں کتنی ہی دیر عالم اضطراب میں وہاں پھرتی رہی۔ آج اس کے اعتماد نے کسی بری طرح شکست کھائی تھی۔

"ناجی۔ کاش ناجی تو پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی" پتھر پر بیٹھی ماں سسک سسک کر رو رہی تھی، اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اور اسکی بے قابو سسکیوں سے ویرانے کا سکوت ٹوٹ رہا تھا۔

رو لینے سے دل کو کچھ ڈھارس بندھی، اب وہ ہیجانی جذبات سے دوچار

نہ تھی، وہ اطمینان سے سوچ رہی تھی، کہ ناجی معصوم تھی، اسے سمجھا بجھا کر سیدھے راستے پر لے آنا اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ اپنی بچی کو سمجھائے گی اپنے تجربے کی روشنی میں زندگی کے اتار چڑھاؤ کی جھلک دکھائے گی، ناجی راہ راست پر آجائے گی، ضرور آجائے گی۔

وہ چپکے سے اٹھی، موٹی چادر کے کھردرے کونے سے بھیگی آنکھوں کو پونچھا اور کچھ سوچتے ہوئے گھر کی طرف چل دی۔

گھر سے کچھ ہی فاصلے پر اسے دو سائے سے درختوں کے جھنڈ میں نظر آئے، اس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ درختوں کی آڑ میں ہوتے ہوئے وہ دو بے ڈھنگے انکے قریب پہونچ گئی، گھپ سیاہی میں شناخت مشکل تر تھی لیکن پہلی نظر میں وہ پہچان گئی کہ دو سایوں میں ایک سایہ ناجی کا ہے۔

وہ جرأت کر کے کچھ اور آگے بڑھی۔ صرف ایک فٹ کے فاصلے پر درخت کے پیچھے خود کو چھپائے دونوں سایوں کو بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ ایک واقعی ناجی تھی اور دوسرا۔ دوسرا کوئی اجنبی اسکے لباس سے ماں نے جانچ لیا کہ وہ کوئی شہری ہے۔ ماں کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہیں دونوں ہاتھوں سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئی۔

"کل بھی آؤ گی نا؟" اک سرگوشی ابھری۔

"تم روز ہی کیوں پوچھتے ہو سیاں؟"

"یاد دلاتا ہوں۔"

"میں کبھی بھول سکتی ہوں۔"

"تم کتنی اچھی ہو ناجی۔"

اور پھر اجنبی نے ناجی کو خدا حافظ کہا۔

ناجی چلی گئی، وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ نظروں سے اوجھل ہو جانے پر وہ مڑا۔ اور کچے راستے پر چل دیا۔

ماں اٹھی، آندھی کی طرح اٹھی۔ میدان پار کر کے اس نے درمیانی فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا، ناجی اوپر سے ہو کر گھر جا رہی تھی، ماں، راستہ قطع کر کے اس سے پہلے گھر جا پہونچی۔

معمول کے مطابق وہ بستر میں لیٹ گئی۔ اپنے سارے ہنگامی جذبات کو سینے میں چھپائے یوں لیٹی جیسے کوئی خاص بات وقوع پذیر نہ ہوئی ہو۔

ناجی بڑے محتاط قدم رکھتی گھر میں داخل ہوئی، آہستگی سے کواڑ کھول کر اپنے کمرے میں جھانکا۔ ماں بستر میں پڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

ناجی اطمینان سے اندر داخل ہوئی۔ دروازے کی کنڈی چڑھائی اور اپنے بستر کی طرف بڑھی۔

کھدر کی موٹی چادر بستر پر پڑی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے چادر کھول کر اپنے اوپر ڈالی۔

"ناجی" ماں نے اچانک پلٹ کر اسے پکارا۔

"کیا ہے ماں؟" ناجی نے لیٹتے لیٹتے جواب دیا۔

"آگئی ہو۔؟" ماں نے سر تھوڑے اونچا کر کے اسے دیکھا۔

ماں ماں" وہ اٹھ کر ماں کے پاس آئی، اسکی چارپائی پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"میں آگئی ہوں ماں" کیا بات ہے۔

"کب آئیں؟"

"ابھی ابھی" کچھ ہی دیر ہوئی۔

"اتنی دیر سے کہاں تھی" ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پٹی پر بٹھالیا ناجی کا دل بری طرح کانپ گیا۔

"کھیل رہی تھی ماں" وہ تھوک نگل کر اپنے خشک حلق کو تر کرتے ہوئے بولی

"اندھیرے میں کونسا کھیل، کھیل رہی تھی؟"

"آنکھ مچولی"

"آنکھ مچولی"

"ہاں ہاں"

"اندھیرے میں تو یوں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا، اس پر آنکھوں پر پٹی بھی باندھ لی جائے تو" ماں چپ ہو گئی۔

ناجی ماں کے وقار، دبدبے اور انداز سے سہم گئی۔ اسکا دل بری طرح دھڑک رہا تھا، ہاتھ پاؤں میں سنسناہٹ ہونے لگی تھی، دیئے کی ٹمٹماتی لو میں اس نے پل بھر کو ماں کی طرف دیکھا، لیکن پھر نگاہیں اٹھانے کی ہمت نہ کر سکی۔

"بھائی میں ایسے کھیل من کو بھاتے ضرور ہیں، لیکن انکا انجام خطرناک ہوتا ہے" ماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ناجی گھبرا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

"سو جاؤ ماں!" ناجی نے گھبراہٹ چھپاتے ہوئے جلدی سے ماں کی چادر درست کی۔

"اب تک سو ہی رہی ہوں" ماں نے ناجی کے ہاتھ پکڑ لئے "اب جاگنے کی ضرورت ہے"

"ماں" ناجی کی حسین شبنمی آنکھوں میں خوف، معصومیت، حیرت اور پریشانی تھی

"تم نے آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔ تمہیں راستہ دکھانے کیلئے مجھے جاگنا ہی پڑے گا۔"

"ماں" ناجی رو ہانسی ہو گئی۔ ماں کی عجیب عجیب باتوں سے وہ کتنی پریشان ہو گئی تھی۔

ماں نے گہری نظروں سے ناجی کو دیکھا، یہ نظریں ناجی کے دل کا ہر راز پا لینے کی طاقت رکھتی تھیں۔

ناجی بری طرح گھبرا رہی تھی، من میں چور تھا، اس کا دم الجھنے لگا رنگ فق تھا اور ٹھنڈی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے تھے۔

"جوانی دیوانی ہوتی ہے" ماں بستر میں بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اس عمر میں کانٹے بھی پھول نظر آتے ہیں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے ماں" کیسی باتیں کر رہی ہو۔؟" ناجی رو دینے کو تھی۔

"ناجی۔ آج تیری عزت کا دامن شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا ہے؟"

"ہاں"

"ناجی — سچ سچ بتا دے تو اس وقت کہاں سے آتی ہے"

اس نے چاہا۔ کہدے کہ کھیل کے میدان سے لیکن جانے کیوں وہ جھوٹ نہ بول سکی۔ اسکا سر جھک گیا۔ ڈر اور خوف کی سرد سی لہر اسکے وجود میں سنسناہٹ پیدا کر گئی، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے بیہوش ہو کر گر جانا چاہتی ہو۔

"کہاں تھی، تو اس وقت؟" ماں کے لہجہ میں گرج تھی۔

ناجی کانپ گئی۔

"بتا دے، ورنہ جان لے کہ تیری ماں کے ہاتھوں میں ابھی اتنی طاقت ہے کہ اپنی عزت کے دامن کو داغ سے بچانے کے لئے تیرا گلا گھونٹ دے۔

"ماں" یہ ناجی اس کی گود میں منہ چھپا کر بے اختیار رو دی۔ یہ اسکے جرم کا کھلا اعتراف تھا۔

ماں چند لمحوں کے لئے سکتے میں آ گئی، ناجی سسک سسک کر رو رہی تھی۔

"تو نے آخر وہی کیا جس سے خبردار میں تجھے بچپن سے کرتی آ رہی تھی۔"

ماں صرف اسی قدر کہہ سکی، اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

"ماں" بے بس ناجی ہچکیاں بھر بھر رو رہی تھی۔

"کون ہے وہ ذلیل۔ جو رات کے اندھیرے میں تجھے ورغلانے کو آتا ہے؟"

"اسے۔ اسے کچھ نہ کہو ماں"

"ناجی۔!"

"وہ بہت اچھا ہے ماں ــــ بہت اچھا ہے" ہچکیاں بھرتے ہوئے ناجی کہہ رہی تھی۔

"تیری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے، اچھے برے کی تمیز ہی کہاں ہو گی تجھے، ــــ اس بات کا احساس تجھے اس وقت ہو گا جس وقت بھوکا پھوں کار سا جوس کر اڑ جائے گا، کلی کو روند کر ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لے گا۔

"نہیں ماں" ناجی سسکیاں بھرتے ہوئے بولی "وہ ایسا نہیں ہے، وہ ــــ وہ مجھ سے ــــ سچا پیار ــــ کرتا ہے ماں"

"اسی کی آڑ میں تو مرد تم جیسی نادان لڑکیوں کو لوٹا کرتے ہیں بدبخت"

ناجی ماں کی گود میں منہ چھپائے روتی رہی۔

"تو اس کے جھانسے میں کیسے پھنس گئی ناجی؟ وہ کہاں سے آ گیا؟"

ماں کے بار بار استفسار پر ناجی نے روتے دھوتے بلا کم و کاست اپنی معصوم محبت کا فسانہ ماں کے سامنے دہرایا۔

ماں تیز نظروں سے ناجی کو دیکھتے ہوئے سن رہی تھی، ناجی کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر تقدس کا نور تھا۔ روتی ہوئی آنکھیں محبت کی جوت سے چمک رہی تھیں، صداقت اور معصومیت کے امتزاج نے اسکے چہرے کو اس حد تک پر نور بنا دیا تھا کہ ماں کا ضمیر اسکی پاکیزگی کے اعتراف میں چیخ اٹھا۔

پھر بھی تسکین کیلئے ماں نے ہر ہر طریق سے اسے کریدا۔ ناجی کی صاف گوئی اور ماں کی ہر بات کے بیدھڑک جواب نے اسکے شکوک و شبہ کے بادل دھو دیئے، وہ معصوم تھی، اسکی محبت پاک تھی، ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا، مگر اس آتشی دوراہے پر ناجی کو اب چھوڑنا بھی عقلمندی نہ تھی، اسے تھام کر راستہ بدل دینے کے لئے ماں کو بھی عقلمندی سے کام لینا تھا۔

"یہ بہت برا ہوا بیٹی" ماں کے رویہ میں نرمی آ گئی۔

"کیوں ماں" ناجی نے معصومیت سے کہا وہ اب تک سسکیاں بھر رہی تھی۔

"پیار کا سوانگ بھر کر یہ مرد نا سمجھ لڑکیوں کو برباد کر دیتے ہیں بیٹی!"

"نہیں ماں! وہ میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑے گا ــ وہ ــ وہ مجھے اپنی رانی بنا کر محل میں لے جائے گا۔ ناجی نادم سی ہو کر پھر ماں کی گود میں جھک گئی

"محل میں؟"

"ہاں ماں"

"ہونہہ ــ محلوں کے خواب دکھا کر وہ تجھے جھونپڑیوں کے قابل بھی نہیں رہنے دے گا، وہ تو ــ"

"ایسا نہ کہو ماں" ناجی نے گھبرا کر ماں کی بات کاٹ دی۔

"اس کا قریب بڑا رنگین ہے ناجی، تیرا من بہلانے کو اس نے محلوں کے سپنے دکھائے ہیں"

"نہیں ماں! وہ جھوٹ نہیں کہتا۔ ناجی نے عزم سے چمکتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ اور پھر سر جھکا کر بولی۔" وہ ــــ وہ لال محل میں رہتا ہے ماں وہ موٹے سے نواب صاحب تم نے ایک دفعہ مجھے دکھائے تھے نا۔"

"ہاں۔"

"وہ ان کا بیٹا ہے ماں۔" ناجی نے بھیگی آنکھوں سے پھر ماں کو دیکھا

"ناجی!" ماں حیرت و استعجاب سے چیخ اٹھی۔

"ناجی حیران ہو کر ماں کو دیکھنے لگی۔

"وہ نواب کا بیٹا ہے!" وہ ناجی کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"ہاں ماں" ناجی مسکرا کر روتے روتے مسکرا دی، بھیگی بھیگی مسکراہٹ جیسی برستی گھٹاؤں کا سینہ چیر کر چمکتی دھوپ نکل آئی ہو۔

ماں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ "تجھے ڈوبنا ہی تھا تو ایسی جگہ ڈوبتی۔ جہاں کچھ نشان تو باقی رہتا۔ سر بھی پھوڑا تو پتھر کی بے دیواروں سے"

"ماں! ناجی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ماں کا کندھا ہلایا۔

"وہ اک نواب زادہ اور تو ایک بے آسرا بیوہ کی لڑکی۔ میں نے جس دن سے ہمیشہ تجھے متنبہ کیا۔ وہی پیش آیا ــــ آہ ــــ ناجی۔!"

ماں سر تھامے بڑبڑا رہی تھی، ناجی کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی، لیکن یہ بات وہ سمجھ گئی کہ نواب زادے محبت نہیں کرتے۔ لیکن اس کا سیاں تو ایسا نہ تھا، وہ ان کی ہر بات پر کیوں کر ایمان لے آتی، وہ لمبی چوڑی باتیں تو سمجھنے کی بیشک صلاحیت نہ رکھتی تھی، لیکن محسوسات کا آلہ تو ہمیشہ اسے سیاں کی محبت کا احساس دلاتا رہتا تھا۔

ماں کی ساری باتوں کے جواب میں اس نے بڑے سرشار لہجے میں سیاں کی بے پناہ محبت کا اسے یقین دلانا چاہا۔

"پیار دھنوانوں کا کھیل ہے ناجی" ماں کرخت لہجے میں بولی "تو اس کے لئے ایک رنگین کھلونا ہے بس۔!"

ماں کے لہجہ میں ڈانٹ تھی، ناجی پھر رونے لگی۔

"اس کا خیال دل سے نکال دے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، تیرا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں۔!"

"ماں"

"گرنے سے پہلے سنبھل جا — اس سے ملنے کا اب خیال بھی دل میں نہ لانا"

"ماں" ناجی کی روح ہمہ تن پکار بن کر چیخ اٹھی، وہ ماں کی گود میں اپنا منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی، ماں نے اسے دونوں شانوں سے پکڑا اور جھٹکا دے کر سیدھا کیا۔

"سمجھی میری بات"

ناجی، ہچکیاں لینے لگی۔

"کان کھول کر سن لے، اگر اب بھی تو نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو مجھ سے گراں تجھ سے ٹکرا کر تجھے راہ بناتا ہوگی"

"ماں" ناجی کے لہجہ میں منت و التجا تھی۔

لیکن ماں کا دل نہیں پسیجا۔

وہ روتی رہی۔

ماں نے چپ نہیں کرایا۔ پانی کے ریلے کا رخ ہمیں سے موڑ لینے کی ضرورت تھی، ماں اس کی ضرورت کی اہمیت خوب سمجھ چکی تھی وہ کوئی اور ہوتا تو شاید ماں کے رویہ میں لچک کی گنجائش بھی نکل آتی، لیکن وہ اک نواب زادہ تھا جس سے ناجی کے مستقبل کی وابستگی کا خیال بھی ماں کے فہم و ادراک میں نہ آسکتا تھا۔

ناجی رو رہی تھی۔ ماں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئی، تو ماں اسے زہر دے دے گی، اور ابدی نیند سلا دے گی۔ ناجی کے آنسو، آہیں، التجائیں، کوئی بھی تو ماں کی آہنی پابندی کو موڑ توڑ نہیں سکیں۔

ناجی ساری رات روتی رہی، صبح اٹھی تو اسکی آنکھیں اس حد تک متورم تھیں کہ کھولنا محال تھا۔ جبھی اس کا درد کم ہوتی تھی، لیکن بہ تقاضائے مصلحت اور سخت رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھی۔

صبح سے دوپہر ہو گئی، ناجی سراپا غم بنی بستر میں پڑی رہی۔ کبھی رونے لگتی کبھی خاموشی سے کچھ سوچنے لگتی۔

ناجی نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہ تھا، دوپہر بھی ڈھل رہی تھی ماں کی مامتا پگھلنے لگی، تھالی میں ساگ روٹی رکھ کر وہ ناجی کی چارپائی پر آ بیٹھی۔

"روٹی کھا لو بیٹی!" اس نے پیار سے ناجی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

گشتہ غم ناجی کو بھلا کھانے سے کیا سروکار تھا۔

"اٹھو بیٹی!" ماں نے تھالی زمین پر رکھ کر اس کا کندھا ہلایا۔

جی پھر سسکنے لگی۔

"اٹھ میری ناسمجھ بچی!" ماں نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

ماں کی، نرمی اور پیار سے مغلوب ہو کر ناجی بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے وہ اب بھی رو رہی تھی۔

ماں نے پیار سے اس کے الجھے بال درست کر کے ڈوپٹہ اس کے سر پہ

ڈال دیا۔

"تو نا سمجھ ہے میری بچی زمانے کے رنگ نہیں دیکھے، ان مردوں کا کیا بھروسہ پیار کے نام پر لوٹ لیتے ہیں، جب عورت کے پاس لٹانے کو کچھ نہیں رہتا تو اس طرح منہ پھیر لیتے ہیں جیسے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ عورت کہیں کی نہیں رہتی، لوگ اسے فاحشہ، اور بدکار کہہ کر اس کے سائے سے دور بھاگتے ہیں، اس کے دامن پر ایسا سیاہ داغ لگ جاتا ہے جسے وہ اپنی زندگی دے کر بھی نہیں مٹا سکتی۔"

تاجی سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"تاجی میں نے بھرپور جوانی اسی گاؤں میں گزاری ہے۔ بیوگی میں جوانی کاٹنا دوبھر ہوتا ہے، لیکن، میرا دامن آج تک بے داغ ہے، گاؤں بھر میں میری عزت ہے، لوگ میرے نام پر شرافت کی قسم کھاتے ہیں تیری ذرا سی لغزش میرے بے داغ دامن پر سیاہی پھیر دے گی، گاؤں میں کسی کے کانوں میں ذرا سی بھنک پڑ گئی کہ تو راتوں کے اندھیرے میں کسی سے ملنے جاتی ہے، تو قیامت مچ جائے گی، جینا دوبھر ہو جائے گا، تیرے پیار کی پاکیزگی کو کوئی نہیں دیکھے گا۔ بلکہ تجھے۔ تجھے۔!"

"ہاں" تاجی نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ اسکا دل پگھل پگھل کر آنسو بنا جا رہا تھا، سیاں کو کیسے چھوڑ سکے گی وہ ــــ یہ تو خیال بھی سوہان روح تھا!۔

ماں نے اسے اپنی محبت کی شفقتوں سے سنبھالا دینے کی کوشش کی بہلایا پھسلایا گاؤں میں چند سال پہلے شیدو کا واقعہ پیش آیا تھا، شہری بابو اسے یہیں کا نہ چھوڑ کر اپنے راستے پر چل دیا تھا، شیدو اپنے گناہ کی سیاہی چھپانے کے لئے پہاڑی ندی میں ڈوب مری تھی۔

اور

وہ جوشی کی کہانی بھی تو گاؤں بھر میں مشہور ہے، کیسے کیسے سبز باغ دکھا کر وہ بیوقوف مرد اسی معصومہ کو لے اڑا تھا۔ محبت کے سنہری سپنوں کی تعبیر ڈھونڈتی جوشی کے ہاتھ کچھ بھی تو نہ آیا تھا۔ ماں باپ سب کچھ لٹا بیٹھی تھی اور جب وہ لٹی لٹائی پھر اپنے گاؤں میں سر چھپانے کے لئے آ نکلی تھی، تو اس کے گھر والوں نے اسے وہ عبرتناک سزا دی تھی کہ گاؤں والوں کے دل کانپ اٹھے تھے۔

ماں نے نائکی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رشید اور جوشی کے تمام واقعات سنائے۔ نائکی تھرتھرا کانپ گئی۔

"کیا تو بھی اپنا ایسا ہی حشر دیکھنا چاہتی ہے؟" ماں نے کہا۔

"ماں! وہ ایسا نہیں" ایک بار پھر پورے وثوق کے ساتھ وہ کہہ اٹھی "وہ ان سب سے بڑھ کر ہوگا۔" ماں متوحش سی چلا اٹھی "وہ نواب کا بیٹا ہے، چند دنوں کی دل لگی کا ارمان اس کے ہاتھ آیا ہے ——— وہ تجھ سے شادی کرے گا، ایسی بھی نہ سوچ ——— یہ تو ایک جال ہے جس میں پھنسانے کے لئے وہ تجھے پھسلا رہا ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھ لی اور تجھے بچا لیا ——— ورنہ ———" انجام کا خیال کر کے ماں کو جھرجھری آ گئی۔

ماں کی باتیں نائکی کے دل سے سیاں کی محبت تو زائل نہ کر سکیں ہاں وہ اس سے اس طرح چھپ چھپ کر ملنے کی قباحت تو ضرور سمجھ گئی۔ اس نے آنسو دوپٹے کے آنچل سے پونچھ لئے۔

ماں کے اصرار پر اس نے منہ دھویا۔ چند نوالے زہر مار کئے اور پھر بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ دن جوں توں کر کے گزر گیا۔

رات آئی۔

ناجی کا سینہ جذبات کے تلاطم سے شق ہو جانے کو تھا۔

ماں کی دور رس نظریں اس کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح واقف تھیں۔ ناجی ماں کی عائد کردہ پابندیوں کو توڑ کر اپنے سیاں کے پاس جانا چاہتی تھی۔ لیکن ماں ایک خاموش پہرے دار کی طرح اس کی نگرانی کر رہی تھی، ناجی میں ماں سے ٹکرانے کی بھلا تو ہمت نہ تھی وہ اس کی ماں تھی، جس نے اس کو جنم دیا تھا اور بیوگی میں اپنی جوانی کے خون سے اس کے نخل حیات کو سینچا تھا۔ ناجی ماں سے بغاوت کیوں کر دیتی۔

ناجی کا ذہن کچے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ دل و دماغ گیلی لکڑیوں کی طرح سلگ رہے تھے، اپنی چارپائی پر پڑی وہ بسمل کی طرح تڑپ رہی تھی، جوں جوں رات گزر رہی تھی اس کی تڑپ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

جذبات کی کشمکش میں تڑپتے تڑپتے جانے کب ناجی کی آنکھ لگ گئی، ماں نے آہستگی سے اسے پکارا جواب نہ پا کر اٹھی اور ناجی پر جھک گئی۔ وہ سو رہی تھی مضمحل سی نیند۔ ماں نے اس کی پیشانی چوم لی اسکی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے گر کر ناجی کے بالوں میں جذب ہو گئے۔

ہٹ کر وہ اپنی چارپائی پر آ بیٹھی، مامتا کی تپش سے اسے اپنے سینے میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی کاش وہ اپنی بچی کی ہر خواہش پوری کرنے کی قدرت رکھتی۔

وہ کافی دیر تک جاگتی رہی، اپنی بے بسی پر رونا بھی آیا، کاتب تقدیر سے اس نے اپنی بیوگی پر کبھی اس دکھ اور بے بسی سے گلہ نہیں کیا تھا جتنا آج کر رہی تھی، کاش ناجی اس نواب زادے کی ہم پلہ ہوتی، یا وہی نواب زادہ ہونے کی بجائے اسی کی طرح کوئی غلام آدمی ہوتا۔ وہ اپنی بچی کا مستقبل اسکی خواہشوں کے سانچے میں ڈھال دیتی۔

ناجی بدستور سو رہی تھی۔ ماں نے اسے پھر پکارا پھر دیکھا، اٹھ کر اس پر چادر ٹھیک کی اور پھر مطمئن ہو کر خود بھی لیٹ گئی، جلد ہی اسکے تھکے ہوئے ذہن اور الجھے ہوئے دماغ کو نیند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور کافی رات ڈھلے جب چھلی تاریکیوں کا منحنی چاند سینہ چرخ پر نہ معلوم مدھم سی روشنی بکھیرنے کی سعی کر رہا تھا ناجی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

وسیاں۔ اس کے ہونٹوں سے نزیادہ نکلی، گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا دیئے کی مدھم روشنی تھرک تھرک کر بجھنے کو تھی۔ دروازہ بند تھا اور ماں گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی، اس نے دونوں ہتھیلیوں پر اپنی آنکھیں رکھ دیں۔ ذہن پوری طرح بیدار تھا، حقائق کی تلخی سامنے آگئی تھی۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس کی روح "سیاں سیاں" پکار رہی تھی، یہ پکار لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہی تھی۔

"سیاں انتظار کر رہا ہوگا ــــ" وہ اس خیال سے تڑپ اٹھی۔

روح کی پکار اک خاموش شور بنتی گئی۔

"نہیں۔ نہیں۔" ناجی نے سر جھٹک دیا۔ گھبرا کر اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ لیکن یہ شور رکا نہیں۔ رکتا بھی کیسے؟" یہ شور تو اسکی روح کی گہرائیوں سے اٹھ رہا تھا۔

ناجی اس شور میں ڈوب سی گئی۔

ناجی کی سعادتمندی ڈوبتی گئی۔

ماں کی نصیحتیں ڈوبتی گئیں۔

دھمکیاں ڈوبتی گئیں۔

اور

پھر ساری پابندیاں اس شور میں ڈوبتی چلی گئیں، ناجی چادر ہٹا کر بستر سے اٹھ بیٹھی۔ ماں گہری نیند سو رہی تھی۔

اس نے ماں کی طرف دیکھا۔

اپنے اور سیاں کے درمیان ایک ماں ہی سنگ لاخ چٹان نظر آئی۔

وہ مشتعل جذبات سے ماں کو گھورنے لگی، اس نے چاہا کہ ایک ہی جست میں اس چٹان کو پھلانگ جائے۔

دیئے کی تھرکتی روشنی میں اس نے قریب آکر ماں کو دیکھا، ماں اسوقت چٹان نہیں دکھائی دی۔ بلکہ ایک ایسا قابل تعزیم مرقد معلوم ہوئی جسے پھلانگنا تو ایک طرف اس کی طرف پشت کر کے کھڑا ہونا بھی گناہ کبیرہ ہے۔

بے دم سی ہو کر ناجی پیچھے ہٹی، اپنے بستر پر گر کر وہ بے اختیار رونے لگی، وہ کیا کرے کیا نہ کرے الجھن نے جیسے اسکے ہوش و حواس بھی چھین لئے تھے، وہ پاگلوں کی طرح اٹھ کر پھرنے لگی۔

اور۔

پھر اس نے سیاں کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ آخری بار جانے — اس کے بعد وہ اس سے نہیں ملے گی — کبھی نہیں ملے گی — لیکن آج آخری بار ضرور جائے گی — سیاں کو اونچ نیچ سمجھانے ماں کے خیالات سے مطلع کرنے زمانے کی ہوا کا رخ بتانے۔ اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ وہ کشاں کشاں اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی، ماں کا ڈر دل سے نکل چکا تھا۔ ماں نے پوچھا بھی تو وہ سچ سچ بتا کر پھر سیاں سے نہ ملنے کی قسم کھا لے گی۔

طاہر حسب معمول درختوں کے جھنڈ میں اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ناجی وقت پر نہ آئی تو ان کا دم گھٹنے لگا، وقت گزرتا گیا۔ رات کی نقیبیں ڈوبتی گئیں، طاہر

ماہی بے آب کی طرح کبھی کھلے میدان میں کبھی نشیبی حصے میں تڑپتے پھر رہے تھے، بیتاب ہو کر کئی بار انھوں نے ناجی کو پکارا تھا، وقت گزرتا جا رہا تھا، اور طاہر کی بیتابی جنون بنتی جا رہی تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا طاہر سبزے پر سر تلے دونوں ہاتھ باندھے چت پڑے تھے ناجی کے نہ آنے سے وہ بے جان سے نظر آ رہے تھے، سوچ سوچ کر ان کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"سیاں" ناجی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز خاموشی کے سینے میں گونجتی ہوئی آئی، طاہر بے اختیارانہ اٹھ کر آواز کی سمت دوڑے، ناجی کا سایہ دیکھ کر وہ مقناطیسی کشش سے اس کی جانب کھنچے۔

"ناجی!" طاہر نے لاشعوری طور پر اپنے بازو پھیلائے ناجی بے اختیارانہ ان بازوؤں کے حلقے میں سما گئی۔

"ناجی!" "تم کہاں تھیں ناجی" طاہر نے اس کے حسین پیکر کو پوری قوت سے سمیٹ کر درد بھری آواز میں کہا۔

ناجی ان کے کندھے پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"ناجی" طاہر بیتاب ہو گئے"

"سیاں" ناجی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طاہر کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا وہ اس کے نہ آنے سے ہی سمجھ گئے تھے کہ وجہ کیا ہے، اب ناجی رو رہی تھی، طاہر جیسے زیرک انسان کیلئے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ ان کا ملن فلک کج رفتار کو گوارا نہیں۔

ناجی ہچکیاں لے رہی تھی۔ طاہر نے اسکے کانپتے وجود کو مضبوطی سے تھام لیا اور پھر بڑی عقیدت سے اپنے لب اس کے بالوں پر رکھ دیئے۔

ناجی کے آنسوؤں سے ان کے کوٹ کا کالر اور قمیض بھیگ رہی تھی، طاہر کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا دے کر طاہر نے ناجی کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ سے چھو کر اونچا اٹھایا۔

"میاں!" ناجی مجسم فریاد بن گئی۔

"کیوں ناجی!" طاہر نے اس کی متورم آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز میں دکھ کی آمیزش تھی۔

ناجی نے سر جھکا لیا۔ آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ طاہر کے بازوؤں کی گرفت سے نکل کر کھڑی ہو گئی طاہر نے اسے وہیں سبزے پر اپنے قریب بٹھا لیا۔ پھر طاہر کے بار بار پوچھنے پر اس نے ساری بات طاہر سے کہہ دی۔

"ناجی کہتی ہے" وہ بوجھل آواز میں بولی۔ "تم مجھے برباد کر کے چھوڑ دو گے"۔

"ناجی!" طاہر یوں چیخے جیسے کوئی بیگناہ جرم عائد ہونے پر چیخ اٹھے۔ "میاں۔ میں کیا کروں"! وہ پھر رو دی ــــ "ماں کہتی ہے پیار دشمنوں کا کھیل ہے ــــ"

طاہر کے چہرے پر آثار کرب تھے، ہونٹوں کو کاٹتے پریشانی کے عالم میں وہ اپنی انگلیاں مسل رہے تھے۔

ناجی نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے۔

"میں جاتی ہوں میاں ــــ ماں جاگ جائے گی"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

طاہر کسی دقیق سوچ میں الجھے تھے، ناجی کی آواز پر چونکے اور پھر اٹھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

"جا رہی ہو ناجی؟" طاہر نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں" گلوگیر سا جواب تھا۔

"جاؤ" آہستگی سے کہا گیا۔

ناجی نے انکی طرف دیکھا، بیقرار ہو کر دیکھا۔ اسکی آنکھوں سے آنسو چھلک کر گالوں پر پھسل گئے۔

طاہر نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا — ناجی —!" یوں رو رو کر اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔ تمھارے لئے میں زمانے سے ٹکرا جاؤں گا۔ میں تمھیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔ ناجی۔ تمھاری ماں پر یہ ثابت کروں گا۔ کہ پیار دھنوانوں کا کھیل ہی نہیں ان کی زندگی بھی ہوا کرتا ہے"

"ہاں!" دفعتہ جذبات میں ناجی کی آواز گھٹ گئی اسکی آواز گھٹ گئی۔ اس کی روتی آنکھوں میں جیسے دیئے سے جل اٹھے۔

"جاؤ ناجی!" طاہر نے اپنے ہاتھ ہٹا لئے۔ "کل سے تم یہاں نہ آیا کرنا"

ناجی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے طاہر کو دیکھا۔

اب میں تمھارے گھر آؤں گا" طاہر نے پختہ عزم سے کہا۔

"میرے گھر۔؟" ڈر اور حیرت سے ناجی کانپ گئی۔

"ہاں۔ تمھارے گھر۔ تمھاری ماں سے تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مانگنے"

ناجی تلخ حالات کو بھول کر فردا کے حسین تصور سے جھوم گئی۔

"تمھیں چند دن۔ انتظار کرنا پڑے گا، لیکن گھبرانا نہیں"

"ہاں" سراسیمگی سے ناجی کہہ اٹھی۔

"میری راہیں بڑی کٹھن ہیں ناجی —" طاہر نے اسکی سراسیمہ نظروں پر تفکر نظروں سے دیکھا۔ لیکن مشکلات حل کرنے ہی کو ہوتی ہیں، میرے والدین میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں گے نہیں آرام کرنے کے لئے

کچھ دن ضرور لگیں گے، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائیں گی اور میں تمہیں اپنی خواہش کے مطابق اپنے خاندانی وقار کے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

انھوں نے ناجی کے ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے دبائے۔ "وعدہ کرو تمہارا انتظار دم نہیں توڑے گا۔"

ناجی نے انکی طرف دیکھا اس طرح کہ جیسے کہہ رہی ہو۔ میں تمام عمر تمہارا انتظار کر سکتی ہوں۔" ناجی کا ہاتھ تھامے طاہر آج اسے گھر کے دروازے تک چھوڑنے گئے۔

ناجی نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں جھانک کر دیکھا ماں بدستور سو رہی تھی۔ وہ طاہر کی طرف پلٹی۔ دونوں ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھتے رہے۔

آج دونوں ایک غیر معین عرصے کے لئے جدا ہو رہے تھے، گو اس عارضی جدائی کے عقب میں خوشیاں مسکرا رہی تھیں۔ تاہم جدائی جدائی ہی تھی دونوں ان جاں گسل دنوں کے خیال سے افسردہ و اداس نظر آ رہے تھے۔

انتظار کا وعدہ لے کر طاہر نے ناجی کو خدا حافظ کہا۔

وہ لوٹ گئے۔

ناجی کی آنکھیں ایک بار پھر چمک اٹھیں۔

طاہر کا دل بھی ڈوب رہا تھا۔ مڑ کر ناجی کو دیکھنے کے بجائے انھوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

الحمرا میں جیسے کوئی بم پھٹا۔

طاہر نے فوزیہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ جشن کے پروگرام بن رہے تھے، شادی کو روائتی آن بان سے کہیں بڑھ چڑھ کو منانے کے اہتمام ہو رہے تھے طاہر نواب فاروق علی خاں کے چہیتے اور منظور نظر تھے اس لئے یہ شادی ایک تاریخی اہمیت رکھتی تھی۔

حسن بانو بڑے ارمانوں سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ریحان کی والدہ سعدیہ انکا ہاتھ بٹانے میں پیش پیش تھیں، ایک طرف دیور دوسری طرف بہن خوشی سے شادیوں کی گھما گھمیوں میں شریک تھیں۔

طاہر نے اچانک اس شادی سے انکار کر دیا۔

اس انکار سے ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

اور

جب انھوں نے اپنے انتخاب کو والدین کے سامنے رکھا تو یہ ہنگامہ ایک قیامت خیز دور میں داخل ہو گیا۔

صدیوں سے ایک خاص آن بان کا حامل خاندان اپنے وسیع دامنوں تلے ایک پہاڑی گنوار لڑکی کو جسے تہذیب و تمدن کی روشنی نہ ملی ہو، جس کا خاندان کسی طرح بھی اس عالی خاندان سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ کیسے قبول کر لیا جاتا؟

یہ اس پرشکوہ خاندان کی بے عزتی تھی؛
یہ وقار کی ہتک تھی۔
یہ جاہ و جلال کی توہین تھی؛
طاہر کی نادانی سمجھ کر انھیں راہ راست پر لانے کیلئے نرمی سے سمجھایا گیا۔
منت و سماجت بھی گئی، ساحرانہ کشش کے حامل سبز باغ بھی دکھائے گئے لیکن
طاہر اپنے عزم سے ذرہ بھر بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے ایک بار جو فیصلہ کر لیتے
وہ پتھر پر لکیر ہوا کرتا تھا، یہ تو ان کی زندگی کا سوال تھا۔ ان کے
پیار کا معاملہ تھا،
نرمی سے سمجھانا بجھانا راس نہ آیا۔
تو
پدرانہ وقار جلال میں آگیا۔
استاد نے نمی ناگن کی طرح پھنکاری۔
خاندانی وقار۔ نام نمود۔ ظاہرداری عظمت و آن کی خون آشام
تلواریں لہرائیں۔
لیکن۔
کوئی بات بھی طاہر کو اپنے عزم صمیم سے ہٹا نہ سکی۔ کوئی بات بھی انھیں
متزلزل نہ کر سکی۔ انکا ایک ہی جواب تھا کہ شادی ہوگی تو صرف تاجی سے
معاملہ کسی طرح بھی نہ نپٹ سکا، تو نواب صاحب فاروق علی خاں نے
آخری داؤ کے لئے انھیں اپنی خوابگاہ میں طلب کیا۔
رات کے کھانے کے بعد سب اپنی اپنی خوابگاہوں میں جا چکے تھے آرام گاہ
ایک مضمحل پاسکوت اور مہیب سی اداسی الحمراء کے در و دیوار پر چھائی رہتی

تھی۔ سرِ شام ہی گہری رات کا احساس ہوتا، رد نقیبیں دم توڑ چکی تھیں، کھانے کے بعد مل بیٹھنے کا شاید کوئی تمنائی نہ رہا تھا۔

نواب فاروق اپنی خوابگاہ میں بیتابی سے ٹہل رہے تھے، ظاہر کی سرکشی سے ان کے وقار کو جو گزند پہونچا تھا، اس کے آثار ان کے پر رعب چہرے پر بڑے واضح نظر آتے تھے، وسیع اور شاہانہ ٹھاٹھ سے آراستہ خواب گاہ میں بھی انہیں دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

بیٹے کا پیار دل میں درد بن کر رِس رہا تھا، لیکن خاندانی آن کے تحفظ اور روایت پرست فاروق اپنے نظریئے میں لچک کے روادار نہ تھے۔ ظاہر اجازت لے کر اندر داخل ہوئے۔ فاروق کمرے کے وسط میں کھڑے تھے۔ باپ بیٹے کی نظریں ملیں۔ ظاہر نے نظریں جھکا لیں۔

لیکن۔

اس جھکاؤ میں شکست نہ تھی، احترام تھا۔

"ظاہر" پر رعب آواز کمرے میں گونج پیدا کر گئی۔

"جی" مودبانہ جواب تھا۔

"میں نے جس مقصد کے لئے تمہیں بلایا ہے، تم جانتے ہو؟" سنگین لہجے میں کہا گیا۔

"جی ہاں" جواب میں اٹل فیصلے کی گونج تھی۔

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"جو پہلے تھا"

"ظاہر"

"! حضور"

"خوب سوچ لو، یہ سودا خسارے کا ہے، اس وقت عالم جنون میں تم کچھ سوچ نہیں سکتے، لیکن یہ جنون جتنی تیزی سے آیا ہے، اسی طرح اتر بھی جاتا ہے۔ اپنے کئے پر تمہیں پچھتانا نہ پڑے گا۔"

"میں نے بہت سوچ بچار کر لی حضور!"

تو اس دیہاتی گنوار لڑکی کے..."

"ابا حضور۔"

"یہ لڑکی غالباً حسین ہوگی۔" باپ نے بیٹے کو قطعاً نظر انداز کر کے پھر طنز کیا۔ "لیکن یاد رکھو کہ یہ گنوار حسن تہذیب یافتہ ماحول میں کبھی نہیں پنپ سکتا جنگلی پھول کانٹے دار جھاڑیوں میں زیب دیتے ہیں، نکھرے ہوئے آراستہ چمنوں میں وہ بھدے اور بدنما دکھائی دیتے ہیں۔"

طاہر کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوا جا رہا تھا، آداب فرزندی مانع تھا، بمشکل ضبط کئے ہوئے کھڑے تھے، ورنہ وہ نواب فاروق کو اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دے دیتے۔

طاہر نہ نرمی سے مرعوب ہوئے نہ طنز سے، باپ کی برداشت جواب دے گئی۔

فاروق جلال میں آ گئے، انکی آواز میں شیروں کی گھاڑ اور طوفانوں کی گرج تھی، طاہر اپنے برافروختہ جذبات کو قابو میں رکھنے کی سعی کر رہے تھے۔

"تو اس دیہاتی لڑکی کے لئے تم ہم سے ٹکرا رہے ہو؟"

"میں اس کے لئے زمانے سے بھی ٹکرا سکتا ہوں۔"

"جنون ان حدود کو چھو رہا ہے!"

"آپ کی دور رس نظریں بہت کچھ دیکھ سکتی ہیں۔"

"اس کا انجام جانتے ہو؟"

"جو ہوگا۔ ذمہ دار میں خود ہوں۔"

"پھر سوچ لو۔"

"اتنی دفعہ سوچا کہ اب سوچنے کی گنجائش ہے نا ضرورت!"

"طاہر!"

"جی!"

"تم خودسری پر آمادہ ہو!"

اگر آپ نے بخوشی اجازت نہ دی، تو میں ایسا کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا!"

"یاد رکھو تمہاری مجبوری ہماری مجبوری سے ٹکرائی تو انجام اسکا تمہارے لیے خطرناک ہوگا۔"

طاہر نے جواب دینا غیر ضروری نہ سمجھا۔ چپ ہو گئے۔ لیکن بے چینی انکی رگ رگ سے مترشح تھی، سرخ انگارہ کی آنکھیں، پھڑکتے ہوئے نتھنے اور بیقراری جسم کی ہر جنبش سے ظاہر تھا کہ وہ اپنی بات پر اسی طرح قائم ہیں۔

نواب فاروق نے بھی اپنی مشتعل جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن طاہر کے بے باک اور بے دھڑک جوابات سے انکی آتش غضب بری طرح بھڑک اٹھی تھی، پھر بھی دل کے گوشے میں درد بن کر سلگتا ہوا پیار طاہر کو سوچ کا اور موقعہ دینا چاہتا تھا۔

ان کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ ہاتھوں میں خفیف سا رعشہ تھا پائپ میں بار بار تمباکو بھرنا ان کے جذباتی ہیجان کا آئینہ دار تھا۔

"طاہر"! وہ گدے دار کرسی پر بیٹھتے ہوئے غصے سے بولے "ہم تمہیں غور کرنے کا موقعہ دیتے ہیں، اپنی تقدیر پر سیاہی پھیرنے سے پہلے پھر ایک بار اچھی طرح

سوچ لو۔ جس راستے پر آنکھیں بند کر کے گامزن ہو۔
"آنکھیں کھول کر اچھی طرح جائزہ لے لو۔ جاؤ سوچو۔ اور پھر ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع کرنا۔ جاؤ۔!"
طاہر کھڑے رہے، باپ کی نرمی نے انکے سینے کا تشنجی دورہ ختم کر دیا تھا بچھڑے ہوئے جذبات اس نرمی سے دوچار ہو گئے تھے۔
تم جا سکتے ہو۔" نواب فاروق نے آہستگی سے کہا۔
لیکن طاہر واپس جانے کی بجائے بیتابانہ باپ کی طرف بڑھے۔
"ابا حضور!" وہ معصوم بچے کی طرح باپ کے قدموں پر گر گئے۔
بیٹے کی اس حرکت پر باپ کا دل پگھل گیا لیکن وہ اپنے اٹل فیصلے پر سختی سے کاربند تھے۔
"ابا حضور!" مجھے مجبور نہ کیجئے۔" طاہر نے سر اٹھا کر باپ کے زانو پر ٹکا دیا۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح سسک رہے تھے۔
"طاہر" باپ کی گلوگیر آواز ابھری۔ وہ اپنے ہاتھ بیساختہ طاہر کے بالوں پر شفقت سے پھیرنے لگے۔
وہ چپ تھے، اور خوابیدہ نگاہ کا خوابیدہ ماحول طاہر کی سسکیوں سے لرزیدہ تھا۔
"میرے بچے! کافی دیر چپ رہنے کے بعد نواب فاروق بولے۔" حالات کو سمجھو بیٹے، ہمارے خاندانی حالات کیا ہیں، تمہیں فوزیہ سے منسوب ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہے، وہ تمہاری خالہ زاد ہے، تمہاری خالہ بیمار رہتی ہے یہ جدائی لے کم قاتل ہو گی، منگنی ٹوٹ جانا کتنی معیوب بات ہے۔"
"میں فوزیہ کو ایک مستقل آزار کے سوا کچھ نہ دے سکوں گا، ابا حضور!" تین زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔ فوزیہ کے لئے اچھے سے اچھا رشتہ مل سکتا ہے۔

میں۔ میں نا جی کے بغیر ــــ زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا! ابا حضور!
"مجھے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے ــــ میں آپ کی شفقتوں کے سایہ سے محرومی نہیں رہنا چاہتا ابا حضور۔!"

طاہر نے سر اٹھا کر باپ کو دیکھا۔

باپ نے منہ پھیر لیا۔ شاید بیٹے کے بلیغانہ اثرات سے انکے سینے کا بوجھ نرم ہوا جاتا تھا۔

"ابا حضور!" مجھے بخوشی اجازت دیجئے!" طاہر نے پھر اسی طرح باپ کی طرف دیکھا۔

"جاؤ بیٹے!" باپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "تمہارے جذبات بھڑکے ہوئے ہیں۔ جا کر آرام کرو۔"

"ابا حضور!"

"معاملہ کو نبٹانے کے متعلق سوچو، ہمارا فیصلہ اٹل ہے! اور ہم مرتے دم تک اس پر کاربند رہیں گے ــــ آواز یوں نکل رہی تھی، جیسے کہ کوئی زبردستی ان کے منہ سے یہ باتیں اگلوا رہا ہو۔"

طاہر مایوس ہو گئے۔

وہ کمرے سے یوں نکل گئے، جیسے روح قالب سے مرنے کے بعد سب بندھن توڑ کر نکل جاتی ہے۔

"یہ حیلہ بھی کارگر نہ ہوا۔ خواہ مخواہ کی خفت ہی اٹھائی وہاں جا کر۔"

"آپ نے جلدی سے کام لیا حضور ـــ ورنہ میں ناجی کی ماں کو ضرور مجبور کر دیتا ـــ پیسہ بڑی چیز ہے جناب ـــ ایمان بک جاتا ہے وہ ضرور اپنی بیٹی کو صاحبزادے کی راہ سے ہٹانے کی حامی بھر لیتی۔"

"یہ تمہاری بھول ہے سیفو۔ ہم نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا وہ ایک غیرتمند عورت ہے، دولت اسے خرید نہیں سکتی۔"

"ہے تو غیرتمند۔"

"نوٹ دیکھ کر وہ کس طرح جھپٹی تھی، کتنا جلال تھا اس کے چہرے پر۔ اف کتنے نادم ہوئے تھے ہم اس لمحہ ـــ پتہ ہوتا تو پیسے کی بات ہی نہ کرتے منت سماجت سے کام لیتے۔"

"پھر تو کام منٹوں میں بن جاتا۔"

"اچھا خیر اب اس بات کو چھوڑو ـــ کوئی دوسرا حل تلاش کرو ـــ طاہر کو اس راہ سے ہر قیمت پر ہٹانا ہے، ہاں طاہر کو علم نہ ہونے پائے کہ ہم گاؤں گئے تھے۔"

"میں سمجھتا ہوں سرکار ـــ انھیں کیسے علم ہوگا۔"

شومئی تقدیر دونوں کی باتیں طاہر نے بھی سن لیں وہ خوابگاہ میں آج باپ سے آخری فیصلہ کرنے آئے تھے۔ آخری دو ٹوک فیصلہ سیفو اور باپ کی باتوں سے حقیقت سامنے آئی۔ ان کی اس بے رحمانہ ذہنیت پر ان کا خون کھول اٹھا۔

بھرے ہوئے جذبات لئے وہ خوابگاہ کا پردہ اٹھا کر بغیر اجازت اندر جا پہنچے۔ سیفو انھیں دیکھ کر بے طرح گھبرا گیا، فاروق نے انکے تیور دیکھ ہی بھانپ لیا۔ کہ انکا ارادہ کیا ہے۔ شکست خوردہ تو تھے ہی بیٹے کی گستاخانہ حد

تک ضد سے جھلا گئے۔ پیشانی پر بل پڑ گئے، آنکھوں میں غصہ کی چمک لہرائی گھوم کر بیٹے کو دیکھا۔

"ابا حضور، میں آخری بار آپ کی خدمت ــــ" طاہر غصہ پر قابو پانے کی کوشش میں بولے۔

"یوں وبال جان بننے سے بہتر تھا کہ تمھیں موت آجاتی۔" انھوں نے تلخی سے گرج کر کہا۔

"آپ اب بھی یہی سمجھے کہ طاہر مر گیا ــــ" وہ پلٹے۔

"اس خودسری کی سزا بھیانک ہوگی۔" نواب گرجے۔

"مجھے اس کی پرواہ نہیں ــــ" اسی لہجے میں جواب دیا گیا۔

سیفو جلدی سے اُٹھ کر طاہر کے سامنے آگیا، شانے سے پکڑتے ہوئے انھیں واپس باپ کی طرف لانا چاہا۔

لیکن جوانی کے طوفانوں کو یوں بھی کبھی روکا جا سکتا ہے طاہر نے اس کا ہاتھ غصہ سے جھٹک دیا۔

"انھیں جانے دو سیفو۔"

"نواب صاحب! آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیئے۔"

"ہم نے سب سوچ لیا اس خودسری کی سزا سے بھگتنے دو۔ وہ رعد و باراں کی طرح گرجے

"ہم انھیں ان کے حق وراثت سے محروم کرتے ہیں۔"

"نواب صاحب!"

"جاؤ ــــ دفع ہو جاؤ ــــ اگر تم اپنی ضد پر ہو تو اسی وقت الحمراء کو چھوڑ کر دفع ہو جاؤ۔"

"بہت بہتر" طاہر ایک لمحہ ضائع کئے بغیر کمرے سے نکل گئے۔ سیفو انھیں پکڑنے کے لئے لپکا، لیکن وہ اسے دھکا دے کر چل دیئے۔

سیفو اس خاندان کا پرانا نمکخوار تھا، بات بڑھتے دیکھ کر وہ سیدھا بیگم صاحبہ کے پاس پہونچا، وہ نشست گاہ سے خوابگاہ کی طرف جا رہی تھیں۔

سیفو نے ہانپتے ہوئے ساری روئداد انھیں کہہ سنائی

"آپ چل کر نواب صاحب کو سمجھائیے" بیگم صاحبہ۔ طاہر تو نا سمجھ ہیں، ضد کر بیٹھے ہیں، وہی اپنے فیصلے پر ترمیم کر لیں۔"

"انھیں جانے دو۔" بیگم صاحبہ نے فرمایا۔

سیفو نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ بیگم صاحبہ کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ ہونٹ کانپ رہے تھے، لیکن روایت پرستی میں وہ شوہر سے دو ہاتھ آگے تھیں۔

"بیگم صاحبہ!"

"سیفو!" طاہر والدین سے ٹکرا رہے ہیں۔ انھیں اس خودسری کا نتیجہ بھی دیکھ لینے دو۔"

"نواب صاحب نے انھیں عاق کر دینے کی دھمکی دی ہے۔"

"دھمکی نہیں، یہ حقیقت ہو گی۔ انھوں نے بہتر کیا طاہر کو سیدھی راہ صرف اسی صورت میں نظر آسکے گی۔"

"آپ طاہر میاں کو ہی سمجھائیے!"

"فضول ہے۔ طاہر کی بات پتھر کی لکیر ہی ہوتی ہے وہ جو کہیں کر گذرتے ہیں۔"

"پھر بیگم صاحبہ۔ کیا ہو گا۔؟"

"جو ہو گا ہونے دو۔!"

سیفو جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ بھی جھوٹی آن کی خاطر مامتا کے تڑپتے جذبوں

کو موت کی نیند سلا تا چاہتی ہیں۔

مایوس ہو کر وہ لوٹا، طاہر کے کمرے کی طرف آیا۔ وہ بھی اپنے کمرے ہی میں تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ باپ کی دھملی کو عملی جامہ پہنا کر وہ رات الحمرا کی چھتوں تلے ہرگز نہ گزاریں گے۔

وہ سیدھا اظہر کے پاس گیا۔ بڑا بھائی ہونے کی صورت میں ان پر بھی تو کچھ ذمہ داریاں تھیں۔

اظہر سیفو کے ساتھ آئے سعدیہ بھی روئداد سن کر انکے پیچھے آئی۔ طاہر اپنے کمرے ہی میں تھے، غصے سے کانپ رہے تھے، دماغ نسیں جیسے پھٹ جانا چاہتی ہوں۔ حب دالدین کی محبت مرچکی تھی تو پھر انھیں کس بات کی قید تھی۔ جوانی کا خون جوش کھا رہا تھا۔ اپنا بڑا سا لوہے کا صندوق کھولے وہ اپنی ذاتی چیزیں اس میں الٹ پلٹ کر چیزوں کو ٹھونس رہے تھے، کچھ ہی دیر پہلے کا اکراستہ کمرہ اب الٹ پلٹ چیزوں سے بھرا پڑا تھا۔

طاہر نیم دیوانگی کے عالم میں چیزیں رکھ رہے تھے، بال بکھر کر پیشانی پر آگئے تھے، رنج و غم سے زرد چہرہ اور کمزور نظر آرہا تھا۔ باپ سے انھیں کسقدر محبت تھی، شاید یہ حالت، اسی وجہ سے ہو رہی تھی لیکن وہ مجبور تھے۔

میز کی دراز کھول کر انھوں نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے بینک میں انکی ذاتی رقم کافی تھی فکر فردا سے بہتیروں بے غم رہ سکتے تھے۔ اپنا چرمی بکسوا اٹھا کر جوش و غیظ و غضب سے پیتے وہ کمرے پر الوداعی نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکلے۔

دروازے پر اظہر اور سیفو مل گئے

"کہاں جا رہے ہو طاہر!" اظہر نے لپک کر انھیں شانے سے پکڑ لیا۔

"جہاں تقدیر لے جائے!"

"پاگل ہو گئے ہو۔"

"چھوڑ دیں مجھے!"

"طاہر بچہ کیوں بنتے ہو۔" سعدیہ نے بھی بڑھ کر انھیں تھام لیا۔

بھائی بھاوج نے بہت سمجھایا، سیفو نے منتیں کیں۔ لیکن طاہر کہاں ماننے والے تھے، سبھی کو بچا گئے تھے، یہی بھائی بھاوج تو انکی مخالفت میں پیش پیش تھے

"نواب صاحب کو میں منالوں گا صاحبزادے، اس وقت وہ غصہ میں تھے کچھ دن صبر کرو۔" سیفو منت کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے اب کسی کی ضرورت نہیں۔" طاہر نے بھڑکتے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

"ایسی خود غرضی بھی اچھی نہیں ہوتی طاہر۔" سعدیہ نے روہانسی آواز میں کہا!

"خود غرضی کیسی ــــ مجھے تو عاق کر دیا گیا ہے۔ آپ ہی کا عطا دے۔"

طاہر جھلا کر بولے!"

"طاہر تمھاری سوچ کے رخ یوں بدل گئے ہیں۔ ایک لڑکی کی خاطر

"اظہر جملہ پورا نہ کر سکے۔

"ایک لڑکی نہیں بھائی جان ــــ ایک وعدہ ــــ طاہر اپنے وعدے سے نہیں پھر سکتا۔ وراثت تو ایک طرف، مجھے اپنی جان بھی اگر دینا پڑے تو میں گریز نہ کروں گا۔"

کندھا جھٹک کر انھوں نے بھائی کا ہاتھ ہٹایا۔ اور انکی طرف دیکھے بغیر اپنا صندوق اٹھا کر نکل گئے۔

ایک بار انھوں نے مڑ کر ضرور دیکھا، سعدیہ اور اظہر ابھی تک برآمدے

کے ستون سے لگے کھڑے تھے، سیفو بھی گردن جھکائے ہاتھ مل رہا تھا۔
انھوں نے جلدی سے منہ پھیر لیا ـــــ اور تیز تیز قدم اٹھاتے الجز
کے بیرونی پھاٹک سے باہر نکل گئے۔
آج ایفائے عہد اور پیار کی خاطر طاہر واقعی زمانے سے ٹکرا گئے تھے
عارضی قیام کے لئے وہ اپنے دوست آصف کے ہاں چلے گئے۔

رات بھر کی ادھوری اور بیقرار نیند طاہر کی آنکھوں میں سرخی بن کر
جھلک رہی تھی، اپنے پیار اور وعدے کی خاطر وہ والدین، بھائی، بہن
اور ایک پرتعیش ماحول چھوڑ آئے تھے، صبح اٹھے تو طبیعت بوجھل سی تھی
سینے میں ہلکی ہلکی کسک بھی تھی۔ والدین سے ٹکراؤ گستاخانہ صورت اختیار
کر گیا تھا اس پر انھیں ندامت بھی ہو رہی تھی۔
لیکن
اس کے باوجود ان کا عزم راسخ تھا۔ ناجی جو مقام حاصل کر چکی تھی
سے اسے ہٹانا انکے بس میں نہیں تھا، افسوس تھا تو صرف اس بات کا کہ والدین
نے انکی خوشی میں خوشی سے شرکت نہ کی، وہ ایسا کرتے تو طاہر کی خوشیوں
کا رنگ ہی اور ہوتا۔
صبح ہی صبح وہ ناجی کی ماں سے ملنے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ آصف
ان کی ہٹ اور ضد سے واقف تھا۔ اس لئے انھیں سمجھانے بجھانے کی فضول کوشش
نہ کی، طاہر ناجی کے ہاں چل دیئے۔ دن بڑا روشن تھا، آغاز سرما کا

بڑی خوشگوار تھی تم آلودی دھوپ گلپوش پہاڑیوں کے بلند و پست پر پھیلی ہوئی تھی۔
طاہر اپنی دھن میں مست ٹیڑھے بٹرھے پہاڑی راستے پر ایک فاتح کے سے انداز سے بڑھے جا رہے تھے پہلے موڑ پر انھوں نے لاشعوری طور پر نیچے گھاٹی میں دیکھا۔

ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں انھیں سفید آنچل لہراتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انھیں یہ جاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی کہ وہ ناجی تھی ــــ اوپر جانے کی بجائے وہ گھاٹی میں اترنے لگے، چھوٹے موٹے پتھروں پر پیر رکھتے خار دار جھاڑیوں سے الجھتے۔ پھولوں کی چھیڑ سے بچتے بچاتے طاہر غیر ہموار زمین پر راستہ بناتے بے اختیار جان آرزو کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔

ناجی پتھر پر بیٹھی تھی، اس کے سیاہ لانبے ریشمی بال ہوا کے جھونکوں سے پریشان ہو رہے تھے، ڈوپٹہ سر سے کھسک کر شانوں پر آگیا تھا آنچل اڑ رہے تھے، لیکن ناجی بے سدھ بیٹھی تھی۔ طاہر دبے قدموں سے بڑھے۔ ناجی کی طرف انکی پشت تھی۔"

ناجی بے خبر بیٹھی تھی، رات بھر رونے سے آنکھیں متورم تھیں۔ ماں نے بہتیرا بھایا۔ پیار کیا۔ اپنے اور نواب صاحب کے درمیانی خلا کا احساس دلایا لیکن ناجی تو میاں کی محبت میں اس طرح ڈوب چکی تھی کہ یہ بھلاوے اسے کنارے پر لانے کی بجائے اور گہرائیوں میں لے جا رہے تھے۔

ساری رات تڑپ تڑپ کر رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل کر اس گھاٹی میں آبیٹھی تھی، جہاں اس کے سادہ سے ذہن پر عشق و محبت کی گلکاریاں ہوئی تھیں، جہاں اس کی بے بود و باس زندگی میں پھولوں کی مہک تھی۔ اور جہاں اسکا تنہا سا دل اک انوکھی کسک اور درد بھری لذت سے آشنا ہوا تھا

وہ اپنے غم میں ڈوبی تھی، طاہر دھیرے دھیرے بڑھے، اور چپکے سے اپنے ہاتھ ناجی کی آنکھوں پر رکھ دیئے۔

"سیاں" ناجی بے اختیار چیخ اٹھی۔ اس نے جلدی سے طاہر کی کلائیوں کو تھام لیا۔

"ناجی" طاہر کی انگلیوں میں آنسو جذب ہو گئے۔ تڑپ کر انھوں نے ہاتھ کھینچے اور گھوم کر اس کے سامنے آ گئے۔

"سیاں!" ناجی کی جل بھری آنکھوں میں درد بھرا شکوہ تھا۔ فراق کی گھٹن تھی عشق کی تپش تھی، وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے طاہر کو دیکھتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

طاہر نے بازو پھیلا دیئے ناجی ان کے بازوؤں کی گرفت میں آ گئی، طاہر کے کندھے پر سر رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

طاہر کی زبان گنگ تھی، جبر کے جانگسل لمحوں کا انھیں اب احساس ہو رہا تھا، چند لمحے ناجی کی سسکیاں طاہر کی خاموشی سے ٹکراتی رہیں۔

پھر

طاہر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے ناجی کی ٹھوڑی کو انگلیوں کے سہارے اونچا کیا!۔

"ناجی!"

"تم آ گئے سیاں — تم آ گئے" وہ روتے روتے مسکرا دی — یوں لگا جیسے شبنم سے دھلی گلاب کی پتیاں ہوا کے ہلکورے سے لرز گئی ہوں۔

"میں آ گیا ہوں ناجی — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آ گیا ہوں!"

"سچ؟"

"ہاں ناجی!" طاہر نے اسے پوری شدت سے بازوؤں کی گرفت میں جکڑ

لیا۔ "اب ہمیں کسی کا ڈر نہیں ناجی ــــ ہم دونوں ایک ہو گئے ــــ ایک۔ ــــ"

ناجی نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر طاہر کے کندھے سے ٹکا دیا ــــ اک روحانی سکون کا احساس اسکے رگ و پے میں مسرت کی لہر بنکر دوڑنے لگا۔

اس دن کافی دیر تک دونوں چپ بیٹھے رہے۔ طاہر ناجی کی محرومی انگلیوں سے کھیلتا رہا اور اپنے مستقبل کے خاکے میں رنگ بھرتے رہے۔ ناجی انکی سنگت کی کیفیت جامعانی سے سحور سی بیٹھی رہی، طاہر اسے اتنے دنوں کی روداد سناتے رہے، ناجی کے عزم سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔

"چلو ناجی!" کافی دیر کے بعد طاہر اٹھے ناجی کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی اٹھایا۔

"کہاں۔؟"

"تمہارے گھر۔"

"میرے گھر۔؟"

"ہاں۔"

"کیوں۔؟" وہ جھجک گئی۔

"ماں جی کے پاس؟"

"آپ جائیں گے ــــ آپ ماں کے ــــ پاس جائیں گے"

"کیوں؟ ــــ عجیب کیوں لگ رہا ہے، اب کون سی بات مانی رہ گئی ہے۔"

ناجی کی لمبی لمبی پلکیں حسین آنکھوں پر جھک کر تھرکنے لگیں۔

"ماں جی سے مل کر ہی تمہارا ہاتھ طلب کر سکتا ہوں نا۔"

ناجی شرمائی کی کھڑی تھی، حسن کا یہ محجوب انداز کتنا پیارا تھا۔ طاہر دل تھام کر رہ گئے۔

"آؤ نا۔"

"میں نہیں جاتی۔"

"کیوں؟"

"تم اکیلے جاؤ۔" ناجی اپنا چہرہ چھپا کر بھاگ گئی۔

"میرے واپس آنے تک یہیں رہنا۔" طاہر نے آواز دی۔

ناجی شوخی سے مسکراتی ان سے دور بھاگتی گئی۔

طاہر چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر وہ اوپر چڑھنے لگے۔

وہ سیدھے ناجی کے گھر گئے۔ ماں مٹی کے چولھے کے پاس بیٹھی ہنڈیا پکا رہی تھی۔ اس نے طاہر کو دیکھا۔

بوکھلائی۔

گھبرائی۔

اور جلدی جلدی پانڈری میں چمچ ہلانے لگی۔

طاہر خفتہ آلود تبسم ہونٹوں پر لئے ادب سے سلام کرتے ہوئے بلا جھجک کمرے میں چلے گئے۔

ماں کو یہ جانتے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ یہی وہ نواب زادہ ہے جس کے لئے اس کی بادلی بیٹی جان کی بازی لگا بیٹھی ہے۔

طاہر کے بے پناہ مردانہ حسن، وقار آمیز جلال اور شائستہ انداز تخاطب سے وہ بڑی مرعوب ہوئی۔

کتنا موزوں جوڑ تھا۔ اس کے دل کے کسی گوشے سے صدا بلند ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے طبقاتی صدبندیوں کا احساس ہوا۔ اسکے دل کے گوشے سے اٹھنے والی صدا مدھم پڑ گئی۔

طاہر کمرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔

ماں اٹھ کر اندر آئی۔ سرتاپا انھیں دیکھا۔ لیکن منھ سے کچھ نہ بولی۔

"آپ کے لئے میں اجنبی نہیں ہوں ——" طاہر نظریں جھکا کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "میرا نام طاہر ہے —— میں نواب فاروق علی خاں کا لڑکا ہوں ——"

ماں نے نگاہ اٹھا کر پھر انھیں گہری نظروں سے دیکھا۔

"میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں —— کہ ——"

طاہر ہچکچا گئے۔ سمجھ میں نہ آئی تھی کہ اپنے آنے کا مدعا کیونکر بیان کریں۔

"رات آپ کے والد صاحب بھی تو آئے تھے ——" ماں طاہر کی ہچکچاہٹ سے ان کا مدعا سمجھتے ہوئے بولی۔

طاہر نے ماں کے لہجہ کی سنجیدگی صحیح طرح محسوس کی۔

"آپ کو ہمارے حالات معلوم ہو چکے ہیں۔" طاہر جلدی سے بولے۔

"بڑی اچھی طرح سے۔" ماں چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ طاہر نے بھی اس نے بیٹھنے کو کہا، لیکن طاہر بیٹھے نہیں، وہ نادم سے کھڑے ہوئے تھے

"مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے بیجا زور سے آپ کو مرعوب کر کے اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی۔"

"انھوں نے کوئی انہونی بات نہیں کی۔" ماں کچھ سنجیدہ آواز میں بولی۔ "بھٹکی ہوئی اولاد کو راہ راست پر لانے کیلئے والدین کو ہر جبر کرنا پڑتا ہے۔ ہوش مند اور جوان اولاد اپنے راستے کا تعین خود کر سکتی ہے، والدین کی سمجھ کا پھیر ہی ہے کہ جو سیدھے راستے کو الٹا سمجھیں۔"

ماں نے ایک بار پھر گہری نظروں سے طاہر کو دیکھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں اب ۔۔۔؟"

"وہی جس کی مخالفت میرا پورا خاندان کر رہا ہے۔"

"اس کے باوجود آپ یہاں آ گئے۔"

"میں اپنے راستے کا تعین کر چکا ہوں ماں جی ۔۔۔ اس راہ سے مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہ ہٹا سکے گی۔"

طاہر کی آواز میں صداقت و استحکام اتنا نمایاں تھا کہ ماں چند لمحوں کے لئے سکتے میں آ گئی۔

"جوانی اندھی ہوتی ہے صاحبزادے ۔۔۔ اپنی حیثیت نہ بھولئے آپ اتنے بڑے نواب۔۔۔"

"میں ایک معمولی آدمی ہوں ماں جی ۔۔۔" طاہر ماں کے گھٹنے پر جھک گئے "میں نے ناجی کیلئے سب کچھ چھوڑ دیا ہے ۔۔۔ والدین ۔۔۔ گھر بار جاہ و حشم ۔۔۔ سب کچھ چھوڑ دیا ہے ۔۔۔ میری خدمت کو دیکھ کر والد صاحب نے مجھے حق وراثت سے محروم کر دیا ہے، لیکن مجھے کچھ پرواہ نہیں، میرے بازوؤں میں اتنی طاقت ہے کہ میں اپنا اور ناجی کی زندگی کا بار آبرو مندانہ طریق سے سہار سکوں۔"

طاہر چارپائی کے قریب گھٹنا ٹیکے ماں کے زانو پر ہاتھ رکھے اسے اک خوشگوار مستقبل کا یقین دلا رہے تھے۔ اور ۔۔۔ ماں ۔۔۔ پوری آنکھیں کھولے طاہر کو دیکھے جا رہی تھی۔ طاہر کے انکشاف سے اسکا سارا جسم لرز گیا تھا۔ طاہر کی محبت ان حدود کو چھو لے گی ایسا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو اس پیارے سے ایک امیر زادے کے عیش پسند ذہن کی تفریح کا ذریعہ سمجھے ہوئے تھی۔

طاہر نے ساری روداد ماں سے گوش گزار کی، ماں بت بنی انکی باتیں سنتی رہی۔

"ماں جی" طاہر نے بے حس و حرکت بیٹھی ماں کے گھٹنوں کو ہلایا۔ مجھے مایوس نہ کیجئے۔ آپ کا انکار مجھے زندگی اپنے ہی ہاتھوں ختم کرنے پر مجبور کر دے گا۔ ناجی میری زندگی ہے! اس کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

طاہر کی آواز فرط جذبات سے رندھ گئی، بے بس ہو کر انھوں نے اپنا سر ماں کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

ماں کے لئے یہ لمحات انتہائی کٹھن تھے، طاہر نے جس اپنائیت اور خلوص سے اپنا سر ماں کے گھٹنے پر رکھا تھا، مردت کا تقاضا تھا کہ ماں اپنی محبت شفقت انکے سر پر بکھیرتے ہوئے انھیں زندگی کی سب سے بڑی مسرت کا یقین دلاتے لیکن حالات کی تلخی کو وہ کیونکر نظر انداز کر دیتی، جذباتی رو میں بہہ کر کئے ہوئے فیصلے ہمیشہ پشیمانی کا باعث بنتے ہیں"

"صاحبزادے ــــ جلد بازی کا نتیجہ پشیمانی ہوتا ہے"

"ماں جی!" طاہر نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے ابھی سوچ سمجھ سے کام لیا جائے۔ ماں انکی نظروں سے نظریں چار نہ کر سکی۔

"والدین اتنے کٹھور کیوں ہو جاتے ہیں؟" طاہر جھلا سے گئے "اولاد کی چھوٹی سی چھوٹی خوشی کو روندنے میں دریغ نہیں کرتے"

وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔

ماں بیچارگی سے ہاتھ ملتے ہوئے آنسو پی جانے کی کوشش کر رہی تھی"

"ہم بہت غریب ہیں بیٹا ــــ" بالآخر وہ کہہ اٹھی "ناجی کسی لحاظ سے بھی اس قابل نہیں ــــ کہ ــــ"

"ماں جی ــــ ایسا کہہ کر آپ میرے جذبات کو مجروح نہ کیجئے"

ماں اور طاہر میں کافی دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ ماں مرعوب تو ہو گئی
لیکن اس اعتراف میں ہچکچاہٹ تھی۔ اپنی کم مائگی کا احساس جو تھا۔ طاہر نے
امکان بھر سعی کی منت کی ۔۔۔ خوشامد کی ۔۔۔ اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا
اپنی وفا کے استحکام کی قسم کھائی۔ ماں سوچ میں پڑ گئی۔ طاہر اسکے ہونٹوں سے
اسی وقت مژدۂ جانفزا سننا چاہتے تھے، جس طرح بن پڑا انھوں نے نانی کی
ماں کو مجبور کیا۔

اور

ماں مجبور ہو گئی۔

لیکن

ایک دم ہاں نہ کہہ سکی ۔۔۔ "مجھے کچھ سوچنے کا موقعہ تو دو بیٹے"
طاہر نے ماں کی طرف دیکھا، وہ اپنے ہونٹوں پر پھیلے تبسم کو چھپانے کی کوشش
کر رہی تھی۔ اس کے لہجہ میں کتنی اپنائیت تھی۔ اس کے روئیے میں لچک بھی
کافی آ گئی تھی۔

"ماں جی" طاہر خوشی سے جھوم اٹھے۔ خوب سوچ لیں لیکن آخر میری بات
آپ کو ماننا ہی پڑے گی۔"

ماں خفا کے باوجود مسکرا رہی تھی۔

طاہر مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے، کسی انجانی سی لذت کا احساس انکے
روں پر چھایا جا رہا تھا۔

ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے وہ گھاٹی کی طرف جا رہے تھے، جہاں انکی بہاں کتنا
ہمہ انتظار بیٹھی تھی

ماں کئی دن ٹال مٹول کرتی رہی۔

اور

یہ کئی دن طاہر کے حق میں سود مند ثابت ہوئے، وہ ماں کے بہت قریب آ گئے اور ان کی فطری ضد اپنا مطالبہ منوانے کے کام آ گئی۔

ماں نے ان کا دامن مراد امید کے پھولوں سے بھر دیا۔

"نانا جی تمھاری ہے بیٹا۔" ماں نے اپنی زندگی بھر کی متاع انکے حوالے کر دی۔

"ماں!" فرط جذبات سے طاہر کی آواز گھٹ گئی۔ انکی آنکھوں میں اک لافانی چمک ابھری۔ اور عقیدت سے انھوں نے اپنا سر جھکا دیا۔

ماں نے شفقت و محبت سے ان کے جھکے ہوئے سر کو بوسہ دیکر انھیں اپنی فرزندی میں قبول کرنے کے وعدے پر مہر لگا دی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"نانا جی میرے اجڑے سہاگ کی نشانی ہے بیٹا — میں نے اسے اپنی جوانی کا خون دے کر سینچا ہے۔ اللہ کے بعد تمھیں سونپ رہی ہوں۔ نانا جی کے پاس کچھ بھی نہیں، نہ دولت ہے نہ تعلیم نہ نخچہ ذہن — اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک کر گالوں پر پھسل گئے، ڈوپٹے کے آنچل سے آنکھیں پونچھ کر اس نے ایک گہری سانس لی۔

طاہر عقیدت سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اپنی بے پناہ خوشیوں کو

دل کی گہرائیوں میں سمونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ماں کی باتوں کا کچھ جواب نہ دیا۔

"اک رنگین کھلونا ہے، جسے تم نے دل بہلانے کو چُن لیا۔ اسے سنبھال کر رکھنا جی بھر جائے تو توڑ پھوڑ نہ دینا۔"

"ماں جی" طاہر ان جملوں کی تاب نہ لا کر بے تاب ہو گئے۔ "ناجی میری زندگی ہے ماں!"

"میں ماں ہوں بیٹا — یہ باتیں کہنا تو نہیں چاہیئے، لیکن دل بھول جاتا ہے — تم نے ناجی کی خاطر گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔"

"اس کے سوا کیا کر سکتا تھا۔"

"کسی وقت ناجی کو بھی چھوڑ —"

"ماں!" طاہر چیخ اٹھے — "وہ وقت میری زندگی میں نہیں آئے گا۔ ماں۔ ناجی سے مجھے موت ہی جدا کر سکے گی، اور دنیا کی کوئی بھی طاقت نہیں کر سکتی۔"

ماں کا دل سنبھل گیا۔ وہ مسکرانے لگی۔

آئندہ ایسی باتیں نہ کرنے کا وعدہ کیجئے ماں۔" آپ میری خوشیوں کے گلے پر چھری رکھ دیتی ہیں ایسا کبھی کرے —"

"اچھا بیٹا!" خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔"

"میں آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں!"

"اللہ تمہیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں رکھے۔"

طاہر خوش ہو گئے۔ اور اب طاہر بہت جلد شادی کر کے اس معاملے کو نپٹانا چاہتے تھے۔ ماں سے بات کی، وہ خود بھی جلد اس فرض سے سبکدوش

ہونا چاہتی تھی۔ اسے گاؤں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں، جتنے منھ اتنی باتیں۔ کوئی ناجی کی تقدیر پر رشک کر رہا تھا، اور کوئی اسے ماں بیٹی کی حماقت سے تعبیر کر رہا تھا۔

"میں خود بھی جلدی چاہتی ہوں، لوگوں کے منھ تو بند ہو جائیں گے!" گاؤں والوں کے لئے یہ انہونی سی بات ہے۔ چاہتی ہوں جتنی جلد ہو سکے معاملہ نپٹ جائے۔"

"میں خود بھی دیر کا حامی نہیں۔ صرف چند دن چاہئیں۔ مجھے جگر مل گئی ہے اسے ٹھیک ٹھاک کر دالوں۔"

طاہر نے شہر کے اک پرسکون اور پر بہار حصے میں چھوٹی سی کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی، الحمراء جیسی آراستگی تو میسر نہ آ سکی، ہاں رہنے کیلئے انھوں نے اسے اچھا خاصا سنوار لیا۔

ناجی کے لئے اک ایسی عورت کا بندوبست بھی کیا جو اسکی دیکھ بھال کے علاوہ اسے تہذیب جدید سے شناسا بھی کر دے، خود ساختہ ماحول کے بے ضابطہ اصولوں سے روشناس بھی کرا سکے، ادھیڑ عمر عورت کافی سیانی تھی۔ اس نے طاہر کو یقین دلایا کہ چند دنوں میں وہ ناجی کو تہذیب و شائستگی کا مجسمہ بنا دے گی آصف کی بیوی کی مدد سے انھوں نے ناجی کے لئے خوبصورت ترین ملبوسات بنوائے۔ نفیس زیور خریدے۔ آرائش کی چیزیں لیں اور پھر تقریباً دس دن وہ اپنے چند دوستوں سمیت ناجی کے ہاں جا پہنچے۔ نکاح کی تقریب خاموشی اور سادگی سے انجام پائی۔

ناجی دلہن بنی۔ گورے گورے ہاتھوں میں مہندی رچی، مانگ میں سیندور بھرا، ادھ کھلی آنکھوں میں کاجل کی دو دھاریاں کھینچی گئیں، خوشبوؤں سے

دبس کا مجسمہ کی طرح تراشا ہوا جسم مہک اٹھا۔

سرخ جھلملاتے جوڑے نے ناجی کے حسن کو چار چاند لگا دیئے، اس کا کافر شباب پھوٹ پھوٹ گیا۔ طلائی زیورات اس نے زندگی میں پہلی بار پہنے تھے، ناجی کا معصوم حسن اس حسن و زیبائش سے دمک اٹھا۔

ماں کی دعاؤں کے زیر سایہ۔ سہیلیوں کے دعائی گیتوں اور رخصتی آنسوؤں کی چھاؤں میں ناجی کومل ہتنی کی طرح شرم سے دوہری ہوئی طاہر کے ساتھ اس کے نئے گھر میں آ گئی۔

طاہر، ناجی ایک دوسرے کی محبت میں سرشار زندگی کی شاہراہ پر گامزن تھے۔ ان کے بسے ہوئے شب و روز معصوم محبت کے استحکام کے ضامن تھے۔

جوں توں دن گزر رہے تھے، ان کی محبت کے والہانہ پن میں شدت آ رہی تھی، ناجی اگر پہلے پھول تھی تو اب بھرپور بہار تھی، کتنا نکھر گیا تھا اس کا حسن کتنا جاذبیت سمو گئی تھی اس کی کافر جوانی میں۔ طاہر اسے پا کر اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتے تھے، اپنی تقدیر پہ خود ہی رشک آ جاتا تھا۔

کتنے سرور تھے دونوں ـــــ خوشیاں ہی خوشیاں بکھری تھیں ہر سو۔

اور

اس دن یہ خوشیاں دوچند ہو گئیں۔ جس دن انھیں احساس ہوا کہ ان کے چمنستان محبت میں اک گل کھلنے والا ہے۔

دن مہینوں میں بدلتے گئے۔ طاہر کو گھر چھوڑے تقریباً دس ماہ ہو گئے

محبوب بیٹے کی جدائی کا غم باپ کی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا
خود ساختہ پابندیاں طاہر کا کچھ نہ بگاڑ سکیں، ہاں فاروق کا سینہ چھلنی مزید کر گئیں۔
دل کا روگ بیماری کی صورت میں پھوٹ پڑا۔ پہلے تو تکلیف معمولی سمجھی گئی، لیکن
جلد ہی بیماری نے تشویشناک قسم کا موڑ لیا۔ اور جینے کے اندر اندر نواب فاروق
کی جان کے لالے پڑ گئے۔ چوٹی کے ڈاکٹر بیماری کے بھوت سے نبرد آزما تھے۔ لیکن
"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ تھا۔ دوائیں بیکار تھیں دعائیں
کارگر نہ ہوتی تھیں، ہر لمحہ حیات کا ناطہ موت سے جوڑ رہا تھا۔

الحمراء کی ساری رونقیں معدوم ہو گئی تھیں، طاہر کی شادی سے گھر کی فضا پہ
سکرسا چھا گیا تھا، اب تو ہر دل سہما ہوا تھا۔ ہر آنے والا لمحہ کسی نا خوشگوار
واقع کے ظہور پذیر ہونے کا ضامن ہو سکتا تھا۔

شیرازۂ حیات آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا۔ فاروق کی حالت دن بدن نازک
ہوتی جا رہی تھی۔ اکثر ان پر غشی طاری رہتی اور۔ عالم بیہوشی میں ان کے کانپتے
لبوں پر ایک ہی نام تھرکتا "طاہر"

لیکن ہوش میں انھوں نے کبھی طاہر کا نام نہیں لیا تھا۔ اہل نظر دیکھ رہے
تھے کہ حیات کی ڈوریاں آہستہ آہستہ منقطع ہو رہی ہیں۔ تجربہ بتا رہا تھا کہ بجھتے چراغ
کی آخری لو تھرک رہی ہے وضعداری کا دامن آخر تک فاروق تھامے رہے تھے
لیکن دل محبوب بیٹے سے ملنے کے لئے پگھل پگھل کر ختم ہوا جا رہا تھا

خاندان کے چیدہ اور جہاندیدہ بزرگوں نے مشورہ دیا طاہر کو اس حالت
میں بلانا انتہائی ضرر رساں ہے، کون جانے کب تنفس کے تار ٹوٹ جائیں، اور
فاروق کی روح اک مستقل خلش لے کر کب تک بھٹکتی رہے۔

سیفو طاہر کو واپس لانے میں پیش پیش تھا، باپ کے دل میں اٹھتے طرفانوں

کو اس نے بارہا دیکھا تھا، محبت کی تڑپ سے باپ کو اکثر تڑپتے بھی دیکھا تھا۔
تجویز حسن بانو کے سامنے پیش کی گئی۔ وہ اپنی آن کے خاطر بیٹے کو منھ لگانے کے لئے تیار نہ تھیں۔

"یہ وقت رنجشوں کو بھلا دینے کا ہے حسن بانو" آخر انکے بڑے بھائی رہ سکے۔

"اب اسے بلانے کا فائدہ"

"بھائی فاروق کی حالت سے کچھ تو اندازہ کرو"

"یہ حالت اسکی وجہ سے ہوئی ہے ـــــ اس حالت میں اس خودسر لڑکے کو کیونکر بخشوا دوں"

"فاروق بھائی عالم بیہوشی میں طاہر کو پکارتے ہیں، کتنی دردناک ہوتی ہے ان کی پکار"

"ان کا دل طاہر میاں سے ملنے کو تڑپ رہا ہے بیگم صاحبہ"

سیفو ہاتھ ملتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولا۔

"ان کی خواہش پوری ہونی چاہیئے ـــــ مبادا ـــــ" کوئی اور بزرگ بولے۔

سب نے حسن بانو کو مجبور کیا۔ حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے طاہر کو بلانے کی حامی بھر لی۔

"سیفو تم ہی جاؤ ـــــ اور طاہر کو لے آؤ"

"ہاں سیفو ـــــ صرف طاہر کو ـــــ وہ ڈائن ساتھ نہیں آئے گی، سمجھے ـــــ" بیگم صاحبہ نے ایک قید لگا دی۔

"بیگم صاحبہ!"

"کسی سفارش کی ضرورت نہیں، آنا ہے تو طاہر اکیلے آئیں۔ ورنہ نہ آئیں
اس چڑیل کا وجود اس گھر میں برداشت نہ کر سکوں گی۔"

سیفو چپ ہو گیا۔

طاہر کو باپ کی بیماری کی خبریں آصف اور دوسرے لوگوں سے مل رہی تھیں،
جوں جوں بیماری تشویشناک ہوتی جا رہی تھی، طاہر کی بیقراریوں میں اضافہ ہوتا
جا رہا تھا، وہ اپنے ابا کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھا، لیکن وہاں جانے کی جرأت نہ
کر سکتے تھے۔ آصف سے انھیں اپنے گھر والوں کے خیالات کا پتہ چلتا رہتا تھا۔ انکی
حالت اس پرندے کی سی تھی جس سے قوت پرواز چھین لی گئی ہو۔

صرف خود جانا ہوتا تو بات اور تھی، وہ ساتھ ناجی کو بھی لے جانا چاہتے تھے۔
لیکن اس بارے میں آصف نے مطلع کر دیا تھا کہ اگر اس لڑکی کے قدم الحمراء کی
زمین سے چھوئے تو قیامت صغریٰ بپا ہو جائے گی اس کا وجود تو کیا، وہ لوگ
اس کا نام سننا بھی گوارہ نہیں کر سکتے تھے۔

شام وہ آصف کے یہاں سے آئے تو بڑے پژمردہ تھے ایک تو ابا کی بیماری
خطرناک موڑ پر تھی، دوسرا ناجی کے متعلق گھر والوں نے آصف کے سامنے بڑا زہر
اگلا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

آخر طاہر نے سوچ بچار کے بعد فیصلہ کر لیا کہ وہ اگر الحمراء گئے تو ناجی کو
ساتھ لے کر جائیں گے شاید موقعہ کی نزاکت والدین کی ہٹ کو پگھلا دے اور
ناجی کو اس کا اصلی مقام مل جائے۔

اور۔

اسی شام سیفو انہیں لینے آ گیا، نواب صاحب کی بیماری کی داستان سنانے کے
بعد بھی انداز میں بولا "بیٹے یہ وقت کسی ہٹ یا ضد کا نہیں ـــ نواب صاحب

کی آنکھیں شاید آپ کو دیکھنے ہی کے لئے کھلی ہیں ـــ اللہ جانے کیا ہونے والا ہے ـــ"

طاہر پہلے ہی پریشان تھے۔ سیفو کی آمد حالات کی سنگینی کا کھلا ثبوت تھی۔ طاہر کا دل تڑپ اٹھا، باپ کے حضور میں پہونچ کر دھانی گستاخی کی معافی زور زور کر مانگنا چاہتے تھے۔

"جلدی کرو بیٹے!"

"ٹھہریئے! میں ناجی کو تیار ہونے کے لئے کہہ دوں ـــ" طاہر اٹھے۔

"لیکن ـــ اس ـــ وقت اگر ـــ"

"کیا ہے سیفو بابا!"

"اگر آپ جلدی سے اکیلے ہی چلے جائیں تو اچھا ہوگا۔"

"ناجی میرے ساتھ ضرور جائے گی" فیصلہ کن انداز سے سیفو مرعوب ہو گیا!

طاہر اندر آئے، ناجی پلنگ پر بیٹھی تھی۔

طاہر نے اسے حالات سے مطلع کیا۔

محل والوں سے خوفزدہ ہونے کے باوجود وہ طاہر کے ساتھ جانے پر آمادہ نظر آئی۔ دل میں اب بھی یہی وسوسہ دھڑکا بنا ہوا تھا کہ کہیں طاہر وہیں نہ رک جائیں وہ تو طاہر کے جنم جنم کا ساتھی تھی، پھر بھلا ان کے بغیر رہنے کا سوال کہاں۔

طاہر ناجی کو لئے باہر آگئے۔ سیفو کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ناجی سفید لباس میں کوئی آفاقی مخلوق دکھائی دے رہی تھی، کتنی عقیدت تھی، سیفو کے دل میں ـــ کاش بڑی بیگم اپنے رویے میں تبدیلی کر لیتیں۔ وہ سوچتے ہوئے کالی موٹر کی طرف بڑھا۔ پٹ کھول کر مودبانہ ایک طرف ہٹ گیا۔

ناجی اور طاہر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے ـــ سیفو نے سیٹ سنبھال کر گاڑی کا

رخ الحمراء کی طرف پھیر دیا۔

محل اور محل کی زندگی کا تصور بھی ناجی کے فہم و ادراک سے بعید تھا۔ شہر کے پر بہار گوشے میں اس کی اپنی اقامت گاہ پر تعیش لوازمات سے پُر تھی۔ لیکن الحمراء سے تو اسے کسی طرح مناسبت نہ تھی، ناجی محل میں داخل ہوئی تو اس کے ہوش و حواس اڑے جا رہے تھے، اس محل کا جاہ و جلال دیکھ کر بوکھلا گئی تھی۔

اور

کچھ اہل خانہ کا خیال معصوم دل و دماغ پر خوف بن کر چھایا ہوا تھا! یہاں آنے کی اسے کوئی لگن نہ تھی۔ سہمی سہمی تو فرزہ سی طاہر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی طاہر اس وقت اپنے آپ سے بہت دور جا چکے تھے، ان کے جذبات میں تلاطم تھا، تقریباً دس ماہ بعد وہ اپنے گہوارۂ عشرت میں داخل ہو رہے تھے ناسلوہ حالات نے کتنی تلخیاں بکھیر دی تھیں۔ اس گھر میں داخل ہونے کے بعد انھیں شدید احساس ہو رہا تھا۔

الحمراء میں داخل ہوتے ہی منجمد دل میں حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ والدین بھائی بہنوں اور عزیز و اقارب کی محبت اس حرارت سے پگھلنے لگی تھی۔

بمشکل دل کو سنبھالے، ہونٹوں کی دانتوں کاٹتے، آنکھوں میں بار بار چھلکنے والی نمی کو روکتے وہ اپنے ابا کی خواب گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ناجی کے فکر زدہ پھیکے ہوئے چہرے کو انھوں نے نہیں دیکھا

خواب گاہ کے بیرونی خوبصورت دروازے میں روشنیوں کا سیلاب امڈا ہوا تھا

رات میں کسی روز روشن کا گمان ہوتا تھا، دیوار گیر قمقمے روشنی اگل رہے تھے، ارغوانی قالین چمک رہے تھے، اور محرابی دروں میں گھاس کی جھکتی ہوئی ٹوکریاں لٹک رہی تھیں، ناجی حیرت زدہ سی اس رنگ و نور کے سیلابوں میں غوطہ زن تھی، طاہر سر جھکائے قدم اٹھا رہے تھے، ان کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا باپ کو زندگی کے مرغزاروں میں اکیلا چھوڑ گئے تھے، لیکن!

آج۔

آج وہ محبوب ہستی موت کی دہلیز پر کھڑی انکی راہ دیکھ رہی تھی، سارے تفرقے، ساری رنجشیں بھول کر طاہر ان کی متوقع جدائی کے جانگسل خیال سے سہمے جا رہے تھے، دل و دماغ پاش پاش ہوئے جا رہے تھے۔

برآمدے کے زینے پر قدم رکھتے ہی ان کی نظریں خواب گاہ کے دروازہ پر پڑیں۔

پردہ ہٹا۔ اور۔

اتفاقاً محسن باتو باہر نکل آئیں۔

ماں نے بیٹے اور

بیٹے نے ماں کو دیکھا۔

ماں تڑپی، طاہر کے پیتے میں جیسے ایک دم سیکڑوں تیر پیوست ہو گئے درد کی شدت سے تڑپ اٹھے، بیقراری سے آگے بڑھے۔

اور

"امی حضور" کہہ کر ماں سے لپٹ گئے۔

ضبط و صبر کے بند ٹوٹ گئے، من کا موتی ہی کچھ ایسا در دانگیز تھا کوئی بھی تو اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا، ماں رو رہی تھیں، اور طاہر انکے سینے سے لگے۔

معصوم بچوں کی طرح ہچکیاں بھر رہے تھے۔

ناجی یہ رقت انگیز منظر دیکھ کر اور سہم گئی۔ اس کی خوبصورت خواب آلود آنکھیں بے تابو ہو کر برس رہی تھیں۔

پیچھے کھڑا سیفو بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔

رونے کی آواز سنتے ہی خوابگاہ کے دروازے سے آگے پیچھے حواس باختہ سی کئی صورتیں نکل آئیں۔

انجم — حسن آراء — سعدیہ — فخر — اظہر اور کئی دیگر رشتہ دار باہر آ گئے۔

بہنیں طاہر کو دیکھتے ہی ان سے لپٹ گئیں۔ جدائی کا صدمہ انھوں نے بھی تو جھیلا تھا۔

ملن کی گھڑیوں کو آنسوؤں کا خراج ملنے لگا۔

چند ساعتوں میں تقریباً سارا خاندان برآمدے میں جمع ہو گیا، طاہر سر جھکائے کھڑے تھے۔ بار بار اپنی بھیگی آنکھوں کو پونچھ رہے تھے۔ عورتوں اور مردوں نے انھیں یوں گھیرے میں لے لیا تھا، جیسے بڑی تگ و دو کے بعد کسی مفرور کو نرغے میں لے لیا گیا ہو۔

ناجی مرمریں ستونوں کا سہارا لئے کھڑی تھی، اسکے اور طاہر کے درمیان کئی افراد آ گئے تھے، ناجی کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، یوں بھی کئی خشمگیں نگاہیں اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اپنے چاروں طرف اس نے ہمیشہ نرم و ملائم نظریں پائی تھیں، ان سینہ چیرنے والی نگاہوں سے وہ کانپ گئی۔

برآمدے میں اچھا خاصہ شور ہو رہا تھا، جتنے منھ اتنی باتیں۔ یہ شور مریض کے لئے ضرر رساں تھا۔

وقار احمد جلدی سے باہر آئے اور سب کو خاموشی سے کسی دوسرے طرف چلے جانے کی تلقین کی۔

قدم اٹھنے لگے۔

طاہر کھڑے رہے۔

"چلو بیٹے!" کسی نے طاہر کا کندھا پکڑ کر کہا۔

"میں ابا حضور کو دیکھوں گا ——" وہ گلوگیر آواز میں بولے۔

"تم اکیلے آجاؤ طاہر میاں" وقار احمد نے انھیں بلایا۔ "آپ لوگ سب یہاں سے چلے جائیں —— بہت شور ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہلکا سا شور بھی کتنا مضر ہے ان کے لئے"

وقار احمد نے طاہر کا ہاتھ پکڑا۔ وہ طاہر کے برشتہ کے ماموں تھے۔

"طاہر بیٹا کسی کمزوری کا مظاہرہ نہ کرنا —— حوصلہ رکھنا فاروق بھائی کی طاقت ——" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

طاہر خواب گاہ میں داخل ہوئے، باپ کی مسہری کی طرف نگاہ گئی اف —— وہ سرتاپا کانپ گئے۔ نواب فاروق کی جگمگاتی کا بے رنگ و نور ڈھانچہ پڑا تھا۔ آنکھیں البتہ اب تک روشن تھیں، جیسے شمع انتظار جل رہی ہو" اس وقت ہوش میں تھے۔

طاہر بیتاب ہو گئے۔

وقار نے مضبوطی سے ان کا بازو تھام لیا۔ طاہر انکے بازو کی گرفت میں طائر مجروح کی طرح پھڑپھڑائے۔

"صبر —— حوصلہ —— جذباتی کمزوری کا مظاہرہ ان کے لئے مضر ہوگا" وقار احمد نے سرگوشی کی۔

لیکن

ایسی صورت حال بھلا ان مشوروں کی تابع کیسے ہو سکتی تھی۔ طاہر ناں سے بتر کی طرح نکلے۔ فاروق نے بھی انھیں دیکھا۔

"ابا حضور!۔۔۔" بیٹی کے قریب قالین پر دوزانو ہوتے ہوئے انھوں نے اپنا سر باپ کے کندھے پر رکھ دیا۔

پھر

آنسوؤں کا ایسا طوفان پھوٹا جیسے روکے نہ رکے۔ لفظ کسی کے بس میں نہ تھا

"طا۔۔۔ ہر۔۔۔ طا۔۔۔ ہر" خشک سسکتے لبوں پر یہ نام کئی دفعہ تھرک تھرک گیا۔

"ابا حضور۔۔۔" طاہر نے ان کی طرف دیکھا۔ "میرے ابا" بے قرار ہو کر انھوں نے اپنا سر باپ کی چھاتی پر ٹکا دیا۔

"طاہر۔۔۔ میرے۔۔۔ بچے۔۔۔ نحیف، دنا توان سی آواز ابھری۔۔۔ "تم۔۔۔ یہ۔۔۔ تم۔۔۔ ہی۔۔۔ ہو نا۔۔۔ تم۔۔۔ آ گئے۔۔۔؟"

"مجھے معاف کر دیجئے ابا۔۔۔ حضور۔۔۔ اپنے گناہ گار بیٹے کو معاف کر دیجئے۔۔۔ طاہر سسک رہے تھے۔

فاروق کا زرد اور کانپتا ہوا ہاتھ اٹھا۔۔۔ اور انھوں نے طاہر کو پوری قوت سے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

"ابا۔۔۔ حضور۔۔۔"

"میں نے۔۔۔ تمھیں معاف کیا میرے بچے۔۔۔ دعا کرو خدا مجھے بھی۔۔۔ معاف۔۔۔ کر دے۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم نے تمھیں ناحق۔۔۔ سزا دی۔۔۔ تھی ناحق۔۔۔"

طاہر پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، وقار احمد کی آنکھیں پرنم تھیں۔

اور

نواب فاروق شاید اس اچانک خوشی کا بار نہ سہار سکے۔ انکی سانس غیر ہموار ہو گئی، اور ہڈیوں کے اس کھڑکھڑاتے ڈھانچے پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی وقار احمد جلدی سے ان پر جھک گئے گھنٹی بجائی۔ ساتھ والے کمرے سے ڈاکٹر لپک کر آئے سب مہری کے گرد جمع ہو کر اکلات کی مدد سے مریض کے سینے کا زیر و بم اور خون کا دباؤ دیکھنے لگے۔

طاہر کے خوابگاہ میں جاتے ہی نانی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ زندگی کے لق و دق صحرا میں اکیلی رہ گئی ہو۔ اسکے اور طاہر کے درمیان طوفان گرد و باد اٹھ رہے ہوں، اور وہ کسی حقیر تنکے کی طرح بیرحم ہواؤں کے تھپیڑوں سے ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی ہو۔

خاندان کے بے شمار افراد طاہر کے جانے کے بعد اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، کبھی اور قہر برساتی نظریں اسے گھور رہی تھیں اسکے بے پناہ ملکوتی حسن سے ہر دل بھی نفرت و حقارت کے اظہار کے لئے چبھتی ہوئی نظروں کے تیر برسا رہے تھے۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے غیر مانوس چہرے دیکھ رہی تھی، سکا رنگ سفید لباس رہی کی طرح تھا بھینگے ہونٹوں کی مضطرب سلوٹیں کانپ رہی تھیں دل بیٹھا جا رہا تھا۔ سینوں سے لخت لخت سگ سرخ کا جالی دار کٹہرا نہ ہوتا تو یقیناً اب تک وہ

گر چکی ہوتی۔

"سیفو" اچانک بھیگے رہ رہ باراں کی کڑک سنائی دی، بڑی بیگم صاحبہ کسی خونخوار شیر کی طرح غراتی ہوئی اس کی جانب بڑھیں۔

"جی حضور!" سیفو جلدی سے نانی کے سامنے آگیا۔

"یہ غالباً طاہر کی بیوی ہے" خشمگیں نگاہوں سے انھوں نے نانی کو سر تا پا گھورا۔

"جی ــــ جی حضور ــــ" سیفو ان کے تیوروں سے سہم کر بولا۔

"یہ کیوں آئی ہے۔؟"

سیفو کے جواب دینے سے پہلے عقبی دروازے سے ڈاکٹر وحید نکل آئے "برائے مہربانی آپ سب لوگ کسی دوسری طرف چلے جائیے۔ شور ہو رہا ہے ــــ مریض کے لئے خطرناک ہے۔ نواب صاحب کو آرام کی ضرورت ہے"۔

واقعی بہت شور ہو رہا ہے ــــ ادھر چلئے ــــ یہاں تو اونچی آواز میں بولنا درکنار، پاؤں کی آہٹ بھی ممنوع ہے ــــ ہجوم میں سے کسی نے کہا۔

"چلئے ــــ ادھر کو چلئے ــــ" کئی آوازیں آئیں۔

انجم آرا نے بڑھ کر ماں کو کمر سے سہارا دیا ــــ "امی جان ابا حضور کی حالت آپ دیکھ چکی ہیں ــــ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلئے ــــ آپ سب بھی یہاں سے ادھر ہی جائیے ــــ اتنا ہنگامہ ــــ توبہ ــــ!"

حسن بانو نے بھوکی شیرنی کی طرح نانی کو دیکھا اور پھر غصے میں پیچ و تاب کھاتی پلٹیں ــــ زینہ بہ زینہ اتر رہی تھیں، انکے قدم اٹھاتے ہی مجمع منتشر ہو گیا بہت سے لوگ ان کے پیچھے پیچھے دبے قدم اٹھاتے وہاں سے چل دیئے؟

چند لمحوں بعد ناجی کے پاس صرف سیفو اور انجم آرا کھڑی تھیں: طاہر جو کچھ کر چکے تھے، سزا اور صرف ناجی تو نہ تھی، انجم آرا مومن دل رکھتی تھیں، ناجی کی پیاری پیاری صورت اور بھولا بھالا انداز دل کی ساری کدورتیں ختم کر دینے کو کافی تھا، گھر والوں کے رویے سے انھیں سخت کوفت ہوئی تھی اور پھر ناجی کی حالت دیکھ کر تو ان کا دل جذبۂ ترحم سے معمور ہو گیا۔

وہ آگے بڑھیں اور کمال شفقت سے ناجی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر مسکرائیں۔ ناجی کے لئے یہ التفات غیر متوقع تھا، کیا نام ہے تمھارا؟" انجم نے پیار سے پوچھا۔ "بتاؤ نا بیٹی اپنا نام۔" سیفو انجم آرا کے رویہ سے بے حد خوش ہوا۔ "آپ طاہر میاں کی بڑی بہن ہیں۔"

"تمھاری بڑی بہن ہوں۔ تم میری پیاری سی بھابی ہو۔" انجم نے جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"بتاؤ نا اپنا نام!" انجم نے اپنے سے جدا کرتے ہوئے پھر پوچھا۔

ناجی جیسے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ ٹکر ٹکر انجم کو دیکھنے کے سوا وہ منھ سے ایک لفظ نہ بول سکی۔

"گھبرا گئی ہیں یہ!" سیفو نے ناجی کی ذہنی و جسمانی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "انجم جیٹی انھیں کہیں آرام سے بٹھا دو۔"

"واقعی کھڑے کھڑے تھک گئی ہوں گی، آؤ میرے ساتھ!"

انجم نے ناجی کا صندلی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"آؤ۔!"

اور ناجی ان کے ساتھ یوں چل دی جیسے انجم آرا کوئی ایسی عامل ہوں اپنے عمل کے زور سے معمول کو سر راہ پر چلاتا ہوا"

انجم آراء اسے دانستہ زنانے حصے کی طرف لے کر نہیں گئیں۔ ماں کا دل تو مشتعل تھا۔ ناجی کو دیکھ کر اور بھڑک اٹھنے کا احتمال تھا۔ ناجی کو طاہر کی خوابگاہ میں لے گئیں۔

"یہ تمہارے میاں کا کمرہ ہے"۔ انجم آرا نے پیار سے ناجی کا ہاتھ دبایا۔ ناجی ششدر سی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اس کے حواس ابتک ٹھکانے پہ نہ آئے تھے۔

"بیٹھ جاؤ"۔ انجم آرا نے اسے مسہری پر بٹھا دیا۔ ناجی آنکھیں پھاڑے کبھی انجم اور کبھی کمرے کو دیکھ رہی تھی۔

"لیٹ جاؤ"۔ انجم اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ "یہ طاہر کی خوابگاہ ہے امی حضور نے طاہر کے جانے کے بعد بھی اس کی اس طرح دیکھ بھال کروائی جس طرح ان کے جانے سے پہلے کرواتی تھیں۔

انجم اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا دل بہلانا چاہتی تھیں، لیکن ناجی گم صم سی بیٹھی تھی، تیز و تند نظروں سے زخمی ذہن ابتک خوفزدہ تھا۔

"تمہیں باتیں نہیں آتیں؟"۔ انجم نے اس کی ٹھوڑی کو چھوڑ کر پوچھا، ناجی غیر ارادی طور پر مسکرا دی۔ وہ انجم سے کچھ کچھ مانوس ہو گئی تھی۔

"نام بھی نہیں بتایا۔۔۔؟" کیا نام ہے؟"

"ناجی۔۔۔"

"شکر ہے تمہاری آواز تو سنی! ماشاء اللہ شکل و صورت کی طرح آواز بھی پیاری۔۔۔"

ناجی پھر مسکرائی، ہونٹوں کے مضمحل سلوٹوں پر ابھرتا ہوا تبسم ناجی کے ملکوتی حسن میں اضافہ کا باعث تھا، انجم کا جی چاہا اسے اپنے سینے سے لگا لیں

"لیٹ جاؤ۔ تھک گئی ہو گی تم تو ــــ" انجم نے زبردستی نانی کو سہارا دے کر لٹا دیا۔

انجم اس سے باتیں کرنے لگیں، اور نانی سہمے سہمے لہجے میں انکی باتوں کا جواب دینے لگی۔ انجم آرا کے مشفقانہ رویے کے باوجود اس کے حواس پر خوف چھایا ہوا تھا۔

"تم آرام سے لیٹی رہو ــــ اب میں جاتی ہوں ــــ"

"آپ ــــ آپ ــــ"

"اوں ہوں ــــ گھبراؤ نہیں ــــ یہاں تم پورے اطمینان سے لیٹی رہو ــــ میں ذرا ابا حضور کو دیکھ آؤں"

"سیاں کہاں ہیں۔؟"

"سیاں؟" انجم نے حیران ہو کر نانی کی طرف دیکھا، نانی کچھ شرما سی گئی۔ اور انجم کو یہ جاننے میں قطعی دقت نہ ہوئی کہ اس کا استفسار طاہر کے متعلق تھا

"طاہر کو پوچھ رہی ہو۔؟" مسکراتے ہوئے انجم بولیں۔

نانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انجم اس کی سادگی پر مسکرا دیں۔

"اچھا تم آرام کرو، میں تمہارے سیاں کو یہیں بھیجے دیتی ہوں، وہ شاید ابھی ابا حضور ہی کے کمرے میں ہیں۔" ابا حضور کی حالت مشکوک ہے۔ نانی دعا کرو۔ اللہ ان پر رحم کرے۔"

ادھر انجم آرا، نانی سے باتوں میں مشغول تھیں، اور ادھر زنان خانے میں جیسے کوئی قیامت ٹوٹ پڑی تھی، نواب صاحب کی مشکوک حالت کو جیسے سبھی نے فراموش کر دیا تھا، نانی موضوع تھی اور ہر فرد اس کے خلاف زہر اگل رہا تھا، حسن بانو کا غصہ آخری حدود کو چھو رہا تھا، سعدیہ آتش زیر پا تھیں

——— اور فوزیہ کے آنسو جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔

رشتہ دار حسن بانو کا اعتماد جیتنے اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے بڑھ چڑھ کر ناجی کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔

"چڑیل کہیں کی! ہمارے سینے میں مونگ دلنے یہاں آ پہونچی ہے۔"

"دیدہ دلیری تو دیکھو۔ یہاں آنے کی جرأت کیسے کر لی۔"

"آنکھ میں ڈر خوف تو تھا ہی نہیں۔"

"ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی، اتنا نہ ہو سکا کہ بیگم صاحبہ کے پاؤں پڑ کر معافی ہی مانگ لیتی۔"

"گنوار ——— دیہاتن ——— یہ آداب کون سکھاتا۔"

حسن بانو کے گرد اگرد خاندان کی عورتوں کا جمگھٹا تھا۔ حسن بانو کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی بجائے زیادہ بھڑکانے کی کوشش میں انھیں اور بھی اشتعال دلا رہی تھیں۔

سعدیہ اور فوزیہ تو اسے ذلیل کرنے کے لئے خود بھی ذلالت پر اتر آئی تھیں، نام سن سن کر دل جل رہا تھا، اب ڈائن گھر میں بھی آ پہونچی ہے۔ سعدیہ آنسو بہانے لگی۔ فوزیہ پہلے ہی سے آنسو بہا رہی تھی، دونوں بھانجیوں کو روتے دیکھ کر حسن بانو کے اُبال کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

"میرے تو سینے میں لوہے کی میخ کی طرح چبھی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر بنا جاتا تو اسی وقت پٹھا گھسیٹ کر پھاٹک سے باہر آتی۔"

"ایک دفعہ اس نے یہاں قدم جما لیئے تو پھر کوئی حیلہ کارگر نہ ہوگا۔" سعدیہ شاکی لہجہ میں بولی۔

"قدم جمانے کون دے گا ——— میرا نام حسن بانو نہ ہوگا ——— جو

یہاں ٹکنے دیا۔"

"لیکن طاہر ۔۔۔؟"

"طاہر نے کوئی چوں چرا کی تو اس گھر کے دروازے اس پر بند ہو سکتے ہیں۔"

"امی حضور!" انجم آرا چند لمحے پہلے یہاں آئی تھیں۔ کرے کی مسموم فضا دیکھ کر وہ ٹھٹک گئیں۔

حسن بانو نے گردن گھما کر پیچھے کھڑی انجم آرا کو دیکھا۔ انجم ماں کے دائیں ہاتھ بیٹھتے ہوئے بولیں ۔۔۔ "امی حضور۔ آپ طاہر کو کچھ ہاتھوں سے گنوانا چاہتی ہیں۔ شکر کا مقام ہے۔ خدا نے جیتے جی بیٹے کو ملا دیا۔ طاہر آگئے ہیں، ہمیں اس سے زیادہ اور خوشی کون سی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن ساتھ ہی چڑیل بھی آگئی ہے نا؟"

"وہ طاہر کی بیوی ہے امی حضور ۔۔۔ جہاں طاہر ہوں گے وہیں وہ بھی ہوگی۔" تو گویا آپ پر بھی جادو چل گیا ہے ساحرہ کا؟" بڑے ہی طنزیہ انداز میں سعدیہ نے کہا۔

"جادو کیسا؟" انجم نے سعدیہ کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"بڑی طرفداری کر رہی ہیں نا اس چڑیل کی۔" سعدیہ غصے سے برس پڑی "ہماری پلے دو پلے بے عزتی ہو رہی ہے ۔۔۔ لڑکی کو گھر بیٹھے داغ لگ گیا۔ رسوائی جو ہوئی الگ۔ اس پر طرہ کہ اب یہ آوارہ لڑکی ہمارے ساتھ رہے گی ۔۔۔ ہماری برابری کرے گی۔"

"سعدیہ بیٹی" حسن بانو اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں "اس گھر میں تمہاری برابری تو کیا۔ نوکرانی بن کر بھی نہ رہنے دوں گی اسے

غضب خدا کا۔ ٹکے کی چھوکری نے سارے خاندان کو ہی الرٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے
اس کی یہ مجال کہ یہ ہماری برابری کرے، آنکھیں نہ پھوڑ دوں گی اسکی۔" انجم آرا نے
بیچ بچاؤ کی بہتیری کوشش کی، لیکن ایک اکیلی کہاں تک مقابلہ کرتیں۔ سعدیہ کی
پشت پناہی حسن بانو کر رہی تھیں اور حسن بانو کے اشارۂ ابرو پر پورا خاندان ناچ
سکتا تھا۔

ناجی مسہری پر لیٹی آج کے واقعات پر غور کر رہی تھی، انجم آرا کا تلطف
نہ ملتا تو اس غیر مانوس ماحول میں اس کا دم آج ہی گھٹ جاتا۔
انجم آرا اس کا کھانا اسی کمرے میں لے آئی تھیں۔ اس کے خلاف جو زہر
اگلا جا رہا۔ وہ اسے اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش
کر رہی تھیں۔
کھانا کھلا کر اسے سو جانے کی تلقین کرتے ہوئے انجم چلی گئی تھیں لیکن ناجی
سو نہ سکی، اس کے ذہن میں ہلچل مچی تھی، دماغ تپ رہا تھا، آج شام سے رات
کے مختصر وقفے میں کتنے غیر متوقع واقعات ظہور پذیر ہوئے تھے، یہ غیر متوقع
واقعے اس کی طبیعت پر بری طرح اثر انداز ہوئے تھے، اس کا دل گھبرا رہا تھا،
وہ یہاں سے دور ــــ بہت دور چلی جانا چاہتی تھی، یہاں کی خست میں ــــ اپنی
پرسکون دنیا میں ــــ جہاں محبت کی نرم نازک روپہلی کرنوں کے جال تھے، جہاں
عشق کی حرارت سے ہر غیر مانوس جذبہ پگھل جاتا تھا، اور جہاں پیار کی نغمگی
سے موسیقی وجد میں ڈھل جاتی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات بھیگ

گئی تھی۔ لیکن۔ یہاں ابھی تک نہیں آئے تھے، وہ کب آئیں گے؟ انتظار کا ایک ایک لمحہ سو یوگ روح تھا۔

وہ کافی دیر کمرے میں بے قرار روح کی طرح پھرتی رہی۔ یہاں سے وہ تھک گئی۔

ہار کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کی کمر کچھ پھوڑے کی طرح تھی، بستر پر پڑی ہوئی وہ بے ہنگم طریق سے آج واقعات کے بارے میں سوچتی رہی۔ اور اس کا الجھا ہوا ذہن اور تھکا ہوا جسم مائوف سا ہوتا گیا۔ پھر نہ جانے کب نیند کی پریوں نے لوریاں دے دے کر اسے تھپکا اور وہ گہری نیند سو گئی۔

اور کافی رات گئے جب نواب فاروق علی خاں کی حالت کچھ سنبھلی اور دواؤں کے اثر سے وہ کچھ اونگھ گئے، تو طاہر کو ناجی کا خیال آیا۔ وہ خوابگاہ سے باہر نکلے۔ اتفاق ہی تھا کہ جونہی آنگن میں انجم آرا ملیں۔

"ناجی کہاں ہے۔؟" طاہر نے ان سے پوچھا۔

"تمہاری خوابگاہ میں۔" انجم نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔

"وہاں۔؟"

"ہاں ہاں۔ میں ہی انھیں لے گئی تھی۔ آرام سے سو رہا تھا، کچھ غیر مانوس سا ماحول تھا ان کے لئے۔ گھبرا گئی تھیں!"

طاہر کچھ بے قرار سے نظر آئے۔ انجم بھانپ گئیں۔ "فکر نہ کرو۔ وہ سو رہی ہیں، میں ابھی دیکھ کر آئی ہوں۔"

طاہر کو کچھ تسلی ہوئی۔ دونوں بہن بھائی کچھ دیر اِدھر اُدھر کی کہتے اور دوسرے کی سنتے رہے۔

"امی حضور نے ناجی کو دیکھا۔؟" باتوں ہی باتوں میں طاہر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔!" انجم جلدی سے بولیں۔

"کیا خیال ہے ان کا؟"

"خیال کیسا؟"

"سنا ہے وہ اس کے خلاف اب بھی۔۔۔؟"

"یہ سب وقتی باتیں ہیں طاہر سب ٹھیک ہو جائے گا تم جانتے ہی ہو انکی کوہائی تم سے منسوب تھی، اس نسبت کے ٹوٹنے کا انھیں کتنا غم ہے۔ اس غم کا اظہار اگر وہ غصہ کی صورت میں کریں بھی تو خاموشی ہی میں مصلحت ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ ناجی پیاری پیاری معصوم صورت دیکھ کر انکے سینے کا پتھر خود بخود پگھل جائے گا۔"

طاہر عقیدت سے سر جھکائے بہن کی باتیں سن رہے تھے!

"ناجی کی صورت اور سیرت بہت جلد اسے اسکا اصلی مقام دلا دے گی طاہر" طاہر نے فخریہ انداز سے سر اٹھایا۔ اور مسکرا کر بہن کی طرف دیکھا۔ "آپ کو پسند آئی ناجی۔؟"

"تمھارے انتخاب کو داد نہیں دی جا سکتی" انجم آرا نے پیار کی شدت سے مغلوب ہو کر طاہر کے سر پر بوسہ دیا۔ یہ اس کے انتخاب کی کھلی داد تھی۔

طاہر کے دل میں گھر والوں کی طرف سے جو موہوم سا خوف تھا، وہ انجم آرا کی باتوں اور رویے سے کسی حد تک ٹوٹ گیا۔

بہن سے الگ ہو کر وہ اپنی خوابگاہ میں گئے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی مانوس یادیں ذہن میں ابھر آئیں۔ اتنی مدت بعد اپنے کمرہ میں داخل ہو کر وہ کچھ عجیب سی کیفیات سے دوچار تھے!

چند لمحے وہ ساکت کھڑے رہے۔ ناجی نے بلکی سی مانے کے ساتھ کروٹ

بدلی، طاہر کا انہماک ٹوٹ گیا۔ جلدی سے مسہری کی طرف بڑھے، ناجی پر جھک گئے
ناجی کروٹ بدل کر سو گئی تھی، نرم نرم تکیوں پر ناجی کے سیاہ بال بکھرے
تھے طاہر نے جھک کر ان بالوں کو چھوا لیکن ناجی کو جگایا نہیں وہ جانتے تھے اسے
پرسکون نیند کی کتنی ضرورت ہے۔

وہ اسے بغور دیکھتے رہے ایک گہرے سکون اور اطمینان کا احساس ان
کی رگ رگ میں مسرت کی ہلکی ہلکی لہریں دوڑا رہا تھا، آج ناجی کو اسکا اصلی مقام
مل گیا تھا وہ الحمراء میں بہو بن کر آگئی تھی۔

طاہر گھر میں سلگنے والی فضا سے قطعاً بے خبر تھے۔ انجم آرا کی باتوں سے وہ
پہلے ہی مطمئن ہو گئے تھے۔ اس پر ناجی کو اس طرح اپنی خوابگاہ میں محو خواب پایا
تو انھوں نے طمانیت کا گہرا سانس لیا۔ اس سانس کی گہرائی میں جذبات تشکر بھی
تھے، ناجی کو اپنانے کی حقیقی خوشی کا احساس انھیں آج پوری طرح ہوا۔

چند لمحے رکنے کے بعد طاہر پھر نواب فاروقی کی خوابگاہ میں لوٹ آئے
ان کی آمد نے نواب فاروق کی زندگی کی گرتی دیوار کو عارضی سہارا دے
دیا تھا۔ اس رات وہ کافی دیر تک ہوش و حواس میں رہے تھے، طاہر کو نظروں سے
اوجھل نہ ہونے دیا تھا، مدتوں درشن کی پیاسی آنکھیں ہمیشہ کو بند ہو جانے
سے پہلے پوری پوری طرح سیراب ہونا چاہتی تھیں۔

طاہر کے دل میں جدائی کی کسک تھی، وہ بلن کے ان لمحوں سے آسودگی پا رہے
تھے، باپ کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے، چند لمحوں کے لئے انھیں غنودگی آئی، تو ناجی
کو جاگ کر دیکھ لیا، پھر وہیں آکر بیٹھ گئے، باپ کی شفقتوں کے کئے دامن آج پوری
وسعتیں لئے لہرا رہے تھے، طاہر ان دامنوں تلے قلبی سکون پا رہے تھے۔

سحر ہو چکی۔ طاہر پلنگ کی پٹی پر سر رکھے قالین پر بیٹھے بیٹھے سو گئے تھے

دوسرے دونوں بھائی اور رشتہ کے کئی بزرگ کمرے میں باری باری آتے جاتے رہے تھے لیکن طاہر نے باپ کی بانہہ نہیں چھوڑی تھی۔

بالوں میں انگلیوں کا لمس محسوس کرتے ہی طاہر کی آنکھ کھل گئی! جلدی سے سر اٹھایا اور ادھ کھلی آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

وہ جاگ رہے تھے اور ان کی بے نوری آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے طاہر کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے، کمرے میں ہلکی ہلکی برقی روشنی اور دریچوں سے آنے والی صبح کے ہلکے اجالوں میں الجھ رہی تھی پھیکی پھیکی بے نوری روشنی میں نواب فاروق کا چہرہ یوں نظر آرہا تھا جیسے موت کے ہاتھ نے اس بے رنگ خاکے میں زردی بھر دی ہو۔

گھبرا کر طاہر نے باپ کی طرف دیکھا۔

"ابا حضور ــــ" وہ دھیرے سے پکارے۔"

فاروق ہوش میں تھے، تکیے پر رکھے سر طاہر کی طرف موڑ کر انھیں جی بھر کر دیکھا، ان کی کانپتی انگلیوں کی لرزش کچھ اور بڑھ گئی طاہر نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اور پریشان نظروں سے باپ کو دیکھنے لگے۔

"طا ــــ ہر" آواز میں انتہائی نقاہت تھی۔

"جی۔"

"تمھاری ــــ دلہن کہاں ــــ ہے ــــ انھیں ــــ ساتھ ــــ نہیں ــــ لائے ــــ تھے ــــ؟"

"جی ــــ ابا ــــ"

"ہم نے اپنی ــــ بہو کو ــــ نہیں ــــ دیکھا ــــ وہ ــــ کہاں ــــ ہے ــــ؟"

رکتے رکتے الفاظ میں خواب فاروق نے تاجی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"وہ میرے ساتھ آئی تھیں، ابا حضور۔" طاہر نے باپ کے ہاتھ پر سر رکھ دیا۔

"انھیں یہاں لاؤ۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"ابا حضور۔" طاہر کا دل شدتِ جذبات سے بھر آیا۔ "آپ آپ نے ہمیں معاف کر دیا۔ ابا حضور۔"

فرطِ عقیدت سے طاہر نے باپ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

"انھیں یہاں لاؤ۔"

"اسی وقت؟"

"ہاں۔ پھر شاید ان آنکھوں میں روشنی نہ رہے۔"

"ابا حضور!" طاہر بے قرار ہو گئے، ان کی آواز رقت سے رندھ گئی

"بھاؤ طاہر۔ انھیں لے آؤ۔ جاؤ بیٹے۔" باپ کے لہجہ کی مایوسی سے طاہر تڑپ گئے، ڈوبتے دل سے باپ کو دیکھا، انھوں نے پھر تاجی کو دیکھنے کا اصرار کیا، طاہر غمگین و افسردہ سے اٹھے اور دبی خوابگاہ کی طرف چل دیئے۔

تاجی صبح سویرے اٹھنے کی عادی تھی۔ طاہر خوابگاہ میں داخل ہوئے تو وہ مشرقی دریچہ کھولے کھڑی تھی۔

"تمھیں ابا حضور بلا رہے ہیں تاجی۔" ان کی حالت اچھی نہیں۔ آؤ انکے پاس چلو۔۔؟"

"ہیں۔ میں چلوں۔ تاجی نے انھیں بے یقینی سے دیکھا۔ اور بادل نخواستہ

ان کے ساتھ چل دی، نواب صاحب سے بچپن ہی سے خوف کھاتی چلی آئی تھی، اس پر جو حالات رونما پذیر ہو چکے تھے، وہ ڈرنے میں حق بجانب ہی تھے۔

دونوں خوابگاہ میں اکٹھے داخل ہوئے نواب فاروق کی منتظر نظریں ادھر ہی تھیں، طاہر نے ناجی کا ہاتھ تھام کر مسہری کے قریب کر دیا۔

ناجی اپنے آپ کو سمیٹتی شرماتی۔ اور خائف زدہ سی مسہری کے قریب جھک گئی، بڑے سنبھل سنبھل کر سہمے ہوئے طریق سے سلام کیا۔ ناتواں سا لرزتا ہوا ہاتھ اٹھا، اور ناجی کے سر پر ٹک گیا، اور زندگی کی روشنی میں سے لمحہ یہ لمحہ دور ہوتی آنکھیں دھندلا گئیں۔

عین اسی وقت حسن، بانو خوابگاہ میں آئیں، یہ منظر دیکھ کر آگ بگولا ہو گئیں۔ طاہر کی پشت تھی۔ انھوں نے ماں کے چہرے پر عتاب کے طوفان نہیں دیکھے تھے، وہ گرجنے کو تھیں کہ موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے وقار بھائی نے بڑھ کر انھیں بازو سے تھام لیا۔ اور انکے کچھ کہنے سے پہلے ہی دوسرے کمرے میں لے گئے۔

وقار نے انھیں حالات کی نزاکت اور موقع کو غنیمت سمجھ کر چپ رہنے کی تلقین کی اور سمجھا بجھا کر خوابگاہ میں لائے۔

ناجی مسہری کی پٹی پر جھکی جھکی بیٹھی تھی، فاروق دھیرے دھیرے کہہ رہے تھے "دعا کرو۔ بیٹی۔ خدا ہمیں۔ ہمارے کئے کی۔ سزا نہ دے۔ ہم نے۔ تم سے بڑی۔ زیادتی۔ کی۔"

نواب فاروق اعتراف جرم کر کے اپنی روح کو ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہے تھے، انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے بڑا بوجھ انکے سر سے اتر گیا ہو۔ اور اب عاقبت کا راستہ وہ بغیر کسی تردد کے طے کر سکتے ہوں۔

ناجی رو رہی تھی، طاہر کی آنکھیں نمناک تھیں۔

حسن بانو کا دل اس منظر سے کبھی نہیں پسیجا، انتقامی جذبات طوفان اٹھا رہے تھے، دل میں پیچ و تاب کھا رہی تھیں، لیکن ظاہر داری کو چھپ ہونا پڑا۔ کوئی ہنگامہ نواب فاروق کی زندگی کا جھلملاتا چراغ اک لمحہ میں گل کر سکتا تھا۔

حسن بانو مسہری کے قریب کرسی پر بیٹھ گئیں، شوہر کو دیکھ کر غمزدہ بھی تو تھیں عمر بھر کی رفاقت کتنی سرعت سے ٹوٹتی جا رہی تھی۔

"حسن بانو ــــ" انتہائی نحیف آواز میں نواب فاروق بولے حسن بانو آگے جھک گئیں، ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"بہو ــــ دیکھی ــــ تم نے ــــ؟" اسی لہجہ میں فاروق بولے۔

طوفان سینے کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ لیکن مصلحت اس طوفان کو روک لینے میں تھی۔

دل پہ پتھر رکھ کر بولیں "آپ کو پسند ہوئی تو، ہمیں پسند ہی پسند ہے۔"

نواب فاروق کے چہرے پر مسرت کے آثار نظر آئے اور ماں کے منہ سے یہ کلمے سن کر ظاہر کے سینے میں مسرت و انبساط کی لہریں سی اٹھنے لگیں سارے دکھ سکھ سمٹ گئے۔ جذبات عقیدت سے ان کا دل لبریز ہو گیا جی چاہا ماں کے قدموں پر سر رکھ دیں۔

پھر

نواب فاروق نے وصیت کی کہ ظاہر کے حصے کے سارے زیورات ناجی کو دے دیئے جائیں۔ ان کا حق وراثت بھی بحال کر دیا اور انھیں پورے پورے حقوق کے ساتھ الحمراء میں رہنے کی اجازت بھی دے دی۔

لیکن

نواب فاروق کا التفات ناجی کے حق میں سود مند ہونے کی بجائے زہر ناک ثابت ہوا، اس کی راہوں میں کانٹے ہی کانٹے بکھر گئے۔ جب مرگ نواب فاروق نے عاقبت سنوارنے کے لئے بیٹے کی خطا بخشی کر دی تھی، بہو کو دامانِ شفقت تلے لے لیا تھا۔ لیکن گھر کے دوسرے افراد کے دل سے کینہ نہ نکل سکا نواب فاروق کی دی ہوئی مراعات نے اس کینہ کو خوفناک بنا دیا۔ ناجی گھر والوں کے سینہ پر ٹوٹتا ہوا سانپ تھی۔

حسن بانو تو اسے ایک نظر نہ دیکھ سکتی تھیں، سعدیہ اسے کچا چبا جانے کی فکر میں تھی، اور فوزیہ ——— فوزیہ کا بس چلتا تو اسکا گلا گھونٹ دینے میں بھی دریغ نہ کرتی۔ اس کی کنواری محبت کے سینے میں چبھا ہوا نشتر تھی ناجی۔ ظاہر اس کے منسوب تھے، اور دل ہی دل میں فوزیہ نے اس منسوب کو محبوب مان لیا تھا۔

ناجی کو ذلیل کرنے، گنوار اور بدتمیز کر کے رسوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ اس کا مسخرا اڑایا گیا۔ دیہاتن تو اس کا جیسے نام ہی منتخب ہو گیا تھا۔ یہ سب شر پسند طبیعتوں اور ذہنی بغض کی پیداوار تھی، ورنہ ناجی تو ظاہری قربت میں بہت کچھ سیکھ چکی تھی، شادی کے بعد ایک بدلے ہوئے طرزِ زندگی سے وہ مہذب یافتہ اور مہذب طبقے کے بہت کچھ عادات و اطوار اپنا چکی تھی، لیکن اہل خانہ کو اسے ذلیل کرنا مقصود تھا۔

ناجی کی حالت اس پرندے کی سی تھی جسے کھلی فضا میں سے زبردستی پکڑ کر سونے چاندی کی سلاخوں والے پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔ سوال صرف قیدی کا ہوتا تو بات اور تھی، یہاں تو ذہنی کچوکے جان لیوا تھے۔ غریب ناجی کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اسے ان حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔

نواب فاروق کی حالت بگڑتی جا رہی تھی، ظاہر باپ کی پٹی سے لگے بیٹھے تھے دن بھر مشکل چند گھڑیاں ناجی کو دیکھنے کے لئے آتے، وہ گھر والوں کی طرف سے معلمہ تھے، ناجی سے کچھ پوچھتے بھی نہیں تھے، اور ناجی بھی کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔"

تین دن تین صدیاں تھیں جو گزرنے ہی میں نہ آتی تھیں، ناجی نے یہ تین دن کیاں سے الگ گزارے تھے، وہ دن اور رات کے لمحوں میں کئی بار مر چکی تھی، اپنے آزاد ماحول میں لوٹ جانے کے لئے وہ بھی پرندے کی طرح پھڑپھڑائی تھی لیکن

یہ ممکن کہاں تھا، نواب فاروق کی حالت خطرناک حد تک بگڑ رہی تھی، ہر ایک کی حالت سے سب سے زیادہ متاثر ظاہر ہی تھے، دس ماہ کی طویل جدائی اس کی سب سے بڑی وجہ تھی۔

اس رات نواب صاحب کی حالت نخدوش تھی الحمرا میں عیادت کو آنے والوں کا ہجوم تھا، زنانہ مردانہ دونوں حصے مہمانوں سے بھرے تھے، یہ وقت ناجی کے لئے سخت ترین تھا، ظاہر سارا دن اس کے پاس نہ آ سکے تھے سعدیہ اور صفیہ کی انتقامی حس نے تو جیسے آج انتقام کی قسم کھائی تھی سب لوگوں کے سامنے جس طرح اسے ذلیل کیا گیا، ناجی غریب خون کے آنسو روتی رہی۔ ایسے باپ کی حالت سے متفکر تھی، ناجی کو صرف تحقیر کا التفات نصیب تھا۔

کچھ دن بھرا کی صورت کبھی نہ دیکھ سکی۔

حسن بانو تھا پنی پریشانی ناجی پر تہر برسا کر مٹا رہی تھیں، ایک ریشتہ دار عورت کے استفسار پر کہ یہ ظاہر کی بیوی ہے۔ حسن بانو یوں شعلہ فشاں ہو ئیں۔

"یہی ہے ڈائن جس نے میرا بیٹا بتیا کر میری کوکھ برباد کیا، اور اب چڑیل میرے سہاگ کا چراغ بھی گل کرنے کو آپہونچی ہے"

بڑی بھابی درمیان میں نہ آتیں تو عید نہ تھا حسن بانو ناجی کی چٹیا گھسیٹ کر گھر سے باہر کر دیتیں۔

رات گہری ہو چکی تھی، ناجی ظاہر کی خوابگاہ کے بیرونی برآمدے میں ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، روتے روتے اس کا برا حال تھا وہ بھر بھر کر تمسخر کے تیروں نے اس کا سینہ چھلنی کیا تھا، سہمی سہمی کھڑی اپنی زندگی کے اس غیر متوقع حادثے پر غور کر رہی تھی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر چند یوم اور اسے اسی ماحول میں گھٹ گھٹ کر جینا پڑا تو یقیناً اس کی کشتی حیات موت کے بھنور میں کھو جائے گی۔

اسے چند لمحے کھڑے گذرے تھے کہ قدموں کی آہٹ ہوئی، وہاں ناجی کی روح چمک گئی۔

لیکن پلٹ کر دیکھا تو دم بخود رہ گئی، وہاں نہیں فوزیہ ادھر آرہی تھی۔ ناجی گھبرا گئی۔ فوزیہ سے سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی، سارا وجود سمیٹ کر اس نے ستون کی اوٹ میں ہو جانا چاہا۔

لیکن

فوزیہ آگے بڑھنے کی بجائے وہیں رک گئی۔

"ظاہر کا انتظار ہو رہا تھا؟" وہ اس کے عین سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

ناجی کا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔ چہرہ خوف و ہراس سے سپید ہو گیا، فوزیہ نے سر تا پا اسے یوں دیکھا جیسے قصاب بچھڑا ذبح کرنے سے پہلے اسے دیکھتا پرکھتا ہے۔

ناجی کے سارے وجود میں سرد سی لہر دوڑ گئی، آج فوزیہ کی آنکھوں میں اک طوفان تھا، اک آگ تھی، اک کھولن تھی۔ ناجی سر تا پا کانپ گئی پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھتی رہی۔

"خوبصورت بلا" فوزیہ غرائی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ زخم خوردہ جذبے تلملا اٹھے۔ اسکا جی چاہا ناجی کا گلا گھونٹ دے اس حسین مناظرہ کو اپنے انتقام کی آگ میں جھلس دے۔

ناجی کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی، اس نے چیخنا چاہا، لیکن خوف سے ناجی کے حلق سے آواز بھی نہ نکل سکی۔

"جادو گرنی" فوزیہ دو قدم آگے بڑھی، تو نے میرا محبوب چھینا ہے، میرا منصوب چھینا ہے، دن رات افکاروں پر لوٹ رہی ہوں۔ اور تو ــــ تو زندگی کی ساری مسرتیں سمیٹ رہی ہے ــــ لیکن ــــ لیکن ــــ یاد رکھ میرا نام فوزیہ ہے، میں سائے کی طرح تجھ سے چمٹی رہوں گی، میں تیری مسرتوں کا خون چوس لوں گی۔ تیری خوشیوں کو ہڑپ کر جاؤں گی۔"

"سیاں!" ناجی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا، اس پر غشی کا سا عالم تھا۔

"ظاہر میرا ہے۔ وہ میرا رہے گا، میں اس کی۔ اہ سے تجھے ہٹا کر رہوں گی۔ اسے اپنا کر رہوں گی ــــ صرف چند دنوں میں۔ تو دیکھے گی کہ ظاہر میرا ہو گا۔"

"حسیاں!" ــــ ناجی کے منہ سے چیخ نما پکار نکلی اور سناٹے میں ڈوب گئی،

وہ لڑکھڑاتی ـــــ ہراتی ـــــ بیچارگی میں سہارنے کے لئے فوزیہ کو پکڑنا چاہا۔

لیکن

وہ اس کا ہاتھ اس بری طرح جھٹک کر چلادی کہ ناجی توازن قائم نہ رکھ سکی بھرا کر مرمریں زینے پر گری اور لڑھکتی ہوئی سیڑھیوں سے بجری والی سڑک پر آرہی۔

انسانیت دم بخود تھی، انتقام اور خود غرضی نے اخلاقی قدروں کا گلا گھونٹ دیا۔ فوزیہ نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت تک نہ کی، ناجی بیہوش ہو گئی۔

قدرت کو شاید ناجی کی زندگی مقصود تھی، اتفاق ہی سے انجم آرا ادھر سے گزریں کسی کو یوں سڑک پر پڑے دیکھ کر وہ پہلے تو ڈر گئیں، لیکن جب برقی روشنی میں قریب سے دیکھا تو ناجی کو یوں پڑے دیکھ کر بے حد گھبرا گئیں۔

"ناجی" اس پر جھک کر بیتابی سے پکارا۔ لیکن ہلانے جلانے پر انھیں اس کی بیہوشی کا علم ہوا۔ پریشان ہو کر اس پر جھک گئیں، کندھا ہلا کر اسے ہوش و حواس میں لانا چاہا لیکن وہ تو گہری غنودگی میں ڈوبی تھی، ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور رنگ خوفناک طور پر زرد ہو گیا تھا۔ بھاگ کر وہ گیٹ اور دو تین کمزوں کو ساتھ لے آئیں۔ ناجی کو مل کر سب خوابگاہ میں لے گئیں۔

ڈاکٹر جمیل نواب فاروق کے کمرے میں تھے، انجم نے جلدی سے انھیں بلا بھیجا ناجی کی بیہوشی کی خبر ظاہر کے وہ اس پر بجلی کی طرح گری ڈاکٹر جمیل سے پہلے ہی وہ تیر کی سی تیزی سے بھاگے ـــــ خوابگاہ میں گھبرائے ہوئے داخل ہوئے اور لپک کر ناجی پر جھک گئے۔

"کیا ہوا؟" وہ سراسیمگی کے عالم میں انجم سے پوچھنے لگے۔

"اللہ جانے۔ میں ادھر سے گزرا تو زمین پر بے ہوش پڑے پایا۔" انجم بھی واس باختہ سی تھیں۔

"شاید زینے سے پاؤں پھسل گیا ہے۔" ایک کنیز ناجی کے پاؤں سہلاتے ہوئے بولی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" دوسری نے تائید کی۔

"ہو سکتا ہے ——" انجم نے کہا۔

طاہر کی بیتابی و بیقراری دیدنی تھی، کبھی اس کے کندھے ہلاتے، کبھی جھک کر پکارتے۔ کبھی چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر مایوسی سے آواز دیتے "گھبراؤ نہیں طاہر ——" انجم اس کی تڑپ سے متاثر تھیں۔

ڈاکٹر جیندے گیا، مختلف آلات کی مدد سے اس نے ناجی کا معائنہ کیا، اسے ہوش میں لانے کی سعی کرتا رہا۔

رات گئے ناجی کو ہوش آیا لیکن ہوش میں آتے ہی وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔

ڈاکٹر جیندے نے لیڈی ڈاکٹر بلانے کی رائے دی، کچھ ہی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر مع نرسوں کے آ گئیں۔

اور

وہ رات۔

وہ رات کسی قیامت سے کم نہ تھی، ایک طرف فاروق کی زندگی کا چراغ تند ہواؤں کے آخری تھپیڑے کا منتظر تھا، دوسری طرف ناجی درد زہ سے تڑپ رہی تھیں طاہر مرغ بسمل تھے، کبھی باپ کی بگی پر جھکے ہیں، کبھی ناجی کے لئے برآمدے میں دیوانہ وار ٹہل رہے ہیں، گھر والوں کو ناجی سے کیا واسطہ تھا۔ اور کچھ موقع ہی

ایسا تھا، سب فاروق کی خواب گاہ کے ارد گرد پروانہ وار منڈلا رہے تھے۔
ایک انجم تھی جو کبھی باپ کی حالت دیکھ کر آنسو بہا رہی تھیں، کبھی نانی کی۔
اور کشتۂ غم طاہر کو رلا سا بھی تو دے رہی تھیں۔

طوفانی رات کا سلسلہ ابد سے ملا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اک اک لمحہ ٹھٹک ٹھٹک کر گزر رہا تھا۔ سحر ہونے ہی میں نہ آ رہی تھی فاروق موت اور حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے موت حیات کا رنگ چوس رہی تھی اور فاروق کا فاکہ لمحہ بہ لمحہ بے رنگ ہوا جا رہا تھا۔

پچھلے پہر لیڈی ڈاکٹر نے مایوسی کا اظہار کر دیا۔ نانی کو فوری طور پر ہسپتال پہونچانے کی ضرورت تھی، ڈاکٹر کی رائے پر اسی وقت عمل کیا گیا۔ انجم اور طاہر دو ایک خدمت گزاروں کو ساتھ لے کر نانی کو ہسپتال لے آئے۔

بقیہ رات اضطراب میں گزری، طاہر و انجم کو کچھ دیر بعد ہی واپس گھر لوٹنا پڑا۔ نواب کی حالت کے بارے میں انھیں فون کیا گیا تھا۔

صبح بیدار ہوئی۔ انجم کے لئے یہ ایک خونی صبح تھی۔ شب بیدار سرخ آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کی سر توڑ کوششیں مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گئی تھیں۔ نواب فاروق عالم نزع میں تھے۔ ڈاکٹروں نے سب آلات ہٹا لئے۔ عزیزوں کو قریب آنے کی اجازت دے دی۔

ہسپتال میں نانی کی حالت مطمئن تھی۔ وہ زندگی کی بازی لگا کر ایک نئے وجود کی تخلیق کر رہی تھیں۔ آپریشن کے بغیر بچے کی ولادت ممکن نہ تھی طاہر پھر ہسپتال پہونچے ان کی اجازت سے ڈاکٹروں نے آپریشن کیا۔

طاہر کی والدہ قابل رحم تھی۔ آپریشن کے دوران انھیں گھر جانا پڑا۔ جان نانی میں اٹکی تھی، گھنٹہ بھر بعد پھر واپس آ گئے۔

ناجی پریٹ کے آپریشن کے بعد ایک پیاری سی بچی کو جنم دے کر بیہوش پڑی تھی۔
نرس نے برآمدے ہی میں طاہر کو بچی کی ولادت کی خبر سنائی۔ طاہر بیتابانہ
ناجی کے کمرے کی طرف بڑھے۔

وہ ابھی تک بیہوش تھی۔ سفید سفید نرم بستر میں زرد زرد ناجی کے چہرے پر
تقدس کی ایسی جھلک تھی کہ طاہر کا سر عقیدت احترام سے جھک گیا۔ وہ بڑھے
اور ناجی کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے!

"تم نے جان پر کھیل کر میری خواہش کا احترام کیا تم قابل تعظیم ہو"۔ ناجی کی
حالت خطرے سے باہر تھی۔ ڈاکٹر نے آکر انھیں تسکین و تسلی دی۔

طاہر نے بچی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

دوسرے کمرے سے نرس سفید کپڑوں میں لپٹی ہوئی پیاری سی بچی کو لے کر
آگئی۔ طاہر نے ایک نظر اس پر ڈالی، پیار و محبت کے کچھ نامفہوم سے جذبات انکے
دل میں مچل اٹھے۔

"صاعقہ" انھوں نے پیار کی شدت سے پکارا۔

لیکن اپنے چہیتے محبت کے اس شگوفے کی مہک سونگھنے سے پہلے ہی
دوسری نرس گھبرائی ہوئی اندر آئی۔

"الحمرا سے فون آیا ہے ــــ کہ ــــ کہ" وہ کپکپاتی آواز میں بولی۔ طاہر
بوکھلائے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے!"

اور

جب وہ فاروق کی قیام گاہ میں پہونچے تو وہ ابدی نیند سو جانے کو تھے
بچی کی ولادت کی خبر یہاں بھی پہونچ چکی تھی۔

پہلا لفظ جو اس سے منسوب کیا گیا وہ "منحوس" تھا۔

موت و زیست کی کشمکش نے آخری مرحلہ طے کر لیا، زندگی نے ہتھیار ڈال دیئے اور موت نے اپنی کامرانی کے سیاہ جھنڈے گاڑ دیئے۔

ایک کہرام مچ گیا۔

ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔

"آہ و فغاں نے الحمراء کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیئے"

زندگی کی شکست پر آنسو بہانے کے سوا چارہ ہی کیا ہوتا ہے۔

سکون

ناجی کی تقدیر سے حرف غلط کی طرح مٹی جیکا تھا بچی کی ولادت سے کمزوری بیحد ہو گئی تھی، باپ کی وفات سے طاہر کئی جنجالوں میں پھنسے تھے، ناجی ہسپتال سے واپس گھر آ گئی تھی۔ لیکن، لیکن طاہر کو اطمینان ایک لمحہ اسکی قربت میں نصیب نہ ہو سکا۔ تعزیت کرنے والوں سے چھٹکارا ملتا تو جاگیر کے تنازعہ جائداد کے بکھیڑے اور کاروبار کی جھنجھٹ گھیر لیتے، انہی جنجالوں میں الجھ کر رہ گئے۔ اکثر ہفتہ ہفتہ بھر گھر سے باہر رہنا پڑتا دوڑ دھوپ میں انھیں ناجی کے پاس رہنے کی فرصت ہی میسر نہ آسکی۔

ناجی گیلی لکڑیوں کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی، طاہر آزاد کو صرف قفس ہی میں ڈال دیا ہوتا تو بات بھی، یہاں تو قید کے ساتھ ساتھ نشتروں کی چبھن بھی تھی، اک اک لمحہ بھر پور اذیت تھی۔

فوزیہ کسی بدروح کی طرح اس کی زندگی کا تعاقب کئے جا رہی تھی وہ

جب بھی ناجی کے سامنے آتی ناجی سر تا پا کانپ جاتی۔ اسے یہی محسوس ہوتا جیسے فوزیہ عورت نہیں ڈائن ہے جس کے خونی جبڑوں میں لمبے لمبے نوکیلے دانت ہر وقت اس کی حیات کو چبانے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

"چڑیل ۔ تجھے میں اپنی راہ سے ہٹا کر دم لوں گی" دانت پیستے ہوئے فوزیہ کئی بار یہ جملہ اس سے کہہ چکی تھی۔

اور

ہر بار ناجی کے خون دہراس میں اس جملے سے کپکپاتا ہوا اضافہ ہوا تھا۔

گھر کے دوسرے افراد بھی تو فوزیہ سے کم نہ تھے، طاہر جتنے دن گھر سے باہر رہتے ان لوگوں کو اپنی زخم خوردہ انا کو تسکین دینے کا جیسے ذریعہ میسر آجاتا انجم آرا کی نگاہ لطف کرم میسر تھی۔ لیکن ان دنوں وہ بھی اس قدر مصروف تھیں کہ ناجی کی سلگتی آگ کی آنچ محسوس ہی نہ کر سکیں۔

بات صرف ناجی کی ذات تک ہی محدود ہوتی تو شاید وہ دل پر پتھر رکھ کر سہہ سکتی، لیکن اب تو اسکے ساتھ ساتھ ننھی منی جان کو بھی مورد عتاب بنایا جا رہا تھا، صاعقہ چند دنوں کی معصوم بچی سب کی نظروں میں منحوس قرار دی جا چکی تھی نواب فاروق کی موت کی ذمہ دار جیسے وہی تھی۔

قدرت بھی بسا اوقات عجیب کم ظریف ہوتی ہے، نحوست کو صاعقہ کی ذات کا جزو سمجھا ہی جا رہا تھا، شومئی تقدیر جس دن ناجی اپنی بچی سمیت ہسپتال سے گھر آئی، اسی دن آیا کی نواسی سے چھوٹی پھوپھی حسن آرا کا غسل خانے میں پاؤں پھسلا اور کولھے کی ہڈی اتر گئی۔

اس واقعے سے صاعقہ کی نحوست پر جیسے مہر تصدیق لگ گئی۔

محض اتفاق ہی تھا، لیکن انہی دنوں ردی کے گوداموں میں کسی ملازم کی

شرارت یا تساہلی سے آگ لگ جانے سے کم و بیش تین چار لاکھ کا نقصان ہو گیا بات ہر پھر کر صاعقہ کی نحوست سے وابستہ ہوئی۔

ستم بالائے ستم یہ کہ انہی دنوں حسن آرا کے شوہر فضائی حادثہ میں بیرس کے قریب جاں بحق ہو گئے، جس وقت یہ اطلاع قصر احمر میں پہونچی، حسن آرا صاعقہ کو گود میں لئے بیٹھی تھیں۔ اب تو صاعقہ نحوست کا ایسا نشان سمجھی جانے لگی جس کے عقب میں تباہی ہی تباہی تھی۔

نانی کے سامنے ہی اسے وہ کوسنے دیئے جاتے کہ ظلم بھی پناہ مانگ اٹھتا گھر والوں کا بس چلتا تو ننھی سی جان کو پاؤں تلے کچل کر فنا کر دیا جاتا۔ جارحانہ بہیمانہ رویہ روا رکھنے میں ہر فرد پیش پیش تھا۔

نانی سب کچھ دیکھ رہی تھی، اپنی ذات پر تو شاید اس سے بھی زیادہ سختیاں جھیل لیتی، لیکن اس ننھی معصوم روح کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سنکر اس کا سینہ شق ہو جاتا، اسے سینے سے لگائے پہروں روتی رہتی محل کے پچھواڑے درختوں کی چھاؤں میں بہتی پہاڑی ندی کے کنارے چپ چاپ بیٹھی اپنی تقدیر کے اس پلٹے کے متعلق سوچتی رہتی، اسے سیاں کی بے مہری کا بھی تو شکوہ تھا۔ الحمراء میں آتے ہی وہ اس سے اتنی دور ہو گئے تھے۔

لیکن یہ سب نانی کے دکھے ذہن کی اختراع تھی۔ طاہر کو مصروفیت نے الجھا رکھا تھا ان کے پیار کے پیرائے نہ بدلے تھے۔ باپ کی وفات نے کئی بکھیڑے کھڑے کر دیئے تھے۔ الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، ان سب کا تدارک انہی دنوں ضروری تھا، سب بھائی ان تنازعوں بکھیڑوں اور الجھنوں کو دور کرنے میں کوشاں تھے۔

طاہر فرصت نکال کر نانی کے پاس آتے، شکوے مچل اٹھتے، گلے ہونٹوں

پر تڑپ جاتے، لیکن نہ شکوؤں کو راہ ملتی نہ گلوں کو زبان۔ ظاہر آتے تو انکی توجہ کا مرکز صاعقہ ہوتی، اس کی پیاری پیاری صورت دیکھ کر وہ ہر انجمن پر تنازعہ اور ہر بکھیڑا بھول جاتے۔ کتنے مسرور نظر آتے تھے وہ جب ناجی کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کہہ نہ پاتی۔

پورے دو ماہ گزر گئے۔ ناجی کا سینہ گھر والوں کے طعنے سنتے سنتے شق ہو گیا تھا۔ صاعقہ کی نحوست کی باتیں سن سن کر کان پک گئے تھے ہر حادثہ اسکی ذات سے منسوب تھا اور کوتاہی تقدیر سے حادثے بھی انہی دنوں پیش آنے تھے۔

پے در پے کئی واقعات رونما ہوئے۔

آندھی کے ساتھ طوفانی بارش آئی۔ الحمرا کے زنانے حصے کی پچھلی دیوار گرنے سے دو کنیزیں مجروح ہو گئیں، ملازم لڑکے سے بچہ گاڑی الٹی اور انجم کا چھوٹا بچہ زخمی ہو گیا۔ دادی حسن بانو کے سر میں درد شروع ہوا۔ اور کچھ مستقل صورت اختیار کر گیا، ریحان کا کھیلتے کھیلتے پاؤں پھسلا اور موچ آ گئی۔

چھوٹے بڑے واقعات پیش آئے اور ان سب کی محرک صاعقہ کی ذات کو سمجھا جانے لگا، عورتیں تو عورتیں اس کنبے کے اکثر مرد بھی اسکو منحوس کہنے لگے تھے۔ اور ایسا سمجھنے میں اپنے کو حق بجانب خیال کرتے تھے۔

ناجی سب تم اپنی جان پر جھیل رہی تھی، اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شوخ تند ندی کی لہریں کسی سرد رو سے منجمد ہو چکی ہوں، چہرے سے تازگی و شادابی عنقا تھی، وہ اس مرجھائے ہوئے پھول کی طرح دکھائی دیتی تھی جسے عالم شباب میں شاخ سے توڑ کر گلدان میں سجا دیا گیا ہو، اور جہاں وہ اپنے قدر و سائل سے محروم ہو کر رنگ بو کھو رہا ہو۔

اس دن طاہر تقریباً ڈیڑھ ہفتے کے بعد الحمرا واپس آئے جاگیر پر تنازعہ

کی وجہ سے اتنے دن غیر حاضر رہنا پڑا۔ طاہر نے اس دن ناجی کو ایک عرصے کے بعد غور سے دیکھا، اور جیسے کسی نے ان کا دل مسل کر رکھ دیا۔

ناجی کا صبیح و ملیح چہرہ اس سپاٹے بیدان کی طرح نظر آ رہا تھا، جہاں کوئی حسین قافلہ چند دن رک کر رونقیں بکھیرنے کے بعد جا چکا ہو، اور چند روزہ رونقوں کے بعد جا مد سناٹے میں اب اداسیاں ہی اداسیاں اُمڈ آئی ہوں۔

چہرے کی رنگت زرد تو تھی ہی لیکن آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے کتنے گہرے ہو گئے تھے۔ طاہر نے بے اختیار ہو کر ناجی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ اب تک ناجی کی کمزوری کو بچی کی ولادت کا اثر سمجھ رہے تھے، لیکن آج انکا دل سہم کر رہ گیا۔

"تمھیں کیا ہو گیا ہے ناجی ــــ کتنی کمزور ہو گئی ہو۔ کیا تکلیف ہے تمھیں؟"

اس بے پناہ ہمدردی اور چاہت نے محسوسات کے نازک آبگینوں کو ٹھیس لگا دی۔ رکا ہوا طوفان پھوٹ پڑا۔ ناجی نے طاہر کی چھاتی میں منھ چھپا لیا۔ اور اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

"ناجی" طاہر گھبرا گئے۔ "کیا ہوا۔ کچھ تو کہو۔!"

"سیاں!" ناجی ان کی چھاتی سے لگی سسکتی رہی۔

"ناجی" طاہر نے پیار کی شدتوں سے مغلوب ہو کر اسے بازوؤں کو مضبوط گرفت میں جکڑ لیا۔

"سیاں!"

"کچھ تو کہو ناجی!" کیا ہوا ــــ کسی نے کچھ کہدیا ــــ ناجی ــــ رو کیوں رہی ہو ــــ کچھ تو کہو ــــ" اس کے بالوں میں منھ چھپائے طاہر اس سے پوچھ رہے تھے۔

"سیاں!" وہ مضطرب و بیقراری تھی۔

کیا ہوا؟" طاہر نے اس کا چہرہ ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا۔ اور اس کی جل برساتی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی، اور بولے" اداس ہو گئی تھیں۔ بہت دن لگ گئے مجھے ــــ کیا کرتا۔ کام ہی ایسا تھا۔ مجبوری تھی ناجی۔ وعدہ کرتا ہوں۔ اب اتنے طویل عرصے کے لئے کہیں نہیں جاؤں گا!

"مجھے یہاں سے لے چلو سیاں!" ناجی نے جیسے طاہر کی بات سنی ہی نہ ہو۔

ــــ طاہر متعجب سے ہوئے۔ پھر نرمی سے بولے ــــ "کہاں؟"

"کہیں ــــ کہیں لے چلو سیاں!" ناجی نے سر جھکا کر پھر ان کی چھاتی سے لگا دیا" میں یہاں مر جاؤں گی ــــ مجھے کہیں لے چلو۔"

"ناجی" طاہر نے سہارا دے کر اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ وہ اب بھی اسی بے اختیاری سے روئے جا رہی تھی۔

طاہر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے" کچھ افسردہ سے نظر آنے لگے تھے وہ۔"

"ناجی" کیا بات ہے۔ یہاں دل لگاؤ یہ میرا گھر ہے تمھیں اچھا نہیں لگا؟"

ناجی رونے لگی، وہ انھیں کیسے بتا دیتی، یہ گھر نہیں، سونے چاندی کی سلاخوں والا ایسا بڑا پنجرہ ہے۔ جہاں ہر لمحہ اسکے نشتروں اور زہر آلود تیروں سے دیکھ بھال ہوتی ہے، اور جس کی بند سلاخوں سے اپنا ماتھا پھوڑ پھوڑ کر بھی راہ فرار نہیں پا سکتی۔

"اکیلی گھبرا جاتی ہو۔ امی حضور کے پاس چلی جایا کرو۔ وہاں سب لوگ تمھارا دل بہلائیں گے۔"

"نہیں سیاں ــــ وہ ــــ وہ ــــ"

"کیا؟"

ناجی روتی رہی۔

"امی حضور سے ڈر لگتا ہے؟" طاہر نے اس کی ذہنی کیفیت سے ہی اندازہ لگایا۔

"ہاں" ناجی نے معصومیت سے کہا۔

"کیوں؟"

"یہاں ــــ مجھے ــــ مجھے یہاں سب ــــ برا سمجھتے ہیں۔ سب!"

"یہ تمھارا وہم ہے ناجی!" طاہر بیساختہ ہنسنے لگے۔

"نہیں ــــ یہاں نہیں۔!"

"ناجی ــــ امی حضور نے ابا کی وفات کا جانکاہ صدمہ جھیلا ہے۔ اور پھر حسن آرا کے شوہر کی موت نے انکے حواس پر بجلی گرائی ہے، ان کا مزاج چڑچڑا سا ہو گیا ہے، لیکن گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا، سب پیار کریں گے، ان دو موتوں سے تو سب کی جان پر بنی ہے، تم دل تھوڑا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

ناجی طاہر کے اعتماد کو کیوں جھٹلا دیتی، قہر کے طوفان تو اس کی ذات پر ٹوٹتے تھے، طاہر کے ساتھ تو گھر والوں کا یہ رویہ معمولی سے زیادہ خوشگوار تھا۔ یہی دورخی پالیسی تھی، جو ناجی کو بن موت مارے جا رہی تھی۔

شومئی تقدیر ناجی و طاہر کی باتیں فوزیہ نے سن لیں، حسن بانو کو اتنا بھڑکایا کہ وہ غصے سے پیچ و تاب کھانے لگیں، ناجی کو کچل دینے کی انھوں نے قسم کھالی۔

اب ناجی کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا۔ انجم سسرال جا چکی تھیں ان کا سہارا بھی جاتا رہا۔ طاہر کو بھی اکثر گھر سے باہر رہنا پڑا موقعہ غنیمت جان

کر مظالم ڈھائے گئے اور بے دریغ ڈھائے گئے لوٹا گیا اور بیدردی سے لوٹا گیا

چال بدل لی گئی تھی، طاہر کے سامنے حسن و سلوک کا مظاہرہ نانی سے کیا جاتا اس کے ساتھ ہمدردی جتائی جاتی اس کی صحت کے بارے میں تشویش ظاہر ہوتی، لیکن طاہر فریب کھا رہے تھے، انہی ہاتھوں کا سہارا لئے جا رہے تھے، جو بڑے مستعدی سے ان کی جیتی جاگتی محبت کو دفنانے کے لئے قبر کھود رہے تھے۔

نانی بالکل چپ ہو گئی، مجسم گلہ تھی، لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتی ہاں کبھی کبھی بے بس ہو کر طاہر کی چھاتی میں منہ چھپا کر رو دیتی تو اسکی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا ــــ "مجھے کہیں لے چلو میاں ــــ!"

طاہر اس کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے بھرپور پیار سے اسے بہلانے لگتے، وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ نانی ماحول کی تبدیلی سے متاثر ہے رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا، وقت نانی کو گھر اور گھر والوں سے مانوس ہونے میں مددگار ہو گا۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ نانی یکسر بدل گئی، نہ شوخی نہ چنچلا پن اک مہیب سی خاموشی اس کے سراپا پر چھائی رہتی وہ دکھتا ہوا زخم دکھائی دینے لگی، طاہر چاہتے، وہ سارے محل میں شوخ ہرنی کی طرح کلیلیں بھرتی پھرے، پہلے سی شوخی معصومیت اور الھڑپنے سے ان کے ساتھ باتوں کے طویل سلسلے چھیڑے۔ اچھلے کودے اور ستانہ بھاوجوں کی طرح انہیں جھومتی پھرے۔

لیکن

نانی پر تو ایک جمود طاری تھا، آنکھوں میں جما ہوا آزار اب اتنا تھا کہ طاہر دوزخی پالیسی کے قریب ہی آنے کے باوجود تڑپ کر رہ گئے۔

"ناجی!" انھوں نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر غور سے دیکھا۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"سیاں!" طوفان، ایک بار پھر پھوٹ پڑا۔ ناجی بے اختیار ہو کر رو دی!

"ناجی۔ کچھ تو بتا دو!"

"مجھے یہاں سے لے چلو سیاں!" نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ میرا دم گھٹ جائیگا مجھے لے چلو سیاں! — لے چلو!"

"اچھا — میں تمھیں یہاں سے لے جاؤں گا۔" طاہر نے فیصلہ کر لیا۔

"سچ؟"

"ہاں۔"

"کب چلو گے؟"

"بہت جلد۔"

"سچ — ؟"

"یقین نہ کرنے کی وجہ تو کوئی نہیں۔"

"سیاں —!" ناجی کو جیسے اس کی کھوئی جنت ملنے کا یقین ہو گیا۔ طاہر نے اس کی آنسو بھری آنکھوں میں جھانکا۔ انھیں یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں کے بجھتے ہوئے دیپ پھر سے روشن ہو گئے ہوں۔ مسرت کی ایک لہر پورے اس کے کملائے ہوئے چہرے پر دوڑ گئی۔

"میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں ناجی۔ اگر تمھاری خوشی یہاں سے چلے جانے میں ہے، تو میں تمھاری خوشیاں تمھیں لوٹا دوں گا۔"

"سیاں!" تم کتنے اچھے ہو سیاں!" ناجی نے ایک مدت کے بعد اپنی مخصوص ادا سے مسکرا کر دیکھا اور پھر شرما کر اپنا منھ ان کی چھاتی میں چھپا لیا۔

طاہر کو آج پہلی بار اس آزاد پرندکی بند پنجرے میں پھڑپھڑاہٹ کا صحیح اندازہ ہوا، انھیں یوں محسوس ہوا جیسے لاشعوری طور پر وہ ناجی پر ظلم کرتے آرہے تھے ان کا دل دکھنے لگا۔

اللہ جانے اسے یہاں کیا تکلیف ہے ہم تو صدقے واری ہوتے ہیں۔ اس کا مزاج ہی نہیں ٹھہرتا۔"

"یہ بات نہیں امی حضور — وہ اس ماحول سے مانوس نہیں اس لئے سخت گھبرا گئی ہے۔"

"یہاں رہے گی تو مانوس بھی ہو جائے گی۔ دور دور بھاگے گی تو مانوس ہونے کا سوال ہی نہیں —"

"اس کی صحت گرتی جارہی ہے، کچھ عرصہ کے لئے اسے الگ رکھنا ہی پڑیگا — ورنہ —"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ خود ہی ہم سے دور بھاگنے چاہتے ہو۔"

"امی حضور —!"

"اور کیا، ابھی تو باپ کا کفن بھی میلا نہیں ہوا۔ اس بات کو کہتے ہوئے تمھیں خود ہی خیال ہونا چاہئے!"

ماں کی گلوگیر آواز سے طاہر کا دل ڈول گیا۔

طاہر نے ماں کے سامنے ناجی کو الگ رکھنے کی تجویز پیش کی تھی، لیکن وہ بات میں آیا ہوا شکار کیسے چھوڑنا چاہتی تھی ناجی ایکبار پھر انکے وقار کا مسخر

اڑاتے ہوئے طاہر کو لے کر الگ ہو جائے یہ بات بھلا انھیں کیوں کر گوارا ہو سکتی تھی۔ انتقامی جذبے تو اسے لمحہ لمحہ کی موت مار کر تسکین پا رہے تھے تاجی کے الگ ہو جانے سے یہ تخریبی کارروائی کہاں ممکن تھی۔

ماں نے مخالفت کی، سعدیہ اور فوزیہ نے ماں کی حمایت کی لیکن سب نے وطیرہ ایسا اختیار کیا کہ طاہر کے لئے نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن والا معاملہ ہو گیا۔

"سال بھر تمھاری جدائی میں تڑپتے گزرا تھا، خدا خدا کر کے شکل دیکھنا نصیب ہوئی، جانا ہی تھا تو پھر آئے کیوں تھے، ایک ہی صبر کی سل کلیجہ پر رکھ لی تھی۔"

"دنیا کیا کہے گی، باپ کی رائیں کبھی نہ ہوئیں اور بیٹے نے کنارہ کشی کی۔"

"کتنے خوش تھے تمھارے ابا تمھاری واپسی سے انھیں فریب ہی دینے آئے تھے، چاہتے ہو ان کی روح ابد تک بھٹکتی پھرے۔"

"قسمت میں دکھ ہی دکھ لکھے ہیں، زخموں پر پھایا رکھنے کی بجائے انھیں کریدنا چاہتے ہو۔"

ماں نے روتی آنکھوں سے ایسے ایسے وار کئے کہ طاہر بے بس ہو کر رہ گیا۔ سر جھکا کر آہستگی سے اک بار پھر اپنے ارادے کی وضاحت کی۔

"امی حضور — میں گھر چھوڑ کر پہلے کی طرح تو نہیں جا رہا، صرف تاجی کی صحت کے پیش نظر۔!"

"ہاں! ہاں! ایسا تو کہو گے — تاجی کے مقابلے میں تمھیں بیوہ ماں کی ضرورت بھی ہو سکتی ہے۔" ماں ہچکیاں بھرنے لگی۔"

"جب جانے پر بضد ہو تو پھر پوچھنے کا کیا تک — جاؤ جہاں خوش

ہو رہو۔" چھوٹی بہن حسن آرا نے تلخی سے کہا۔

"ہمیں خدا کو سونپو۔" ماں نے رقت آمیز لہجے میں جیسے فریاد کی۔ "ہماری تقدیر میں تو صدمے ہی صدمے لکھے ہیں۔" سکریہ نے آنکھیں آنچل سے پونچھیں۔

حسن بانو اور ان کے حواریوں کے وار نشانے پر بیٹھے، طاہر کا سر اور بھی جھک گیا، ہونٹوں پر مہر خاموشی لگ گئی۔ ان کی باتوں سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ ناجی کا یہاں سے کہیں اور چلے جانے کا اصرار بے محل سا نظر آنے لگا۔

نڈھال اور پریشان سے وہاں سے اٹھے۔ ماں کیلئے ان کے دل میں ایک درد سا کروٹیں لے رہا تھا۔

اور

اسی رات جب ناجی نے بڑے پیار سے طاہر کے گلے میں بانہیں ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھا "کب چلو گے میاں؟"

تو

طاہر جھنجھلا گئے۔

ماتھے پر ہلکی سی شکنیں ابھریں اور جھلا کر بولے "خدا جانے تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟"

ناجی کے بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح گر گئے، آنکھیں پھاڑے وہ طاہر کو دیکھتی رہ گئی۔

طاہر نے منہ پھیرا — اور مسہری کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑائے۔

"تم اتنا تو سوچو، میرے لئے یہاں سے جانا کتنا مشکل ہے، ابا کو فوت ہوئے ابھی عرصہ ہی کتنا گزرا ہے — لوگ کیا کہیں گے، دنیا داری کی خاطر کبھی کبھی اپنے اوپر جبر بھی کرنا پڑتا ہے۔

وہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ اور ناجی انھیں آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے سیاں نہیں، حسن بانو کے صاحبزادے طاہر اس سے ہمکلام ہوں۔ طاہر و سیاں — ایک ہی شخصیت کے دو رخ متضاد معلوم ہو رہے تھے، ناجی کا معصوم دل طاہر کی ذرا سی جھنجھلاہٹ سے خون ہو گیا، آئینہ دل پر خراشیں ہی خراشیں تھیں۔ ان خراشوں سے لہو رستا رہا۔

طاہر اس کی پریشانی سے مضطرب تو ہوئے۔ لیکن اظہار ہمدردی کے بجائے اسے سمجھانا ضروری تھا، اس لئے بڑے ناصحانہ طریق سے اسے سمجھاتے رہے۔

وہ ناجی کو اپنے بانہوں میں سمیٹ کر پیار کی گرمی و شدت سے تسکین و ہمدردی کے چند الفاظ کہہ دیتے، تو شاید ناجی کے دل کے زخم سل جاتے۔ لیکن آج طاہر کا ناصحانہ انداز اور سرد سا اجنبی رویہ ناجی کے دل و دماغ میں محشر اٹھا گیا، طاہر نے جو کچھ مصلحت سمجھ کر کیا، وہ ناجی کی بربادی کا پہلا قدم تھا۔

دوسرے دن موقع پاتے ہی حسن بانو نے دل کا غبار نکالا۔ سعدیہ نے لعن طعن کی، حسنا آرا نے نفرت و حقارت کی آگ برسائی۔ فوزیہ نے دانت چبا کر دھمکی دی "یہاں سے اب اکیلی ہی جاؤ گی۔ طاہر کو ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔ تو ان کی لاش ہی ملے گی تمھیں۔ سمجھیں۔!!"

ناجی پر قیامتیں ہی ٹوٹ گئیں — پریشان — نڈھال اور مضمحل ناجی کچھ کچھ نہ پائی تھی کہ کیا کرے، اب تو اسکی آنکھوں کے سوتے بھی خشک ہو گئے تھے۔ ٹکر ٹکر دیکھتے جاتی، نہ آنکھوں میں آنسو آتے نہ ہونٹوں پر فریاد۔

طاہر کو ہفتے بھر کے لئے باہر جانا پڑا۔ اور یہ ہفتہ ناجی کیلئے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ چبھتی نظروں، کھولتے طعنوں اور ہولناک دھمکیوں نے اسکی زندگی

اجیرن کر دی۔

وہ

جینے سے بیزار ہو گئی۔ قطعی بیزار۔ اور یہ بیزاری اس دن آخری حدود سے چھو گئی۔ ناجی نے محض اتفاقی طور پر سعدیہ اور فوزیہ کی باتیں سن لیں۔ سعدیہ کہہ رہی تھی "اب کچھ نہیں بگڑا اس چڑیل سے پیچھا چھوٹ جائیگا۔ مجھے قوی امید ہے، تم ظاہر کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتی رہو۔"

"میری تو ہر دم یہی کوشش ہوتی ہے۔

"بہت فرق آ چکا ہے ظاہر میں ـــ میرے خیال میں تو اب انکا دل ناجی سے بھر چکا ہے، ایک دو ہفتوں کے اندر تک نظروں میں سما سکتی ہے۔"

"حسین تو ہے۔"

"حسین ہے تو کیا ہوا۔ تمہارا اس کا کیا مقابلہ ـــ تہذیب یافتہ حسن کے سامنے اس جنگلی حسن کی کیا وقعت، تم بھلا کسی سے کم ہو۔ ظاہر کو ہار کر آخر تمہیں اپنانا پڑے گا۔"

"انھیں پانے کے لئے میں سب کچھ سہہ لوں گی ـــ اگر ـــ اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں کوئی خوفناک قدم اٹھانے سے بھی گریز نہ کروں گی۔"

"تم مایوس نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کتنا زور لگایا اس نے الگ جا کر رہنے کے لئے ـــ لیکن بات نہ بنی، ظاہر کو ہماری بات ہی ماننا پڑی۔"

"یہ تو واقعی کمال ہوا۔ ظاہر نے ناجی کی بات ٹھکرا دی۔"

"آگے آگے دیکھنا کیا ہوتا ہے، یہ محبت کا بخار جس تیزی سے چڑھا ہے اسی تیزی سے اتر بھی جائے گا۔"

ناجی کا دماغ ریل کے پہیے کی طرح گھوم گیا۔ ظاہر کا رویہ مشکوک ذہن کے

لئے قاتل ثابت ہوتا؟"

وہ دن رات اس ماحول سے نکلنے کے متعلق سوچنے لگی، کوئی ٹھکانہ نظر نہ آتا تھا، ماں مر چکی تھی، کوئی قریبی عزیز بھی نہ تھا اور پھر ۔۔۔ پھر وہ کسی کے ہاں جا بھی کیسے سکتی تھی، دل برداشتہ ہو کر صرف ایک ہی راہ فرار کے متعلق سوچتی؛ خودکشی،

یہی راہ اسے سکون دے سکتی تھی، اسکی بہت ظلم سہتے سہتے جواب دیتی جا رہی تھی، اس پر سیاں کا ناصحانہ انداز ۔۔۔ وہ بدظن ہوتی گئی۔ سیاں سے بھی بدظن ہوتی گئی۔

ادھر طاہر ناجی کی پریشانی سے پریشان، دیر میں حالات اسے یہاں سے کہیں لے جا کر الگ رکھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اور یہاں رکھنے سے دیکھ رہے تھے کہ ناجی بے موت مری جا رہی ہے۔ دن رات اسی اٹھاؤ کے متعلق سوچتے رہے، کبھی ناجی کو تسلیاں دیتے، کبھی جھنجھلا کر حالات سے تعاون کرنے کی نصیحت کرتے۔

ناجی بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اب اس نے کبھی کہیں اور جانے کیلئے طاہر کو مجبور نہ کیا تھا۔ کبھی کسی کے متعلق شکایت نہ تھی، لبوں پر کسی کا، شکوہ نہ آیا تھا، بس ہوئی دن رات کے چکر میں پستی جا رہی تھی۔

طاہر اسے دیکھ کر پریشان ہوتے تھے، ناجی اگر یہیں رہی تو کوئی عجیب نہیں وہ کسی مہلک مرض میں گرفتار ہو جائے، یہ سوچ کر وہ سرتاپا کانپ جاتے

بالآخر انھوں نے ایک تجویز سوچ لی۔ ناجی کو کچھ عرصہ کیلئے غیر ممالک کی سیر کے لئے لے جانے سے وہ یہاں کے غیر مانوس ماحول سے بھی نکل جائے گی اور گھر والوں کو اعتراض کا موقعہ بھی نہیں ملے گا۔"

ناجی سے کوئی ذکر کرنے سے پہلے انھوں نے اپنی تجویز ماں کے سامنے پیش کی
"دو چند ماہ کے لئے میں اسے غیر ممالک کی سیر کے لئے لے جاؤں گا۔" وہ
بہل جائیگی، اس کی صحت کس قدر گر چکی ہے، ہول آتا ہے اسے دیکھتا ہوں۔
تو۔۔۔ کچھ دیر یہاں سے دور رہے گی۔ تو غیر مانوس ماحول کا احساس جاتا رہیگا۔
ماں کب چاہتی تھیں کہ ان کے پنجے میں آیا ہوا شکار یوں نکل جائے وہ
تو پنجے گاڑ کر اس شکار کو مارنا چاہتی تھیں، انتقام کی آگ کو شکار کی تڑپ
سے ٹھنڈا کرنا چاہتی تھیں۔
کافی لے دے ہوئی، لیکن طاہر نے اس تجویز پر لمبی چوڑی بحث کی،
اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔
ماں کو بالآخر چپ ہو جانا پڑا۔ وہ راضی تو نہ ہوئی تھیں، بہ ظاہر بھی جا
نے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، ماں کا احساس تھا۔
لیکن نا۔
کیا کرتے مجبور بھی تو تھے۔ کئی دن طاہر پاسپورٹ وغیرہ کی تیاری میں
لگے رہے، ناجی کو سرسری طور پر اپنے باہر جانے کے پروگرام سے مطلع بھی کیا
لیکن ناجی تو پھر اپھی تھی، اس نے کوئی دلچسپی نہ لی۔
اس کے ذہن میں ایک نئی بات گھر کر آگئی، طاہر سب کچھ خوشی سے نہیں
مجبوراً کر رہے ہیں، مشکوک ذہن اس احساس کو جان لیوا بنا گیا۔
وہ زندگی سے تھک چکی تھی۔ ہر ارمان منجمد ہو چکا تھا۔
سیر و تفریح کے لئے جانے کی اسے مطلقاً خوشی نہ ہوئی، اور جب سے طا
نے جانے کی تیاریاں شروع کی تھیں۔ گھر والوں نے اس پر ڈھائے جانے
مظالم کو کتنا سنگین بنا دیا۔

فوزیہ تو جانِ دشمن کیلئے رو تھی اب اس کا خون پینے کو بیتاب تھی، خونخوار آنکھوں سے گھورتی، چبا جانے والی نظروں سے دیکھتی۔

حسن بانو نے بھی ناک میں دم کر دیا تھا، اس دن کتنے ظالمانہ طریق سے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا تھا، میرے بیٹے کو پھر مجھ سے جدا کرنے کی ہو، دو چار ماہ سیر کر آؤ، پھر آنا تو یہیں ہے، ساری سیر کا مزہ چکھا نہ دیا تو کہنا فریدہ نہ تھی، دیکھو تو منہ زبان نہیں نظر آتی اور کرتوت۔ اللہ جانے کس کس طرح سکھا کر آمادہ کر لیا ہے اسے ورنہ وہ تو یہاں سے جانے کا بھی نام نہ لیتا۔

سعدیہ، حسن آرا بھی آزار دیتی تھیں۔ ناجی دن رات مر جانے کے متعلق سوچتی۔ باہر جانے کا اب اسے ارمان بھی کیا تھا۔

فوزیہ نکاہر کی مٹیار یہاں دیکھ دیکھ کر زہریلی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی یہ تیاریاں ان کے منہ پر تھپڑ تھا۔

پے در پے شکستوں نے فوزیہ کو خونخوار بنا دیا۔ ظاہر یہیں رہتے تو اسے اپنی سرگرمیاں تیز کر کے کسی امید کا سہارا ہو سکتا تھا، لیکن ان کے چلے جانے سے امید خاک میں مل رہی تھی ناجی کی خوش بختی پردہ ناکامی کی مہر بن جانا چاہتی تھی۔ اور اس رات! ناجی مایوسی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی، آج طاہر نے پھر خفگی کا اظہار کیا تھا، یوں تو گم صم ہو جانے پر وہ اچھے خاصے برہم بھی ہوئے تھے۔ ناجی ابھی اس برہمی کے تاثر سے ہی تڑپ رہی تھی کہ فوزیہ اس کے کمرے میں آ گئی۔ رات کے وقت اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر وہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔ فوزیہ زہر اگل رہی تھی، اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے، اس نے ناجی کے بال جھنجھوڑ ڈالے اور کف آلود جبڑوں

سے دھمکی دی۔

"طاہر کو یہاں سے لے جانے کا خیال دل سے نکال دو، اگر تم انھیں یہاں سے لے جانے پر مصر ہو تو یاد رکھو تمھیں طاہر کی جگہ طاہر کی تڑپتی ہوئی لاش ملے گی۔" طاہر میرے ہیں اور میں انھیں حاصل کر کے رہوں گی۔ تم میرے اور طاہر کے راستے کی دیوار ہو۔۔۔ اگر یہ دیوار مجھ سے نہ ہٹ سکی تو میں طاہر کو ختم کر دوں گی، ایک ہی گولی اس کے سینے سے پار ہو کر سارا کام بنا دے گی مجھ میں تڑپنے کی اب ہمت نہیں، میں تڑپوں اور تم طاہر کی سنگدت پر ہیرو تقریر کرتی پھرو! یہ خیال طاہر دل سے نکال دو۔"

ناجی دل برداشتہ تھی، کم عمری اور ناتجربہ کاری بھی تھی، زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ طاہر کی طرف سے بھی ذہن کسی حد تک بدظن تھا، ان ساری باتوں نے مل ملا کر اسے نیم دیوانہ کر دیا تھا فوزیہ کی دھمکی نے تو اب ظلم سہارنے کی ہر قوت ختم کر دی۔

طاہر جب کمرے میں آئے تو وہ ناجی کی ذہنی کیفیت سے بے خبر تھے، وہ بے سدھ سی بستر پر پڑی تھی، طاہر ایک تو خود بھی دن کی دوڑ دھوپ سے تھکے ہوئے تھے۔ دوسرے ناجی کو بے آرام نہ کرنے کے خیال سے انھوں نے اسے جگایا نہیں۔ چپ چاپ لباس تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ گئے۔ جہاں چند ہی لمحوں بعد ان کا تھکا ہوا جسم نیند کی آغوش میں غافل ہو گیا۔ ناجی انگاروں پر لوٹتی رہی طاہر کی بے حسی پر دل جل کر رہ گیا۔ فوزیہ کی دھمکی کے دھماکے سے ذہن لرز لرز اٹھا۔

اس نے زندگی کا جوا اتار پھینکنے کا تہیہ کر لیا۔ آئے دن کی کل کل اور جھک جھک سے زیادہ کارآمد راستہ نظر آ رہا تھا۔

وہ اٹھی۔

اپنی شادی کی یادگار انگوٹھی اتار کر طاہر کے سرہانے رکھ دی، طاہر پر جھکے جھکے وہ کئی لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

کتنی پریشانیاں دی تھیں اس نے — نہ باپ ماں سے بغاوت کر سکتے تھے، نہ بہن بھائی کی طرفداری کھل کر ہو سکتی تھی بیزاری رہنے لگے تھے اس بیزاری کو ناجی سڑسراہٹ اور اداسی سے منسوب کئے ہوئے تھی۔

اس کا ذہن منتظم تھا وہ کچھ سوچ نہ سکتی تھی جس ایک ہی دھن تھی اپنی ذات کو ختم کر دینے کی، ہر بات معمولی پر آجائے گی، ہر غم کا مداوا ہو جائے گا۔ پاگلوں کی طرح سوچتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئی۔ چمن کو بھاگتے ہوئے عبور کر کے وہ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ اونچی پر کھڑے ہو کر اس نے دور الحمرا، کی بلند و بالا عمارت کی طرف دیکھا۔

پتھروں کی بنی ہوئی عمارت۔

جس میں ان پتھروں سے بھی کہیں زیادہ پتھر دل انسان بستے تھے۔ الحمرا پر آخری نگاہ ڈالنے کے بعد ناجی نے پُرشور ندی کی طرف دیکھا۔ ندی کی

یا — ں —"

ایک چیخ و پکار نے میں گونجی۔

ایک دھماکہ ہوا — اور

ناجی پہاڑی ندی کی تیز موجوں کی آغوش میں پہنچ گئی۔

اور

عین اسی وقت

طاہر چیخ مار کر مسہری پر اوندھا بیٹھ

انھیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ان کے دل پر زور سے گھونسہ مارا ہو۔ وہ اپنے خطرناک حد تک دھڑکتے ہوئے دل پر انھوں نے بے اختیار ہاتھ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحے یہی کیفیت رہی۔

پھر انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور اسی طرح دل پر ہاتھ رکھے رکھے انھوں نے گردن کو خم دیکر دائیں جانب دیکھا۔ نانی اماں کے پہلو ہی میں تو وہ سو رہی تھی۔

لیکن

اس وقت وہ بستر پر نہ تھی۔

"وہ" طاہر لیٹ گئے، شاید نانی کے اٹھنے سے پلنگ ہل گیا ہے، لیکن وہ ابھی تک یہیں کہیں آس پاس ہے"

طاہر نے کروٹ بدلی۔ آنکھیں بند کر کے سو جانے کی کوشش کی۔ نانی شاید غسل خانے میں جانے کو اٹھی ہو، یہ سوچ کر وہ مطمئن ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن۔

دل

کیا ہو گیا تھا اس دل کو ——— یوں بے اختیاری سے دھڑک رہا تھا۔ طاہر

نے گہرے گہرے سانس لے کر اس دھڑکن کو معمول پر لانا چاہا لیکن سینے میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگی۔

بیتاب ہو کر کروٹ پھر بدلی۔ آنکھیں بند کیں، پھر کھول دیں۔

ہاتھ بڑھا کر ہلکے سبز رنگ کا مدھم سا قمقمہ روشن کیا، بے چینی کو ختم کرنے کے لئے سگریٹ سلگایا۔

اور ناجی کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

کئی منٹ گزر گئے، ناجی نہ آئی۔

تکیہ ہٹا کر گھڑی نکالی۔

لیکن۔

ششدر سے رہ گئے۔

گھڑی کے ساتھ ناجی کی انگوٹھی پڑی تھی۔

کہنی کے بل اٹھے ــــ انھوں نے انگوٹھی اٹھالی ــــ یہ انگوٹھی دیکھ کر کچھ حیران سے ہو گئے، یہ انگوٹھی تو ناجی کی انگلی سے اسی طرح لپٹی رہتی تھی جس طرح ان کے دل میں ناجی کا پیار۔

آج یہ انگوٹھی اس حنائی انگلی سے جدا کیوں کر ہو گئی!۔

انگوٹھی اپنی انگلی میں اٹکا کر انھوں نے گھڑی دیکھی تین بجنے کو تھے تکیہ درست کر کے وہ پھر سے لیٹ گئے۔

انگلی میں انگوٹھی کو یوں ہی اٹکا کر خالی ذہن سے کچھ سوچتے ہوئے وہ ناجی کے غسل خانے سے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے۔

انتظار بے سود تھا، ناجی کو نہ آنا تھا نہ آئی، گھبرا کر ظاہر بے کہ بل الگ پھینکا کر سیدھے کھڑے ہو گئے، چند منٹ یونہی کمرے میں پھرتے رہے۔ سینے میں مگر کچھ

اور بڑھ گئی تھی گھبراہٹ سے جیسے دم گھٹا جا رہا تھا۔

"ناجی" انھوں نے غسل خانے کے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر پکارا، آواز دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آئی۔

طاہر نے پھر پکارا۔

جواب نہ ملا۔

بے کلی بڑھ گئی انھوں نے ہاتھ سے دروازہ ڈھکیلا، دروازہ کھلا تھا ناجی غسل خانے میں نہ تھی۔

طاہر پریشان ہو گئے پھر سوچا شاید بچی کے پاس ہو گی۔ لیکن اس سوچ سے تسکین نہ ہوئی۔

ساتھ والے کمرے میں آ گئے آیا گہری نیند میں خراٹے لے رہی تھی اور گلابی جھالروں والے ریشمی بستر میں انکی بچی کا شگفتہ پھول صاعقہ دیکھ معصومانہ اور دلفریب انداز میں خواب استراحت کے مزے لے رہی تھی۔

ناجی وہاں بھی نہ تھی۔

طاہر جلدی سے پلٹ کر کمرے میں آئے، گھبرا کر برآمدے میں نکل آئے انتشار ہر لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"آخر وہ کہاں جا سکتی ہے" انھوں نے اپنے ذہن سے سوچا پھر انھیں خیال آیا کہ وہ کوئی تکلیف نہ ہو گئی ہو، شاید امی کے کمرے میں گئی ہو۔

سوچ میں گم طاہر اپنی خوابگاہ میں واپس آ گئے لیکن قرار نہیں آ رہا تھا دل تھا کہ رہ رہ کر تڑپ رہا تھا، طبیعت بوجھل ہو گئی تھی اور روح تو جیسے لامتناہی اندھیروں میں ڈوبتا جا رہا تھا، اپنے دل کو کوئی دلاسا نہ دے سکے، سر جھٹک کر خیالات پریشان سے نجات چاہی انکی نظر پڑی ہوئی بگوشی کو خوف سے دیکھا اور جانے کیوں کر بلا شعوری

کے پردوں کو چیرتی ہوئی مجلہ عروسی میں سرخ سرخ کپڑوں میں لپٹی ہوئی ناجی نمودار ہوئی۔

"یہ انگوٹھی مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگی، کیوں!" ۔ موت اسے میرے ہاتھوں سے جدا کرے گی، تمھارے پیار کی پہلی نشانی ہے نا ۔؟"

گھبرا کر ظاہر نے سر جھٹک دیا، دل زور سے دھڑکا، اور روح بھی بے چین ہو کر تڑپ اٹھی۔

وہ بیتابانہ کمرے سے باہر نکلے۔

دیوانہ وار ناجی کو ڈھونڈتے پھرے۔

لیکن۔

تلاش بے سود تھی۔

جانے والا ہمیشہ کے لئے جا چکا تھا۔

دن نکلا۔

رات آئی۔

اور

پھر شب و روز کا چکر چلتا ہی گیا۔

ناجی کی تلاش میں ظاہر نے زمین و آسمان ایک کر دیئے۔

دیوانہ وار اسے ڈھونڈتے پھرے!

لیکن

بے سود۔

لاحاصل۔

گھر والے اس کی اچانک گمشدگی پر حیران تھے، دلوں میں اپنے منصوبے چھپن بھی تھی، جانتے تھے کہ جو کچھ ہوا اسی کے وجہ سے ہوا، لیکن ظالم ظلم کر کے

پچھتانے لگے، تو دنیا سے ظلم کا وجود ہی نہ مٹ جائے!"

ناجی کی روپوشی کو اک نیا رنگ دے کر اچھالا گیا "بھاگ گئی"، ہر پوچھنے والے کو یہی جواب دیا جاتا۔

"رہے والی تھوڑی ہی تھی" ایسے لوگ ایک جگہ زندگی گزار دیں تو رونا ہی کس بات کا۔ جگہ جگہ کی چاٹ ہوتی ہے، کوئی اور رسیا مل گیا ہوگا، جس کے ساتھ بھاگ نکلی" گھر کے ہر فرد کی زبان پر یہی باتیں تھیں۔

لیکن یہ سب کچھ بالا بالا ہوتا رہا۔ طاہر کے سامنے کسی کو کچھ کہنے کی مجال نہ تھی، ان کی حالت دیکھ کر تو ہر فرد اپنے آپ کو مجرم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ندامت سے سر جھک جاتے۔

طاہر دن رات فرغ بسمل کی طرح تڑپتے رہتے تھے "ناجی ناجی" دن کا رد اور رات کا واویلا پکار رہا تھا، نہ کھانے پینے کا ہوش، نہ تن بدن کی پروا۔ دن رات ناجی کی تلاش میں سرگرداں تھے، اور یہ سرگردانی غم کی زیادتی سے مل کر ان کے حواس پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر ناجی کو آوازیں دینے لگتے، اپنی محبت کے واسطے دے دے کر اسکو واپس آجانے کو کہتے۔

درد ایسا تھا جس کا مداوا ممکن نہ تھا۔

ناجی کہاں گئی، کیوں گئی؟" طاہر منتشر حواس سے بھی یہی باتیں سوچتے رہتے، ناجی کی انگوٹھی اس شبہے کی تقویت تھی، کہ وہ زندگی سے ہراساں ہو کر موت سے ہم کنار ہو گئی ہے۔

لیکن

زندگی سے ہراسانی کیوں؟"

طاہر کا پاش پاش دماغ اور تھکا ہوا تھا اور زخمی ذہن اس سوال کا جواب

دے پاتا۔

لیکن ایک دن اتفاقاً انھوں نے سعدیہ اور فوزیہ کی باتیں سن لیں۔

"کانٹا نکل گیا خود ہی دفان ہو گئی کہیں۔" سعدیہ کہہ رہی تھی۔

"خود تو نہیں ہمارے سلوک سے گھبرا کر بھاگ گئی۔ میں نے بھی قسم کھا لی تھی۔ اسے مٹا کر ہی دم لوں گی۔ وہ اذیتیں دیں کہ بس ــــ"

"اور میں نے کیا کم دل کا غبار نکالا تھا مجھے یقین تھا کہ تنگ آ کر ضرور فرار ہو جائیگی۔

"لیکن وہ گئی کہاں ــــ طاہر نے تو زمین آسمان ایک کر دیئے اسکی تلاش میں۔

"ہماری بلا سے، جیتی ہے یا مر گئی ــــ ہمارا راستہ صاف ہو گیا۔

"لیکن طاہر تو دیوانے ہو رہے ہیں۔"

"چند دنوں کی بات ہے، تم گھبراؤ نہیں، طاہر کے قریب رہا کرو۔ غم غلط ہو جائے گا، خود ہی راہ راست پر آ جائیں گے ــــ شادی ہونے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اگر وہ کہیں سے پھر آ دھمکی تو ــــ!"

"توبہ کرو ــــ پھر کہاں سے آئے گی ــــ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ سانپ بھی مر گیا، لاٹھی بھی نہ ٹوٹی ــــ یہی میں چاہتی تھی ــــ تم طاہر کے قریب رہا کرو، یہ وقتی صدمہ ہے بھول جائیں گے ــــ"

اور پھر ان دونوں کی باتوں میں حسن بانو اور حسن آرا بھی شریک ہو گئیں اور ہر فرد اعتراف کر رہا تھا کہ ناجی اسی کے روپ اور سلوک سے تنگ آ کر روپوش ہوئی ہے، ہر شخص اسکے فرار کی وجہ خود کو ثابت کرنے کا سہرا اپنے سر لینا چاہتا ہے۔

طاہر نے سب کچھ سنا ــــ ان کی یہ باتیں سوتی جاگتی میں طوفان اٹھا گئیں

زلزے آئے، محشر بپا ہو گئے،

لیکن

ان سب سے باز پرس کرنے سے پہلے ہی ان کی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ غم کی شدت اور اس پر یہ انکشاف طاہر کے حواس مختل تو تھے ہی۔ اب بالکل منتشر ہو گئے، سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو گئیں ناجی کے سوا انھیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔

سارا سارا دن گھاٹی میں پھرتے رہتے۔ ہر آہٹ پر انھیں ناجی کی آمد کا گمان ہوتا وہ اٹھ کر بے تحاشہ دوڑنے لگتے، درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ سے انھیں ناجی کے آمد کا پھڑپھڑاتے آنچلوں کا خیال آتا وہ اسے پکڑنے کو لپکتے۔

"ناجی ــــ ناجی" وہ دیوانہ وار چیختے، لیکن چیخ سناٹوں سے ٹکرا کر لوٹ آتی، ان کی حالت دیکھ کر سب کے دل کٹے جا رہے تھے، ناجی کی گمشدگی کا وہ اثر لیں گے، ان کے فہم و ادراک میں یہ بات نہ آئی تھی، ماں کی ممتا تڑپ اٹھی، بھائی بہنوں کا پیار مچل مچل گیا، لیکن طاہر کی لٹی ہوئی دنیا آباد نہ ہو سکی گھاٹی کے نشیب و فراز ہمہ "ناجی، ناجی" پکارنے کے سوا انھیں کسی بات کا ہوش نہ تھا۔

اک منحوس دن کبھی وہ دیوانگی کے عالم میں چھوٹے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ناجی کو پکارتے پھر رہے تھے، دو تین قریبی عزیز نوکروں کی نگرانی کے لئے ساتھ ساتھ رہتے تھے

اچانک آنکھوں سے اندھے پتھر پر گر پڑے ہو کر بازو پھیلا دیئے "ناجی" پورے جوش اور قوت سے چیختے ہوئے وہ پتھر سے کود کر نشیب کی طرف دوڑ پڑے لیکن بازوؤں آ بچھا۔

اور

ظاہر نگہداشت کرنے والوں کی پہونچ سے پہلے ہی لڑھکتے ہوئے گھاٹی کی گہرائیوں میں جا پہونچے۔

زخم اتنے شدید آئے کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور ابھی مہکتی فضاؤں میں جاں ان کی محبت نے جنم لیا، پروان چڑھی، اور ارتقائی منازل طے کرتی کامرانی سے ہم کنار ہوئی تھی ــــ ظاہر نے دم توڑ دیا۔

وفا کے نام پر مٹنے والوں کی داستان اتنی دلدوز انتہا ــ چاہیئے تو تھا پسماندگان کے لیئے درس عبرت بنتی، اور وہ تاجی و ظاہر کی داد یاد گار صاعقہ کو سینہ سے لگا کر رکھتے۔

لیکن

معاملہ اس کے برعکس تھا۔

اس سارے المیہ سانحے کو صاعقہ کی نحوست سے منسوب کیا گیا، نحوست تو پیدائش سے اس سے منسوب کی جا چکی تھی، اور پے در پے واقعات بھی کچھ اس طرح رونما ہوتے رہے تھے کہ اوہام پرست طبیعتیں اپنے خیالات کی تقویت پا رہی تھیں۔ اب ظاہر کی جوانمرگی نے تو صاعقہ کی نحوست کو ناقابل تلافی جیسے ثابت کرنا ناممکن تھا۔

ظاہر کی ناگہانی موت کا صدمہ ابھی جاں گسل تھا کہ کربلا نے کی گود سونی کر دی تھی۔ اس اندوہناک غم کو مٹانے کے لیئے معصوم روح کے ساتھ

اختیار کیا جاتا۔

صاعقہ ماں باپ کی شفقت سے محروم ہونے کے ساتھ گھر والوں کی نظرِ کرم سے بھی محروم ہو گئی۔ نظرِ کرم تو اس پر کبھی تھی ہی نہیں۔ لیکن اب تو کھلم کھلا اس پر ظلم و ستم کے تیر برسائے جاتے۔

صاعقہ کی ساری ہستی نحوست کے گھنیرے بادلوں میں روپوش ہو گئی۔ اور اس دن تو بادل اور گمبھیر ہو گئے جس دن طاہر کے ماموں زاد بھائی بجلی کے تاروں سے چھو جانے سے ہلاک ہو گئے۔ شومئی تقدیر صاعقہ کو اس دن پہلی بار سکول سے آیا ان کے ہاں لے کر گئی تھی۔

اب تو اسے تباہی کی علامت اور خطرے کا عنوان سمجھا جانے لگا۔ کوئی اسکی شکل دیکھنے تک کا روادار نہ تھا۔ بچوں کو اس کے سایہ سے یوں بچایا جاتا جیسے وہ خوفناک قسم کے زہریلے کیڑوں کا کوئی ایسی لہر ہو جو آناً فاناً ہر سامنے آنے والے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ یہ تو اسکی جان کی دشمن تھی۔ اپنے بچوں، بچیاں اور گل رخ کے ساتھ کبھی صاعقہ کو دیکھ لیتیں تو بیچاری معصوم بچی کی شامت آجاتی۔ وہ زناٹے کا تھپڑ پڑتا کہ وہ چکرا کر رہ جاتی۔ خوبصورت بالوں کو پکڑ کر وہ جھنجھوڑ ڈالتیں۔ اپنے بچوں کو انتہائی سختی سے منع کر دیتیں کہ وہ صاعقہ کے قریب نہ آئیں۔ یہ مخالفت ان کے ناپختہ ذہنوں میں صاعقہ کی نحوست کے گہرے نقوش کر دیتی۔ حسن آرا کا سلوک بھی ناروا تھا۔ اور جب سے بیوگی کے بعد وہ مستقل طور پر الحمراء میں آ کر رہنے لگی تھیں صاعقہ کے بچپن کے [illegible] آ گیا تھا۔

روسائی یونہی گزرتے [illegible] بڑھتی گئی۔ صاعقہ سے [illegible] مدخن تھی۔ پچھلے دنوں اس کا دوسرا لڑکا [illegible] آجانے سے دائیں ٹانگ [illegible] بیٹھا۔ آیا بدظن ہو گئی صاعقہ کو ایک [illegible] اور بیٹی کا بلتا ہوا نشان

سمجھنے لگی اس کی نگہداشت میں قسابل برتنے لگی۔

یہ تو صاعقہ کی خوش بختی تھی جو انھیں دنوں ڈاکٹر جینڈ کی آیا نے صاعقہ کا بار اپنے کندھوں پر اٹھانے کی پیش کش کی، ورنہ بعید نہ تھا کہ وہ بڑھیا اس ننھی سی بچی کا گلا گھونٹ دیتی۔ نئی آیا صاعقہ کے لئے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی دیکھنے میں وہ جتنی کہ یہ الملظر تھی، دل کی اتنی ہی حسین تھی، سوختہ چہرہ بھدا ہوا گوشت کھنچی ہوئی ایک آنکھ اور بائیں ٹانگ سے لنگڑا کر چلنے والی آیا شفقتوں کے امن پھیلائے آئی اور صاعقہ کی حیات کی ڈالواڈول کشتی کو سنبھالا دے دیا۔ اس نے اسے پیار دیا۔ پیار! پیار، جس سے محروم تھی، وہ اس کے لئے ماں باپ، دوست، سب کچھ بن گئی۔ اسکی جسمانی اور ذہنی نشو و نما کے لئے اس نے ان تھک کوششوں کے باب کھول دیئے۔ جلد ہی گھر والوں کا رویہ اور ماحول اس نے پرکھ لیا، دوسری خدمت گزاروں کی زبانی اس نے اس بچی سے وابستہ نحوست کے قصے بھی سنے۔ کنیزوں نے اسے ورغلایا لیکن اس نے کسی کی بات پر دھیان نہ دیا، صرف، صرف اسی بات کا خیال رکھا کہ صاعقہ اہل خانہ کی ظالمانہ دستبرد سے محفوظ رہے۔ لیکن۔ اس کی ساری کاوشوں کے باوجود صاعقہ گھر والوں کے لئے بدشگنی اور نحوست کا جلتا ہوا نشان تھی، جب بھی موقعہ ملتا اسے نفرت و حقارت کے تیروں سے چھلنی کرنے کی کوشش کی جاتی۔

آیا حتی المقدور اسے گھر والوں کی نظروں اور بچوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتی لیکن آخر صاعقہ بھی تو بچہ ہی تھی۔ پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ بچوں سے الگ تھلگ رہ سکتی تھی۔ کو بچوں سے ملنے جلنے کی اسے سخت کڑی سزائیں اتفاقاً کوئی دوڑتے ہوئے گر جاتا یا کھیلنے میں کسی کا پاؤں پھسل جاتا تو صاعقہ کے گھنگھریالے بال جھنجھوڑے جاتے۔ پھول سے رخساروں پر تھپڑ پڑتے اور وہ

بدیدہ آنکھوں سے اپنے اوپر اٹھنے والے ظالم ہاتھوں کو دیکھتی رہ جاتی۔ اس کا تصور کیا ہوتا، وہ بالکل سمجھ جاتی۔ ان ہی دنوں کی بات ہے۔

ریحان کی دسویں سالگرہ کا جشن تھا۔ یہ سالگرہ انتہائی کروفر کے ساتھ منائی جاتی۔ ریحان دادی کے چہیتے اور خاندان کے پہلے پوتے تھے۔ اس لیے جشن عظیم الشان ہوا کرتا تھا۔

حال مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بچے رنگ برنگ کے لباس پہنے تھے بڑوں نے بھی اپنے آپ کو سنوارنے میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ ہر فرد خوشی سے چمک رہا تھا رنگ و نور کا سیلاب امنڈا تھا جیسے خوشیوں اور مسرتوں کے سوتے پھوٹ پڑے ہوں۔ ریحان سفید کمخواب کی اچکن اور ٹوپی پہنے شہزادوں کی سی آن بان لیے میز کے قریب کیک کاٹنے کو کھڑا تھا۔ خاندان کے سبھی بچے خوشنما لباس پہنے اسکے گرد جمع تھے۔ کیک پر دس موم بتیاں روشن کی گئیں، چھری ریحان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فوزیہ آگے بڑھی۔ فوزیہ اب طاہر کے چھوٹے بھائی فخر سے بیاہی جا چکی تھی۔ اور مدت سالہ سمیرا اس کی شادی کا ثمر تھی۔

صاعقہ بھی اس جگمگاتے میں گلابی فراک پہنے موجود تھی، کیک پر جلتی شمعیں دیکھ کر چار سالہ صاعقہ ریحان کے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی، جانے کے جگہ بنا کر ریحان کے دائیں طرف آ کھڑی ہوئی۔

شور و غل بھاڑ سے اور گھما گھمی میں اس پر کسی گھر والے کی نظر ہی نہ پڑی ورنہ ایسے مبارک موقعہ پر تو اسے حتی المقدور نظروں سے اوجھل رکھا جاتا تھا۔

"بسم اللہ پڑھ کر شمع کو پھونک مار دو۔" فوزیہ ریحان سے بولی۔

"ہاں! ہاں بسم اللہ کرو۔ بسم اللہ۔" کئی مسرور آوازیں آئیں۔

"پھونک مار دو دادی نے کہا۔

لیکن ریحان کے پھونک مارنے سے پہلے صاعقہ نے پھونک ماردی۔
دو شمعیں گل ہو گئیں۔ ریحان چیخ پڑا۔
"یہ کس نے پھونک ماری؟" دو تین آوازیں بیک وقت آئیں۔
"میں نے ۔۔۔ میں نے" معصوم صاعقہ نے تالیاں بجاتے ہوئے سرور انداز میں کہا۔
"چڑیل" سعدیہ بھوکی شیرنی کی طرح اس کی طرف لپکی۔
"تو کہاں سے آگئی یہاں" پلٹ کر فوزیہ نے کندھے سے جھٹک کر پرے پٹخ دیا۔ صاعقہ اوندھے منہ گری۔ وہ بے اختیار رونے لگی۔
دادی حسن بانو مشتعل ہو کر اسے کوسنے لگیں۔ حسن آرا نے ڈائن کے نقب سے نوازا۔ بھائی کے دل اس بے دردی پر دہل گئے کسی نے بڑھ کر صاعقہ کو اٹھایا۔ چمکارا۔
"چھوڑ دو جی اسے ۔۔۔ منحوس جانے کہاں سے آگئی یہاں۔ ڈائن ہے ڈائن ۔۔۔ چل ادھر سے دفع ہو جا۔ کہاں سے دس کی آیا ۔۔۔ کمبخت کے عین موقعہ پر اسے یہاں بھیج دیا ۔۔۔ دو شمعیں گل کر دیں۔
"میرا تو دل دھک سے رہ گیا ہے۔
"اللہ خیر کرے میرے بچے کی"
"صدقہ اتار دو لڑکے کا"
"بد بخت جانے کس وقت یہاں آ پہونچی"
"ڈائن ۔۔۔"
"چڑیل ۔۔۔"
"جی چاہتا ہے گلا گھونٹ دوں"

دو ساری خوشی کرکری کر دی۔

گھر کا ہر فرد صاعقہ کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔ کچھ تو ہم پرست مہان خود بھی ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں لیکن پڑھے لکھے اور روشن دماغ لوگ اس توہم پرستی پر مسکرا دیئے تھے، غریب بچی کے ساتھ بہیمانہ سلوک دیکھ کر وہ ششدر سے بھی تھے۔ اپنا ہی خون اتنا بیگانہ ہے۔ یہ عجیب کی بات تو تھی ہی۔

صاعقہ کے شمع گل کرنے سے اچھا خاصا ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ انجم آرا اور فخر چچا اس کی حمایت میں سب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فخر چچا تو اپنی فونہ یہ کی ناسپاسی کے ڈر کی وجہ سے کچھ کہہ نہ پائے۔ ہاں انجم آرا نے خوب خوب سنائیں۔

کافی دیر کے بعد ہنگامہ فرو ہوا۔ آیا کی خوب شامت آئی، وہ بچی کو سینے سے لگا کر باہر لے گئی۔ اور پھر رات تک کسی نے صاعقہ کو بچوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔

چھوٹے بڑے کئی واقعات اپنی لپیٹ میں لئے ماہ و سال گزرتے رہے صاعقہ کا شعور بیدار ہوتا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں نکھرنے لگیں، ماحول کو بہ کفایت گیا وہ خود ہی سب سے الگ تھلگ رہنے لگی۔ اداس۔ خاموش تنہا۔ وقت گزرتا گیا۔

الحمراء کی چھتوں، تلے کھیلنے والے بچے چند سالوں کے پلٹے میں جوانی کی رنگین حدود میں داخل ہو گئے۔ ریحانہ، اسرار، فرخ نعیم، ماہ رخ، گل رخ، سمیرا، صاعقہ، شاہدہ، ثمینہ۔ سبھی چہار دانگ شباب کے نور خرد کھول رہے تھے۔ ان گلہائے رنگین سے الحمراء مہک رہا تھا۔ خوش رنگ پھول بے بیل بوٹوں کے سہارے بھی دو صوفے لئے تھے۔ ریحانہ سمیرا، دلچسپی لیتے اسرار گل رخ کے ساتھ اکثر نظر آتے فرخ نعیمہ کے بغیر کسی کھیل میں حصہ نہ لیتے۔ نعیم شاہدہ کے گرد منڈلاتے رہتے۔

صاعقہ پر کسی کی نظرِ کرم نہ پڑی تھی، شروع ہی سے بچوں کے ذہن مسموم کر دیئے گئے تھے۔ وہ اب تک صاعقہ سے مبہم سا خوف کھاتے تھے۔ تنفر بھی اپنی جگہ مضبوط بن چکا تھا، اسے کوئی در خورِ اعتنا ہی نہ سمجھتا تھا۔ نگاہِ لطف و کرم تو بڑی بات تھی۔

وہ اکثر سب سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ کبھی کبھار سب سے مل بیٹھتا ہوتا بھی تو ہمیشہ انجام بدمزگی ہوتا — یا تو اس کے ساتھ اہانت آمیز سلوک ہوتا یا کھلم کھلا اسکی نحوست کا قصہ دہرایا جاتا — وہ شکستہ دل ہو کر اٹھ جاتی۔ کوئی اس کے دل میں جھانک کر زخموں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ کوئی اس کے جلتے ہوئے سینے میں آگ کی تپش محسوس کرنے کی پرواہ نہ کرتا۔ وہ اپنے کمرے میں گھٹی گھٹی آہیں بھرتی رہتی۔ یا ندی کے پانی میں ڈوبے ہوئے پتھر پر پاؤں لٹکائے اپنی زندگی کے ماضی پر غور کرتی رہتی۔ اور جب سے ناوابستگی میں اس کے احمق دل نے ریحان کی پوجا شروع کر دی تھی۔ زندگی اس کے لئے اور بھی بوجھل ہو گئی تھی، احساسات کے آبگینے کچھ اور بھی نازک ہو گئے تھے۔ ریحان ہی تو اس کی ذات سے زیادہ خائف و متنفر تھے۔ اور یونہی بیس سال گزر گئے — پورے بیس سال۔

الحمراء کے عقبی چمن میں بیڈمنٹن کھیلا جا رہا تھا۔ فرخ اور گل رخ سمیرا اور ریحان کے مقابل تھے۔ باقی نوجوان کی پارٹی، داد دینے اور شور و غل سے کھیل کا حسن دوبالا کرنے میں مصروف تھی۔ موسم انتہائی خوشگوار اور صحن چمن

میں ان جیتے جاگتے پھولوں سے بہار نکھری ہوئی تھی۔ سمیرا اور ریحان برابر جیت رہے تھے، گل رخ اور فرخ جھنجھلا رہے تھے، دیکھنے والے آوازیں بھی کس رہے تھے ان پر۔ جھنجھلاہٹ حق بجانب تو تھی۔

"پہلے کھیلنا سیکھو۔ پھر ہمارے مقابلہ میں آنا۔" ریحان نے چوٹ کی گل رخ فرخ سے الجھ پڑی۔ "ٹھیک طرح سے کھیلیں نا۔ نہیں تو بیٹ کسی اور کو دے دیں۔"

"کھیلنا خود نہیں آتا۔ دوش مجھے دیتی ہو۔ اس دفعہ گیم جیتے جیتے رہ گئی، محض تمہاری وجہ سے۔"

گل رخ نے غصہ سے ریکٹ پھینک دیا۔

"بس ہار گئیں؟ غصہ میں ہار چھپانا چاہتی ہیں۔"

"لیکن ایسے کون چھوڑے گا۔ بزدلوں کی طرح میدان نہ چھوڑو۔"

"ریکٹ سنبھالو۔"

"مقابلہ کر کے دکھاؤ۔"

گل رخ نے پھر ریکٹ اٹھایا۔ سب اسے اشتعال جو دلا رہے تھے فرخ بڑبڑاتے ہوئے اپنی جگہ پر آئے۔ کھیل شروع ہوا۔ ریحان شوخ شوخ فقرے کس رہے تھے گل رخ سٹپٹا رہی تھی۔ غصے میں وہ تیز تیز کھیل رہی تھی سمیرا اور ریحان مشتاق تھے۔ گل رخ کا ہر وار بچا رہے تھے کھیل بہت زوروں پر تھا ایک وار بچاتے بچاتے سمیرا کا پاؤں الٹ گیا۔

"آہ" وہ گر گئی۔

سب اس کی طرف دوڑے۔ ریحان نے ریکٹ پھینک دیا، اور جلدی سے اس کی طرف دوڑے۔

"کیسے گریں؟"

"چوٹ تو نہیں آئی؟"

"گلرخ نے پوچھا عادی ہو گی۔"

"موچ نہ آئی ہو۔"

"اس طرح لپکنے کی کیا ضرورت تھی؟"

سب کیمرا کے گرد جمع تھے۔ کوئی کھڑا تھا۔ کوئی گھٹنوں کے بل جھکا تھا وہ درمیان میں گھری اپنے داہنے پاؤں کو ہلا رہی تھی۔

شاہدہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

"اوئی ——" وہ کچھ اٹھی لیکن پھر بیٹھ کر پیر کو پکڑ لیا۔

"دو قدم چلو —— کہیں موچ نہ آگئی ہو ——" ریحان نے پاؤں دباتے ہوئے کہا۔ کیمرا نے جلدی سے پاؤں کھینچ لیا۔

"اٹھو نا" فرخ نے کہا۔

شاہدہ اور گلرخ نے مل کر اسے اٹھایا۔ لیکن پاؤں پر دباؤ نہ ڈال سکی۔

"دو قدم چلو نا۔

"نہیں چلا جاتا"

"معمولی بات ہے، چوٹ وٹ کچھ نہیں آئی"

"ہونہہ۔ اتنا درد ہو رہا ہے —— پاؤں زمین پر رکھا ہی نہیں جاتا"

"یہیں کھڑی رہو گی۔ اس بنچ تک تو چلو —— شاہدہ نے کہا۔

"نہیں چلا جاتا —— نہیں چلا جاتا —— نہیں ——" جھنجھلا کر چیخی۔

"واقعی موچ نہ آگئی ہو ——" فرخ نے جھک کر اس کے پیر کو ٹٹولا۔

"کسی ڈاکٹر سے جا کر ہی کوئی چارہ ہو گا"

ڈاکٹر کو دکھا دیں۔"

"ضرور۔"

"کمرے تک تو چلنا پڑے گا۔"

"لیکن وہ تو پاؤں زمین سے لگا ہی نہیں رہیں ہیں۔"

"میں اٹھا کر لے چلوں۔" اسد نے پیش کش کی۔

سمیرا لجا گئی۔

"میرے بازو پر ہاتھ ڈال لو۔ میں لے چلوں گا۔" ریحان نے بازو بڑھایا سمیرا شرما گئی۔

"اوہو۔"

ریحان نے بازو سمیٹ لیا۔

"کوئی اور تدبیر کریں۔"

"یہ لیجئے۔" فرخ نے بڑھ کر سمیرا کو اٹھایا اور اس کے احتجاج کے باوجود اٹھا کر کمرے میں لے گئے۔ سمیرا کے گرنے کی خبر سن کر سب اس کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ سب یوں تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ جیسے کوئی بہت ہی بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ سمیرا کا معاملہ تھا نا؟ لاڈلی جو تھی گھر بھر کی۔

"صبح بھی غسل خانے میں پاؤں پھسلا تھا۔" سمیرا ناز و ادا دکھاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"دوسری بار گری ہو؟" دادی نے پوچھا۔

"جی۔"

"اللہ جانے کس کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی صبح۔" فوزیہ نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"صاعقہ کا۔" ریحان نے مسخرا اڑایا۔

"واقعی؟" سمیرا نے پوچھا۔

"ہاں۔" سمیرا اٹھلائی۔

صاعقہ دادی اور چچی کے خوف سے سمیرا کو دیکھنے آئی تھی۔ ریحان کا تمسخر سن کر ان کی روح تک جل اٹھی۔ موقع پاتے ہی وہاں سے کھسک گئی ریحان نے اسے دیکھا تھا۔ لیکن اپنے الفاظ سے ندامت محسوس کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی۔ اور۔ اس رات نوجوان پارٹی سمیرا کے کمرے میں جمع تھی۔ باؤں میں موچ تو نہ آئی تھی۔ اپنے ہی بوجھ سے دب گیا تھا۔ اللہ جانے اس دن سمیرا واقعی صاعقہ کا تھن دیکھ کر اٹھی تھی یا اس واہمے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے بات بنائی تھی۔ اس وقت بھی زیر بحث موضوع صاعقہ کی نحوست ہی تھا۔

سمیرا اور ریحان سے متفق ثابت کرنے میں پیش پیش تھے۔ اکثریت ان کی ہمنوا تھی۔ لیکن اسد صاعقہ کے طرفدار تھے شاید اپنی والدہ انجم آرا کی تربیت کا اثر تھا۔ یا کچھ خوف خدا تھا دل میں۔ یا ہو سکتا ہے۔ یہ وجہ ہو کہ انکے بچپن کا زیادہ حصہ ننھیال سے باہر گذرا تھا۔ وہ اکثر اپنے ساتھیوں کی تنگ نظری پر انھیں برا بھلا کہا کرتے تھے۔ صاعقہ سے انھیں ہمدردی تھی اور دن بدن یہ ہمدردی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ شاہد، نعیم اور زید بھی ان کے ہمنوا بنتے جا رہے تھے۔ لیکن سمیرا اور ریحان انکی سرزنش سے اور بھڑکاتے تھے۔

"یہ سب توہم پرستی ہے ——" اسد نے تنگ آکر کہا۔

"توہم پرستی کیسی۔ واقعات شاہد ہیں ——" ریحان نے جلدی سے کہا۔

"جس دن پیدا ہوئی۔ اسی دن دادا جان فوت ہو گئے۔"

گل رخ نے واقعہ دہرایا۔

"یہ محض اتفاق تھا۔ وہ بیمار تو ایک عرصہ سے تھے" اسد نے جواب دیا۔
"کوئی ایک بات تھوڑا ہی ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد پھوپھا جان کا ہوائی حادثے میں انتقال ہو گیا۔"
"یہ بھی صاعقہ کا قصور ہوا۔؟" اسد نے طنزیہ کہا۔
"روئی کے گوداموں میں آگ لگ جانے سے کئی لاکھ کا نقصان تو ہوا تھا اور پھر ظاہر ہے۔؟"
"یہ اور بھی صاعقہ کی وجہ سے؟"
"تو اور کیا۔ جب سے پیدا ہوئی ہے نحوست ہی نحوست برسائی ہے۔"
"حد ہو گئی تو ہم پرستی کی۔ اسد بولے "حیران ہوں کہ آپ سب پڑھ لکھ کر بھی ایسی باتیں کرتے۔ نانا ابا فوت ہو گئے قصور صاعقہ کا۔ خالو جان کو ہوائی حادثہ پیش آیا۔ مورد عتاب صاعقہ۔ روئی کے گوداموں میں آگ لگ گئی الزام صاعقہ پر۔"
"جو کچھ بھی ہے۔ ہے تو حقیقت۔ اس کی پیدائش سے لیکر اب تک سیکڑوں کیا ہزاروں سانحے گذر چکے ہیں۔"
ریحان تفصیلاً ان سانحوں کو دہرانے لگے۔
"ایک بات پوچھوں۔؟" اسد نے ریحان کی بات کاٹ کر کہا۔
"ہوں۔!"
"ان بیس اکیس سالوں میں سانحے ہی سانحے ہوتے رہے؟"
"کیا مطلب؟"
"الحمد للہ میں کسی خوشی۔ کسی قوشگوار واقعہ نے جنم نہیں لیا؟"
"کیوں نہیں۔"

"جب یہاں خوشیوں کے سوتے پھوٹے۔ اس وقت صاعقہ کی نحوست اثر انداز کیوں نہ ہوئی۔ شیخ پور والی آراضی، کا فیصلہ بھی تو نانا جان کے مرنے کے صرف ایک ماہ بعد ہوا تھا۔ صاعقہ ان دنوں اسی فضا میں سانس لے رہی تھی، جاگیر کے سارے جھگڑے بھی تو سال بعد طے ہو گئے تھے۔ اور پھر باغوں سے کتنا منافع ہوا تھا، اور بڑے ماموں جان کا کاروبار کب چمکا تھا۔ یہ بات بھی تو صاعقہ کے ہوتے ہی ہوئی تھی۔ اور ۔۔۔!"

اسد نے ایک لمبی چوڑی فہرست واقعات بیان کر دی۔ ریحان دل میں معترف تو ہوئے لیکن زبان سے اعتراف کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرتے تھے بچپن ہی سے احساس کی آنچ ذہنوں کو اس طرح دی گئی تھی کہ اسکا اثر دل بدن پختہ ہوتا چلا گیا تھا۔ اسد کے دلائل سے متفق ہونے کے باوجود اس بات کو ماننے کے لئے ریحان اور ان کے حواری تیار نہ تھے۔

"آپ جو کچھ بھی کہیں ہم تو اپنے تجربات کی بنا پر اس حقیقت کو ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ مجسم نحوست ہے۔" سمیرا پلنگ پر لیٹے لیٹے بولی۔

"جس دن صبح ہی صبح اس سے سامنا ہو جائے سارا دن پریشانی میں گزر جاتا ہے۔" فرخ بولے۔

"واقعی ۔۔۔ میں تو شومئی تقدیر سے جس دن اسے صبح ہی صبح دیکھ لوں بس سارا دن طبیعت بدمزہ رہتی ہے، دل میں دھڑکا سا رہتا ہے کہ اب کوئی سانحہ پیش آیا۔!" ریحان بولے۔

"یہ سب تمھارے ذہن کی پیداوار ہے۔ سوچنے کے ڈھنگ بدلو تو کچھ بھی نہ ہو گا۔" ریحان ہنس دیا۔

"ہنسنے کی بات نہیں ریحان ۔ ذرا اس کی جگہ اپنے آپ کو رکھ کر سوچو

کس قدر ناروا سلوک ہوتا ہے بیچاری لڑکی سے کتنی اداس رہتی ہے کیا
اسکے سینے میں دل نہیں۔ دل میں جینے کا ولولہ نہیں اتنے بھرے کنبہ میں تنہا ہے"
"اس کی تنہائیاں میرے دوست" ریحان نے از راہ تمسخر اسد کے گلے
میں باہیں ڈال کر کہا۔
سب نے ملا جلا قہقہہ لگایا۔
"اس کی اداسیاں مٹا دو ـــــ خاموشیوں کا طلسم توڑ دو ـــــ
کہو ـــــ منظور ہے ـــــ"
اسد چپ ہو گئے۔ سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ گل رخ سے بچپن سے
ہی متاثر تھے۔ اور اب تو گل رخ زندگی میں بہار بن کر چھا رہی تھی۔ اسد
نے صاعقہ کے متعلق اس رنگ میں کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس سے ہمدردی ضرور
تھی لیکن ہمدردی محبت کی اساس نہ تھی۔
"چپ کیوں ہو گئے استاد" ریحان نے پھر چھیڑا۔
"بڑی حمایت کر رہے تھے نا" فرخ نے چوٹ کی۔
"میں تو ایک حقیقت کو آپ سب کے ذہنوں سے روشناس کرانے
کی کوشش کر رہا تھا۔ بات کا رخ آپ سب نے غلط طرف پھیر دیا"
اسد خفیف سے ہو رہے تھے۔
"حقیقت، ہم سب جانتے ہیں۔ اس کی پیدائش سے لیکر کئی" ریحان
جوش میں آکر بولے۔ لیکن اسد نے بات کاٹ دی۔
"سب محض اتفاق ہے ریحان۔ اور کچھ نہیں۔ صاعقہ اگر پیدا نہ ہوتی
تو نانا ابا کو موت نہ آتی۔ یا وہ فضائی حادثہ رک جاتا ـــ یا ـــ"
"یہ تو میں نہیں جانتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ ازلی نحوس ہے"

"صاعقہ کی پیدائش کے بعد پیدائش کا سلسلہ بند تو نہ ہو گیا تھا۔ صرف دو سال بعد سمیرا تولد ہوئی تھیں۔ ثمینہ اس سے تقریباً تین سال چھوٹی ہیں عامر چار سال اور باقر سات سال چھوٹا ہے۔ حیران ہوں کہ پے در پے جو واقعات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ انھیں صاعقہ ہی کی ذات سے کیوں منسوب کیا گیا باقی کسی کا اس ضمن میں کیوں نام نہیں لیا جاتا۔ حالاں کہ امی نے بتایا ہے کہ جب الحمراء کے پچھلے کمرے کی چھت گرنے سے ممانی جان کے کولھے کو ضرب آئی تھی۔ ان دنوں سمیرا چند دنوں کی تھیں جب نانی جان کی بہن فوت ہوئیں عامر دو ماہ کے تھے۔

اسد نے کچھ ایک لمبی تفصیل گنوا دی۔ سب چپ سے ہو گئے۔ کافی متاثر بھی نظر آ رہے تھے۔ محفل کا رنگ بدلتا دیکھ کر فرخ بولے "ہم سیدھی سادی بات جانتے ہیں قصور اس بیچاری کا نہیں۔ اس کا نام رکھنے والوں کا ہے صاعقہ" وہ ہنسے۔

"بجلی" سمیرا نے طنزیہ چوٹ کی۔

"واقعی — میں تو جب اسے دیکھتا ہوں، رگ و پے میں سنسناہٹ سی ہونے لگتی ہے" فرخ نے جسم کو سکیڑ کر اس انداز سے ڈھیلا چھوڑا کہ سب ہنسنے لگی۔

"دیکھو تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ بجلی کی لہر سی چلی آ رہی ہے" ریحان نے کہا "جھنجھلاہٹ سے ہونے لگتی ہے۔ نہ دیکھتے ہی صبح صبح دیکھ لیں تو دن بدمزگی میں گزرتا ہے"

طنز و تمسخر کے تیر برسائے گئے۔ اسد نے بڑی کاوش سے جو حقیقت منوانے کے لئے میدان ہموار کیا تھا۔ سب نقش بر آب ثابت ہوا۔ داغدار ذہنوں

کو منٹوں میں صاف کر دینا ممکن کہاں تھا۔

کمرے کے اندر قہقہے برسا رہے تھے۔ طنز و تمسخر سے طبیعتوں کو نکھارا جا رہا تھا۔ اور کھڑکی سے لگی کوئی اداس روح ان تیروں سے گھائل ہو رہی تھی۔ صاعقہ سب کچھ سن رہی تھی۔ کسی سے گلہ نہ تھا اسے۔ ہاں۔ ریحان کی زبانی اپنے متعلق ایسے کلمات سن کر اس کی مضطرب روح تڑپ اٹھی تھی کاش وہ اس برآمدے سے گزرنے کی بجائے دوسری طرف سے اپنے کمرے میں چلی گئی ہوتی۔

سارا تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ پھر بھی آنکھوں میں امنڈنے والے ساون بھادوں کے بادل برستے ہی جا رہے تھے۔ حسین سیاہ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ دیر سے رو رہی تھی۔ کانوں میں پگھلتے ہوئے گرم گرم سیسے کی طرح فوزیہ کے الفاظ ابھی ٹپک رہے تھے۔

"ماں تو ساری عمر گھڑے اٹھاتی مر گئی۔ بیٹی نازک ہے کہ چائے کی پیالی نہیں اٹھائی جاتی۔"

کتنا بڑا طعنہ دیا۔ فوزیہ بچی نے ــــ سب کی موجودگی میں ــــ سب کے سامنے اس کی کتنی بے عزتی ہوئی تھی۔ صاعقہ کا خون ایک دم اس طرح کھول اٹھا تھا کہ چند لمحے اگر یہی کیفیت رہتی تو اسکی دماغی نسیں یقیناً پھٹ جاتیں اس طعنے پر سرزنش کرنے کی بجائے سب کے چہروں پر تمسخرانہ مسکراہٹ بھی تو پھیل گئی تھی۔ اُف وہ جلتی ہوئی طنزیہ مسکراہٹ صاعقہ اس زہر آلود

بھری مسکراہٹ سے اپنی روح میں شگاف محسوس کر رہی تھی۔ کاش ماں باپ کے ساتھ اسے بھی موت آگئی ہو۔ اس روز کی موت کا سامنا کتنا دشوار تھا۔ اس جلتے ہوئے جہنم میں رہتے ہوئے وہ تنگ آچکی تھی۔ بیرحم بابیر، اہانت آمیز سلوک! آخر وہ بھی تو انسان تھی۔ گوشت پوست کی بنی ہوئی سینے میں دل بھی تھا جو احساسات کی آنچ رکھتا تھا۔

آج فوزیہ چچی نے کس طرح اس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔ کوئی ہمدرد تو تھا جو ان زخموں پر پھاہا رکھ دیتا۔ اگر کسی نے دل میں کسک بھی محسوس کی ہوتی تو دادی کی موجودگی میں اظہار ہمدردی کی جرأت نہ ہو سکی۔ آج سہ پہر کا ہی تو واقعہ تھا۔ دادی اماں کے حکم پر جائے بیرون چمن میں پی گئی تھی۔ موسم برسات حد تک حسین تھا۔ پچھلے پہر کی زرد دھوپ آسمان پر تیرتے ہوئے بادلوں کی وجہ سے بدبیار کی نظر آتی تھی۔ نصیحل۔ کجیف۔ کمزور۔ دھوپ بڑی دلکش تھی۔ درختوں کی چھاؤں تلے چائے کی میز پر سجی کھیں، کنیزیں چائے کی کشتیاں لا کر رکھ گئی تھیں، ایک طرف دادی حسن بانو کے قریب سعدیہ، فوزیہ اور حسن بیٹھی تھیں۔ ذرا ہٹ کر کین کی رنگ برنگ کرسیوں پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سبھی نے شوخ رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جو موسم اور چمن کی مناسبت سے دلکش نظر آرہے تھے۔ اسکا حسین چہرہ نکھرا نکھرا سا تھا۔ باقی لڑکیوں نے رنگ برنگ لباس زیب تن کیے ہوئے تھے۔ شوخ شوخ بھڑکیلے لہنگوں کے دیدہ زیب کھیلاؤ اور رنگین آنچلوں کی ہلکی سرکتی اڑانیں چمن کی فضا کو فردوسی تاثر بخش رہی تھی۔ سفید لباس میں صاعقہ بھی ایک کرسی میں بیٹھی تھی۔ اس کا ملکوتی حسن ایک انفرادی کشش لئے ہوئے تھا چہرے پھیلی ہوئی دائمی اداسیاں بادلوں کی ہلکی سی تہہ کی طرح تھیں جو ڈھلتے چاند

پر چھا کر اس کی دلکشی میں اور اضافے کا باعث بن جاتی ہیں۔ سلگتا ہوا حسن بھی قیامت اٹھا سکتا تھا۔ لیکن کسی کو اس کی طرف دھیان نہ دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ سمیرا کے گرد سب منڈلا رہے تھے اسے بھلا کون پوچھتا بیباک ہنسیاں دادی حسن بانو سے مرعوب تھیں۔ لڑکیوں کے خواہ نخواہ شرمانے پر انھیں غصہ جو آجاتا تھا۔

چائے بنانے کی ذمہ داری صاعقہ پر آئی۔ دادی نے حکم دیا تھا۔ اور اس حکم سے سرتابی کی اسے مجال کہاں تھی۔

اس نے چائے بنائی۔ ثمینہ نے بڑھ کر اسکا ہاتھ بٹایا۔ وہی تو تھی جو دل میں صاعقہ کیلئے اکثر ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا کرتی تھی۔ بڑوں کو چائے دینے کے بعد صاعقہ نے نوجوان پارٹی کی طرف رجوع کیا۔ نعیم، فریدہ، گل رخ اور فرخ کو پیالیاں دینے کے بعد وہ پیالی لئے سمیرا کی طرف بڑھی۔ شوخ رنگ کو سبزے پر پھیلائے سمیرا اک ساختہ شان دلربائی سے کرسی پر نیم دراز تھی صاعقہ نے پیالی بڑھائی۔ سمیرا نے اسی انداز میں بیٹھے بیٹھے اک شان استغنا سے ہاتھ بڑھایا۔ صاعقہ سے بری طرح پیش آنے اور اہانت آمیز سلوک کرنے میں سمیرا نے ہمیشہ پیش قدمی کی تھی۔ شاید ماں کی تربیت کا اثر تھا۔ یا دادی کے لاڈ پیار کا۔ یا اپنی ذات میں ریحان کی دلچسپی کا۔ بہرحال وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتی تھی، بہت کچھ۔ صاعقہ کی اسکی نظروں میں کیا وقعت ہو سکتی تھی۔ مفرور کی لڑکی صاعقہ سے سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ صاعقہ نے پیالی اور آگے بڑھائی۔ سمیرا نے نازک ہاتھ اور نزاکت سے بڑھایا۔ اور عین اسی وقت ریحان مسکراتے ہوئے درختوں کے عقب سے یوں نکلے جیسے بھیڑیا دلوں کے بیچ سے بچہ جانے کے بعد صیاد کا تر نکل آیا ہو۔ سمیرا ان

صاعقہ کی بیک وقت نگاہ ان پر پڑی۔

صاعقہ کی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ ریحان نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ ان کے لبوں کا تبسم کچھ اور گہرا ہو گیا۔ اور جانے سمیرا اس تبسم سے لہرائی یا صاعقہ نگاہوں کی بے درد بیگانگی سے کانپی۔ پیالی پکڑتے پکڑاتے کے درمیان الٹ گئی۔ گرم گرم چائے صاعقہ کا ہاتھ جلاتی سمیرا کے ہاتھ پر گری اور پیالی لہنگے کے پھیلاؤ پر پھسلتی گھاس پر جا گری۔

"آہ!" سمیرا تڑپ کر چیخی۔

"اُف!" اک ہلکی سی چیخ صاعقہ کے ہونٹوں پر تھرائی۔

ریحان لپکے "ماہ رخ دوڑی۔ نعیم بڑھے"

کیا ہوا۔ کیسے گری چائے۔ کئی زبانیں تھیں استفسار کر رہی تھیں۔ چند لمحوں کے بعد سارا ہجوم سمیرا اور صاعقہ کے گرد تھا۔

ریحان سمیرا کا نرم و گداز ہاتھ اپنے رومال سے پونچھ رہے تھے۔ سمیرا ضرورت سے زیادہ ہائے وائے کر رہی تھی۔

صاعقہ کا ہاتھ جل گیا تھا۔ لیکن وہ دم بخود تھی، دوسرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ سہلاتے ہوئے وہ اپنی تکلیف کو چھپانے کی کوشش میں تھی۔

"کیسے گرائی تھی چائے؟" فوزیہ بیٹی کا ہاتھ دیکھ کر بپھری۔

"اتنی بد احتیاطی ——!" سعدیہ بولی۔

"وہ خود کہیں ہوتی ہیں —— دماغ کہیں —— ان سے چائے بنوانے کی ضرورت کیا ہی تھی۔" ریحان سمیرا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے غصے سے بولے۔

"ایسی لڑکی سے کبھی ڈھنگ کا کام نہ ہو گا۔"

"جو بھی کام کرے گی عجب لاپرواہی سے۔"

"نزاکت تو دیکھو۔ اتنی سی پیالی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔
"جان بوجھ کر گرائی ہوگی۔ دادی چمیاں اور بھی زہر کے تیر برسا رہی تھیں۔ صاعقہ سب کے درمیان اس مجرم کی طرح کھڑی تھی جسے موقعہ واردات پر ہی پکڑ لیا ہو۔
"دیکھو ہاتھ پر آبلے تو نہیں پڑ گئے" سعدیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"دوائی لگا دو"
"جاؤ ریحان دیکھ کیا رہے ہو۔ دوائی لگا دو۔ کہیں آبلے نہ پڑ جائیں۔
ریحان دوائی لینے چلے گئے۔ طنز کے تیر برسانے لگے۔
"اس کا اپنا ہاتھ بھی تو جل گیا ہے" عقیلہ نہ رہ سکی۔
"دکھاؤ تو ــــ شاہدہ نے کہا۔
لیکن صاعقہ اسی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے کو دبائے گنگ سی کھڑی رہی۔ البتہ اتنے مجمع میں۔ بے رحم ہجوم میں عقیلہ اور شاہدہ کی ہمدردی سے اس کا دل بری طرح بھر آیا۔
آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح اس کے صبیح و ملیح رخساروں پر پھسلنے لگے"
رونا بھی تو بڑی جلدی آجاتا ہے" ایک تو قصور کیا۔ اس پر آنسو سعدیہ نے
اک بھوں چڑھائی۔ ریحان دوائی لے آئے۔ روئی سے سمیرا کے ہاتھ پر لگا دی۔
"یہاں بازو پر بھی لگا دو ــــ" فوزیہ نے کہا۔ اور پھر بڑائی۔
"سارا داغ پڑ جائے گا۔ کمبخت نے گرائی کیسے ــــ اتنی نازک
اندام ہے۔ ماں تو ساری عمر گھڑے اٹھاتے مر گئی"۔ بیٹی اتنی نازک ہے
پیالے کی پیالی اٹھائی نہیں جاتی۔
صاعقہ کا خون اس طنز سے کھول اٹھا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک نظر اس نے

اپنے گرد پیش ڈالی ـــــ فوزیہ کے طنز پر تقریباً سبھی چہرے مسکرا اٹھے تھے
"اف" اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

یہ تحقیر۔ یہ تذلیل۔ کانوں پر ہاتھ رکھ وہ ایک دم پلٹی ـ اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ جب سے اب تک رو رہی تھی۔ آپا نے اپنے پیار کی شفقتوں سے کئی بار اسے چپ کرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ اتنا بڑا طعنہ، اور وہ بھی ریحان کی موجودگی میں وہ کیوں برداشت کر لیتی۔ نفسیاتی عوامل و عقائد کیسے برداشت کر لیتا وہ رو رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ ساری زندگی آنسو بن کر ختم ہو جانا چاہتی تھی شاید۔ ہاتھ کی جلن سے کہیں زیادہ اس کے سینے میں جلن تھی اسکی روح میں جلن تھی۔ آہ بیچاری ـــــ مظلوم سی لڑکی ـــــ

شوخ رنگ پھول اور لچکیلی شرمیلی کلیاں حسن بانو کی پھلواری میں مہک رہی تھیں۔ بہار جوبن پر تھی۔ حسن بانو کو اس پھوٹتے جوبن کا پوری طرح احساس تھا اس لئے چاہتی تھیں کہ رنگ و بو کی مناسبت سے پھولوں اور کلیوں کی ابدی بندھن میں باندھ دیں؟!..... انجم آرا بھی اسی سلسلے میں ان دنوں آئی ہوئی تھی۔

حسن بانو کی نشست گاہ میں رازدارانہ محفلیں منعقد تھی حسن بانو کسی مطلق العنان فرمانروا کی طرح ایک تمکنت سے مسند پر بیٹھی تھیں۔ دائیں طرف حسن آرا اور دوسری طرف سامنے فوزیہ بیٹھی تھی اور تکیے پر کہنی ٹکائے انجم آرا ان کے

قریب تر تھیں۔ رشتوں، ناطوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کئی پچھلے قصے جگائے جا رہے تھے۔ شادیوں کی دھوم دھام کا تذکرہ تھا۔ تقدیروں کے فیصلے ہو چکے تھے۔ اب صرف حسن بانو کی مہر ثبت ہونا تھی بچوں کے رجحان کو مدنظر رکھتے ہوئے گرہیں لگائی جا رہی تھیں۔

"گل رخ تو میری بیٹی ہے" وہ اسد کے لئے انجم آرا نے مانگ لی۔

"نعیم اور شاہدہ کی جوڑی ماشاءاللہ خوب رہے گی" میں نے تو پیدا ہوتے یہ نسبت کر دی تھی۔ شکر ہے اللہ کا، میرا خیال کامیاب نکلا" حسن بانو بڑی تمکنت سے بولیں۔

"امی جان"

حسن آرا نے شوخ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"ہوں"

"آپ نے اپنے لاڈلے کے متعلق تو کچھ فرمایا ہی نہیں"

"ریحان کے متعلق"

"جی"

"وہ تو طے شدہ بات ہے"

"کس سے؟"

"اب بنتی کس لئے ہو۔ میرا اور ریحان کا جوڑا ماشاءاللہ لاکھوں میں ایک ہوگا"

"ماشاءاللہ، ماشاءاللہ پچیس سال کے بھی ہو چکے۔ اسی سال کار خیر سے فارغ ہو جانا چاہیئے۔

"انشاءاللہ اس عید پر ان کی منگنی کا باقاعدہ اعلان کر دیا جائے گا۔

"ایک نیتھ دو کاج"

"وہ کیوں ــــ"

"وہ عید کے جشن پر"

"توبہ کرو۔ اپنے بچے کی منگنی کا وہ شاندار جشن منائوں گی کہ سب یاد کرینگے ــــ عید پر میرا مطلب تھا اس چاند میں ــــ"

"تو یہ بات ہے ــــ"

"ہونا ہی چاہیئے"

"خاندان کے پہلے پوتے ہیں"

"اور دادی کے نور نظر بھی ــــ"

ریحان کی نسبت کے متعلق کافی باتیں ہوتی رہیں۔ فوزیہ خوشی سے جیسے پھولی نہ سما رہی تھی، سعدیہ بھی کچھ کم خوش نہ تھی ارادہ تو دونوں بہنوں کا شروع دن سے تھا لیکن جب تک ساس کی مہر ثبت نہ ہوتی انھیں پورا یقین اور خوشی نہ تھی۔

انجم آرا بھی اس خوشی میں برابر کی شریک تھیں، اپنے بچے بچیاں تھے، خوشی کیوں نہ کرتیں لیکن اس گھما گھمی میں انھیں برابر صاعقہ کا خیال آرہا تھا جشن کے پروگرام میں کافی دیر بحث ہونے کے بعد قدرے خاموشی ہوئی تو انھوں نے بات کا رخ پھیرا۔

"صاعقہ کے متعلق کیا سوچا ہے امی آپ نے؟"

حسن بانو نے جواب تو نہ دیا۔ لیکن وہ متفکر ضرور نظر آنے لگیں، فوزیہ اور سعدیہ کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ گویا ان مسرت آگیں لمحوں میں اس کا نام سننا بھی گوارا نہ ہو۔ حسن بانو کچھ نہ بولی تھیں کہ اس بیل کو کس کے سر منڈھیں اکثر اس کے متعلق سوچتی رہتیں، لیکن سوچ جھنجھلاہٹ میں بدل جاتی اور انھیں

لاشعوری طور پر محسوس ہونے لگتا جیسے ناجی جاتے جاتے اپنے انتقام کی تیغ صاعقہ کی صورت میں انکے سینے میں پیوست کر گئی ہے۔ میں۔ عتو اثر میں ڈالو سے برابر چھپے جا رہی تھی اور جسے نکال پھینکنا انکے بس میں نہیں تھا۔

"بیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس کے متعلق بھی تو کچھ سوچنا ہے۔"

انجم آرا ماں کو خاموش پا کر بولیں۔

"رشتہ تو آ رہا ہے۔ سوچنا کس بات کا ہے ابا" فوزیہ نے ناک چڑھا کر کہا۔

"کون سا رشتہ؟"

انجم آرا جانتے ہوئے بھی پوچھ رہی تھیں۔

"وہی نواب ہاؤس کا"

سعدیہ نے بھی بڑے بیگانہ انداز میں کہا۔

"توبہ کرو۔ کچھ تو خوف خدا دل میں ہونا چاہیئے۔" انجم آرا ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔

"اس میں خوف خدا کی کیا بات ہے۔ وہ خواہش مند ہے۔ پیسے والا ہے حسن آرا نے کہا۔

"عمروں کا فرق۔" "دو بیویوں کو طلاق دے چکا ہے۔ کردار کون نہیں جانتا۔ اس کا۔ شراب کے بغیر ایک دن نہیں جی سکتا۔" انجم آرا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تو پھر کیا کیا جائے" حسن بانو پہلی مرتبہ بولیں۔ "کہیں تو ٹھکانے لگانا ہے اسے"

"اس طرح تو کوئی بوجھ بھی نہیں اتار پھینکتا امی" انجم آرا کو ماں پر

غصہ بھی آیا اور گلہ بھی۔ "آخر اپنا ہی خون ہے۔ بن ماں باپ کی بچی ہے۔"

"خود تو جانے کہاں دفع ہوگئی۔ یہ عمر بھر کا روگ میرے گلے ڈال گئی۔"

حسن بانو غصہ سے بڑبڑائیں۔

"صرف نانی ہی کی نہیں۔ صاعقہ طاہر کی بھی بچی ہے۔" انجم آرا نے آہستگی سے کہا۔

"بڑی ہمدردی ہے اس سے؟" سعدیہ نے طنز کیا۔

"بھائی کا جگر گوشہ ہے۔ ہمدردی کیوں نہ ہو۔" انجم نے جواب دیا۔

"تو پھر تم ہی سوچو اس کے متعلق۔" نواب ہادی سے کرنے کو تم تیار نہیں اور کون اس کا ہاتھ تھامنے کو تیار ہوگا، اس کی منحوس ذات سے لوگ دور بھاگتے ہیں۔ کون اتنا دل گردہ لائے جو اسے بیاہ لے جائے۔"

"یہ سب آپ لوگوں کی بے بنیاد توہم پرستی کا نتیجہ ہے۔ بدسلوکی کر دیا ہے بچی کو۔" انجم غمزدہ سی نظر آ رہی تھیں۔

"اتنی ہی ہمدردی ہے تو اپنے نعیم سے کر لیں یہ رشتہ۔" فوزیہ نے طنز کیا فوزیہ کی چوٹ پر انجم چپ ہو گئیں۔ اور اس چپ پر سب نے ایک ملا جلا قہقہہ لگایا۔

"جب گھر کی طرف بات آئی تو چپ ہو گئیں۔ ہر چیز کی قیمت ہے اپنا خون ہے، مرحوم بھائی کی نشانی ہے۔" سعدیہ زیر لب مسکرا رہی تھیں۔

"کاش یہ بات میرے بس میں ہوتی۔"

"تمہارے بس میں کیوں کر نہیں۔"

"آپ لوگوں کی عنایت سے۔"

"وہ کیوں کر؟"

"آپ نے جو اس کے اردگرد توہم پرستی سے نحوست کے جال بن دیئے ہیں"

"لیکن تم تو اس خیال سے متفق نہیں"

"بے شک"

"پھر ہرج کیا ہے؟"

"صرف میری بات ہوتی تو آپ لوگوں کے کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی"
میری مجبوری آپ بھی جانتے ہیں سسرال والے تو اس نام سے خون کھاتے ہیں اور نعیم کے ابا کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اس بیچاری کا نام سنتے ہی یہ سب آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔ اتنا ناروا سلوک اس سے شروع ہی سے کیا گیا کہ اس کی ذات اب نحوست کا جلتا ہوا نشان سمجھا جانے لگی ہے۔ آپ سب نے بھی تو اس سلسلے میں اسے رسوا کرنے میں کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اتنا تو سوچا ہوتا کہ کل کو جوان ہو جائے گی، کہیں اسے بھی بیاہنا ہوگا۔"

انجم آرا نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ لیکن اس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا! اچھی خاصی نوک جھوک ہونے لگی۔ اکیلی انجم چاروں کا مقابلہ کہاں تک کرتیں۔ بات ہر پھر کر فواب پاڈی پر ٹھہرتی۔ کئی دن جھگڑا چلتا رہا۔ حسن بانو کو سینے کی ہڈی نکال پھینکنے لیکن انجم سدِ راہ تھیں۔ یہ ظلم تھا ایک مظلوم اور بے زبان لڑکی پر وہ ظلم اپنی زندگی میں نہ ہونے دیں گے۔

فخر بھائی بھی ان کے ہمخیال تھے، ان کی بیوی فوزیہ جتنا صاعقہ سے جلتی تھی تھیں اتنی ہی اس سے محبت تھی۔ لیکن اس محبت کا اظہار بیوی کی سخت گیری کو دیکھتے ہوئے کر نہ پاتے تھے۔ انجم اور فخر نے ماں کو مجبور کیا اور مناسب رشتہ کی تلاش جاری رکھنے کے وعدہ پر یہ بلا صاعقہ کے سر سے ٹل گئی۔

برآمدے میں ریحان، اسد، نعیم اور فریدہ کے ہمراہ کھڑے تھے۔ کہیں باہر جانے کا پروگرام تھا۔ باقی ساتھیوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ ریحان فاختئی رنگ کا سوٹ زیب تن کئے تھے۔ جوان کے حسین چہرے پر بے طرح اٹھ رہا تھا شہزادوں کی سی روایتی شان کے انداز سے مترشح تھی۔ پر وقار سے نظر آ رہے تھے۔

اسد کے ہاتھ میں اخبار تھا اور نعیم کے ساتھ وہ سیاسی گفتگو میں مشغول تھے۔ نعیم اور ریحان برآمدے کے آخری سرے کو دیکھتے ہوئے اپنی ساتھیوں کی سستی کو کوس رہے تھے۔

کچھ دیر بعد شاہد، سلیم اور لطیف بھی آ پہنچے، سب نوجوان خوش شکل اور خوش پوش تھے۔ آپس میں دور نزدیک کی رشتہ داریاں تھیں، الحمراء میں پلے بڑھے تھے۔ رشتہ داری سے زیادہ دوستی کے بندھن تھے۔ جوان سب کو آپس میں جکڑے ہوئے تھے، بے تکلف دوستی بھی تو ایک نعمت ہے۔

"فرخ نہیں آئے ابھی؟"

"بڑی دیر کر دی۔"

"اس کا تو انتظار ہی فضول ہے۔"

"ٹیب ٹاپ کے لئے گھنٹوں چاہئیں۔"

"لڑکیوں کو بھی مات کر دیا ہے بار سنگار کرنے میں۔"

"سخت غصہ آتا ہے۔"

"چلنا چاہیئے۔"

"تم جا کر دیکھو — کیا کر رہے ہیں؟"

لطیف جانے ہی والے تھے کہ فرخ نے دور ہی سے ہاتھ ہلایا۔

"آ گیا — میں آ گیا۔"

"شکر ہے۔" کئی آوازیں جواب میں تھیں۔ فرخ تقریباً بھاگتے ہوئے آ رہے تھے۔ ان کی حرکت کسی بے پناہ خوشی کی غماز تھی۔

"ہرا" فرخ پھلانگتے ہوئے دوستوں تک پہونچے۔

"کیا ہوا؟" فرخ کا شوخ تبسم دیکھ کر سب نے پوچھا۔

فرخ تیزی سے بڑھے آ رہے تھے۔

"ارے — یونہی بغیر بریک کی گاڑی کی طرح چڑھے چلے آ رہے ہو کچھ کہو بھی!" — ریحان نے فرخ کا کندھا پکڑ کر اپنے برابر کھڑا کر لیا۔

"ایک خوش خبری۔"

"کہاں سے اڑا لائے۔"

"پہلے منھ میٹھا کراؤ۔"

"کون؟"

"آپ" ریحان کی طرف دیکھ کر فرخ مسکرائے۔

"تو گویا خوش خبری میرے لئے ہے۔"

"بالکل سولہ آنے۔"

"اب کہہ بھی چکو!"

"اوں ہوں نہیں۔"

"بڑی بری عادت ہے تمہاری۔"

"جو جی میں آئے کہہ لو۔ لیکن منہ میٹھا کرائے بغیر کچھ نہ کہوں گا۔"
سب کا تجسس بڑھ گیا۔ فرخ کے گرد جمع ہو کر سب باری باری پوچھنے لگے۔ لیکن انھیں چڑانے میں بہت مزہ آ رہا تھا۔

"بس اب بہت بور ہو چکے۔ کہنا ہے تو کہہ چلو۔" ریحان نے قدم اٹھایا۔

"ٹھہریئے — ٹھہریئے۔" اسد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

ریحان کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔

"کہہ رہو —" فرخ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔"

نعیم بولے۔

"منھ میٹھا کرائی۔"

"ادھار۔"

"تو سنیئے۔"

سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ریحان قدرے لاپروائی انداز اختیار کئے تھے۔

"یہ کون سی بڑی بات ہے؟"

"اور اسی کا ہماری ذات سے کیا تعلق؟" ریحان بولے۔

"آپ ہی کے لئے تو جشن منایا جا رہا ہے۔"

"میرے لئے؟"

"ہاں۔ جناب کی منگنی کا سرکاری طور پر اعلان ہو گا اسی دن۔"

"سچ۔" کئی چہرے مسرت سے سرخ ہو گئے۔ ریحان بھی ایک انداز دلربا

سے زیر لب مسکرا دیئے۔

"تمھیں کس نے کہا؟" فریدہ نے پوچھا۔

"بندہ پرور۔ ان کانوں سے خود سن کر آیا ہوں۔ نانی حضور نے آخری فیصلہ دے دیا ہے۔"

"اچھا تو یہ رازدار محفلیں اسی لئے نشست گاہ میں ہر روز ہوا کرتی تھیں۔" شاہد بولے۔

"کچھ ہمارے متعلق نہیں فرمایا۔ اسد نے منھ بنایا۔

"اور ہمارے۔" نعیم آگے کو جھک کر لپکے۔

سب اشتیاق سے فرخ کو گھور رہے تھے۔ ریحان مستانہ نظروں سے سب کو دیکھتے ہوئے کھڑکی میں ٹیک لگائے دھیرے دھیرے مسکرا رہے تھے۔

"تم نے یہ باتیں سنیں کیسے؟"

"ساتھ والے کمرے میں تھا۔ نسبت دو چار بار کانوں میں سے ٹکرایا۔ اپنے کان کھڑے ہو گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ خیال تھا۔ کچھ اپنے متعلق سن پاؤں گا۔ بڑی مخری کی۔ لیکن پلے یہی پڑا کہ ریحان کی نسبت کا اعلان عید کے تیسرے دن جشن میں کر دیا جائے گا۔۔ اپنا تو بھولے سے کسی نے نام نہ لیا ــــ چلو انہی کی خوشی کے سہارے جی لیں گے۔

فرخ منھ بسور کر کہہ رہے تھے۔ سب ان کی اداکاری کی داد ہنس ہنس کر دے رہے تھے۔

"کیا باتیں بنا رہے ہو۔" ریحان نے ہاتھ بڑھا کر ان کی گردن پکڑ لی۔

"اُف ــــ" فرخ نے منھ بنایا ــــ "ایک تو آپ کے لئے خوشخبری لایا اوپر سے یہ غصہ۔"

"خوش خبری تو اٹھا لائے۔ یہ بھی سنا آئے کہ وہ کون خوش نصیب ہے۔ جسے مابدولت کے پلّے میں باندھا جا رہا ہے۔؟"

"ہاں! ہاں یہ تو تم نے بتایا ہی نہیں۔" تقریباً سب نے تجسس ظاہر کیا۔ حالانکہ ریحان خود اور باقی بھی جانتے تھے کہ وہ خوش نصیب سمیرا کے سوا اور کوئی نہیں۔"

اچانک فرخ کو شرارت سوجھی۔

"یہ بھی بتا دوں۔؟"

"یہی تو بتانے کی بات تھی۔"

"تو سنو۔ دل تھام کر سنو۔"

"دل تھام کر کہوں۔"

"بات ہی ایسی ہے۔"

سب کے چہروں پر تجسس کی لہریں گہری ہو گئیں۔ ریحان کچھ بےچین سے نظر آنے لگے۔

"بتا دوں یہ نسبت کس سے قرار پائی ہے؟"

"ہاں۔"

"صاعقہ سے۔"

"صاعقہ!" آنکھیں حیرت سے پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔ سب فرخ کو گھور رہے تھے۔ ریحان تو گنگ سے ہو گئے۔ گھڑی بھر پہلے کا شوخ تبسم سنجیدگی کا گہرا بادلوں میں ڈوب گیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" جانے کس نے کہنے کی ہمت کی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"لیکن؟"

"لیکن ویکن کیا۔ مابدولت نے اپنے کانوں سے سنا ہے اور پھر ہرج بھی کیا ہے؟"

"چپ رہو جی" ریحان کو غصہ آگیا۔

"مجھے شکیوں کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے ہو۔ یہ نانی حضور کا آخری فیصلہ ہے۔"

"فیصلہ میری مرضی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اس کا نام اپنے نام کے ساتھ سننا تک گوارہ نہیں کر سکتا۔"

"ریحان تو صاعقہ کے ازلی دشمن ہیں۔"

"دشمنی کی بات کیا ہے، سارے کینے میں اسکا دوست کون ہے؟" یہ بلا میرے لئے ہی رہ گئی تھی، اس کی ماں کا حسب نسب۔"

"داد ہو ہو ہو" فرخ نے چھیڑا۔

"میں ابھی دادی حضور کے پاس۔" وہ جانے کیلئے غصہ میں بڑھے

"نہ نہ نہ بابا۔ کیوں مجھے جہنم رسید کرانے کا ارادہ ہے۔"

فرخ نے بڑھ کر راستہ روکا۔ اور ڈھکیل کر انھیں پھر کھڑکی کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

"میں مذاق کر رہا تھا آپ رونے لگے۔"

"بیوقوف۔"

"صاعقہ نہیں کوئی اور ہے بس۔ اب تو خوش ہو جائیے۔"

فرخ آنکھیں نچاتے ہوئے بولے۔

"نام تو پوچھو پہلے۔"

ریحان ہنس کر بولے۔ صاعقہ کے علاوہ ہر نام گوارا ہے۔ کوئی مخالص

قید نہیں۔"

"خواہ وہ زیبو ہو۔؟"

فرخ نے مذاق سے خانساماں کی بھنگی لڑکی کا نام لیا اور سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

"ریحان!"

"میں بھی حیران تھا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" نعیم قدرے توقف کے بعد بولے۔

"بالکل — دادی اماں اپنے چہیتے پوتے کے متعلق اتنی شدید غلطی کیسے کر سکتی ہیں۔ ہماری تمہاری بات تھوڑا ہی تھی۔

"اگر صاعقہ کی نسبت قرار پا بھی جاتی تو کیا عصمت تھا۔" فرخ نے شوخ نظروں سے ریحان کی طرف دیکھا۔ جو کھڑکی سے کرکٹ کے بڑے شگفتہ نظر آ رہے تھے۔

"کچھ بھی نہیں۔" فرید بھی شوخی سے بولا۔

"شکل و صورت کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

فرخ بولے۔

"یہ بات غلط تو نہیں —" اسد نے حمایت کی۔

"تھوڑی سی منحوس ہے بس —" فرخ نے چھیڑا۔

"بھئی نحوست تو برداشت کر بھی لی جاتی ہے —" ریحان چہکے۔

"لیکن —؟"

"لیکن کیا؟" سب متوجہ تھے۔

"لیکن ایک بات بڑی خطرناک سی تھی۔" وہ اسی مسحور انداز میں لہک کر بولے۔

"وہ کون سی؟"

"اگر ماں کی طرح وہ بھی بھاگ جاتی تو طاہر چچا کی طرح جان سے ہاتھ دھونا پڑتا۔"

ریحان کے مذاق اڑانے پر ایک قہقہہ پڑا۔

"ہمیں اپنی زندگی درکار ہے بھئی۔ اسی لئے اس کا نام سن کر خوف آگیا تھا۔ نہ بابا۔۔۔" سب نے ہنس دیئے۔

اور عین اسی وقت اسد نے انھیں کمرے میں ٹھوکا دے کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیوں؟"

"اسد نے انگوٹھے سے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ اور وہ جلیبی کی طرح اکڑ گئے۔ کھڑکی کے پٹ کے قریب صاعقہ کھڑی تھی۔ اس کی حسین شبنمی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جنھیں بہزار دقت وہ پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ریحان کی نظریں ان دھندلائی آنکھوں سے ملیں۔ ان آنکھوں میں ایک التجا مچل رہا تھا۔ ایک شکایت سلگ رہی تھی۔ ایک لمحہ صرف ایک لمحے کے لئے نظریں ملی تھیں۔ پھر صاعقہ تیزی سے پلٹ کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ لیکن ایک لمحہ۔ یہ سلگتا ہوا ایک لمحہ زیست کے سینے پر ایسا داغ چھوڑ گیا جسے مٹا دینا ریحان کے بس میں نہ رہا۔

"کیا ہوا؟"

"کون تھا؟"

"یوں کیوں کھڑے ہو؟"

ریحان کو یوں ہراساں دیکھ کر سب ان کے گرد جمع ہو گئے۔ نثار نے تو کمرے میں جھانک کر بھی دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"ایک دم سانپ سونگھ گیا۔" نعیم نے ریحان کا کندھا ہلایا۔

"کیا بات ہے؟" فرید نے پوچھا۔

ریحان کچھ نہ بولے۔ کچھ کھوئے سے کھڑے تھے۔

"صاعقہ تھی نا اندر۔" اسد نے کہا۔

"ہاں۔" ریحان جیسے خواب میں بڑبڑائے۔

"اس نے تمھاری بکواس سن لی ہوگی۔"

"ہوں۔"

"کتنی بری بات ہے۔"

"ہاں۔"

"میں کب سے اشارہ کر رہا تھا۔ لیکن تم سنتے ہی کب تھے۔ اپنی ہانکے جا رہے تھے۔"

"توبہ کیا بکواس کر رہے تھے ہم سب — اگر اس نے سن لیا ہے تو بہت بری بات ہے۔"

"یقیناً" سن لیا ہے۔"

"اف واقعی بڑی بُری بات ہے۔"

سب متاسف سے نظر آرہے تھے۔ باری باری اپنے تاسف کا اظہار کرنے لگے۔

"آپ سب! اے انسان تھوڑا ہی سمجھتے ہیں پتھر سمجھتے ہیں پتھر۔"

اسد کو غصہ آگیا۔

"لیکن ہمیں کیا۔۔۔ معلوم تھا کہ وہ اندر ہماری باتیں سن رہی ہے۔"

فرید، ہچکچاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"ایسی باتوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔" اسد نے کہا۔

سب باری باری ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ لیکن ریحان چپ چاپ کھڑے تھے۔ کسی پتھرائے ہوئے انسان کی طرح۔ ذہن میں دو ڈبڈبائی آنکھیں دھندلائی آنکھیں تھرک رہی تھیں۔

آنکھیں!

جن میں زمانے بھر کی بیچارگی تھی! جن میں زمانے بھر کا استفسار تھا۔ جن میں زمانے بھر کی شکایت تھی! جیسے کہہ رہی ہوں، میری ماں بھاگ گئی تھی تو میرا کیا قصور۔ جیسے پوچھ رہی ہوں۔ یہ پرانے قصے میری ذات سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔ جیسے یہ شکایت کر رہی ہوں۔ مجھے جلن کے سوا اور بھی کچھ دیا ہے تم نے۔ ریحان ان شبنمی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں گم تھے اور سب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔

"چلو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی۔" فرخ نے تنگ آکر کہا۔ اتنا فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔" نعیم نے ریحان کا کندھا ہلایا۔

ریحان نے واقعی لاکھوں مرتبہ اسے تختۂ تضحیک بنایا تھا، اسے کوسا تھا
برا بھلا کہا تھا۔ لیکن آج تو۔۔۔ جانے کیا ہو گیا تھا۔ کوئی نئی بات
وقوع میں نہیں آئی تھی۔ شاید نئی بات ہی تھی۔

ریحان کا مذاق ہمیشہ صاعقہ کی ذات سے وابستہ نحوست تک رہا ہوتا
تھا ان کا تنفر بھی اسی سے تھا لیکن آج۔ آج انھوں نے اخلاقی اقدار کو
لتاڑ کر اس پر ایسا حملہ کیا تھا جس سے وہ اپنی نظروں میں آپ ہی مجرم بن گئے تھے
ان جھلملاتی آنکھوں نے انھیں اس جرم کا شدت سے احساس دلایا تھا
آہ وہ بہنے کو بیتاب آنسو۔ جنھیں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں پی جانے
کی کوشش کر رہی تھی۔

ریحان کا ضمیر انھیں مجرم کہہ رہا تھا۔ زمانہ معاف کر دیتا۔ قانون معاف کر دیتا
اخلاقی حد بندیاں معاف کر دیتیں، جب بھی وہ اپنے آپ کو معاف نہ کر سکتے تھے

"چلو چلیں۔"

"کیا بدمزگی پیدا کر دی تم نے فرخ۔"

"میں نے کیوں؟"

"تو اور۔۔۔ نہ خوش خبری لاتے نہ بات یہاں تک پہونچی۔"

میرا کیا قصور عیاں۔ یہ تو بجلی کی ہر کی کرامت ہے۔ دیکھو برا
وا نے کرے سے گزری اور ہماری ساری خوشی کرکری ہو گئی۔ فرخ نے
ریحان کو ہنسانے کی کوشش کی۔ سب مسکرا دیئے۔ لیکن ریحان کے لبوں پر
مامد چپ تھی۔ وہ جیسے یہاں تھے ہی نہیں۔

دور کہیں دور۔ دو آنکھوں کی شبنمی دھندلاہٹوں میں ڈوب رہے
نے زندگی میں پہلی بار کسی کے دکھے دل کا احساس ہوا تھا۔ آج دھندلاہٹوں کے

سینے چیر کر بجلیاں لپکی تھیں۔ اور کہنہ چٹانوں کو پاش پاش کر گئی تھیں۔ آج دھوئیں کے بادلوں کے ٹکراؤ سے پہاڑ سہم گئے تھے۔ آج پانی سے آگ لگ گئی تھی۔ چند گھنٹے دوستوں کے اصرار پر بدمزگی سے گزارنے کے بعد ریحان جب دوپہر کے کھانے کے لئے طعام گاہ میں پہونچے۔ تو انکا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے کھانے کی میز پر نظر ڈالی صاعقہ موجود نہ تھی۔ انھوں نے دوسری طرف دیکھا اس میز پر بھی وہ موجود نہ تھی۔ انکا دل پکار پکار کر کہنے لگا کہ وہ ان بے رحم لمحات کی تلخی پر اب تک سسک رہی ہے۔ ریحان سے کھانا بالکل نہیں کھایا گیا کمیرا ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس گمبھیر چپ سے وہ اُلجھ رہی تھی۔ اس نے کئی کھانے ریحان کے سامنے پیش کئے لیکن وہ برائے نام نوالے لیکر میز سے اٹھنے لگے۔

"کیا بات ہے آج آپ نے کھانا نہیں کھایا؟" کمیرا نے دلفریب انداز میں پوچھا۔

لیکن ریحان کو آج یہ آواز کچھ اجنبی سی لگی۔ بغیر کچھ کہے میز سے اُٹھ گئے اسد برابر ریحان کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے کھوئے ہوئے انداز سے انھیں خوشی ہو رہی تھی، ایک معصوم زندگی کا مسخرا اڑانے والا آج خود تاسف و ندامت سے دوچار تھا۔ پتھر کچھ نرم تو ہوا تھا۔ ریحان اپنے کمرے میں آگئے۔ دل میں کسک تھی کسی پہلو قرار نہ آرہا تھا۔ اپنے کہے ہوئے الفاظ کی گونج کانوں کو مجروح کر رہی تھی۔

"وہ بھی اپنی ماں کی طرح بھاگ گئی تو۔۔۔!"

اف کتنے سبک تھے وہ۔۔۔ ایسا ذلیل مذاق۔۔۔ اتنا گرا ہوا مذاق تھا ان کا۔۔۔ انھیں اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اپنی نظروں میں آپ گرے جا رہے تھے

اخلاقی ضابطہ بھی تو کوئی چیز تھی۔ حیران تھے کہ اب تک انھوں نے اس ضمن میں اخلاقی ضابطوں کا اطلاق نہ اپنے اوپر رکھا تھا۔ گوشت و پوست کی ذی روح شے کو پتھر کا ٹکڑا کیوں سمجھ رہے تھے۔ اس کے محسوسات پر جمود کا یقین کیوں نہ تھا انھیں۔ پچھتاوا آ رہا تھا۔ بری طرح روح کو مسل رہا تھا۔ کسی طرح تسکین نہ پا رہے تھے۔ جھنجھلا کر ان خیالات سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کی۔ مسہری پر لیٹ کر کتاب اٹھائی۔ ذہن کا رخ موڑنے کا ایک حیلہ ہی تو تھا نا۔ لیکن ــــ ہر صفحہ ــــ سطور کی بجائے دو حسین سوگوار اور روٹھی ہوئی آنکھوں کا عکس نظر آیا۔ آنسوؤں سے ڈبڈبائی آنکھیں جو کچھ پوچھ رہی تھیں، کچھ کہہ رہی تھیں، کچھ طلب کر رہی تھیں۔

ریحان نے کتاب میز پر پٹخ دی۔ اور تکیے پر سر رکھ کر ان افکار پریشان کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ تین چار گھنٹے یونہی گذر گئے۔ نہ سو سکے نہ ہی ذہن کو انگاروں کی حدت سے بچا سکے۔

شام گھوم پھر کر گزارنے کے خیال سے اٹھے اور جلدی جلدی تیار ہونے لگے۔ وہ بیرونی دنیا کے شور و غل میں آپ کو کھو کر تسکین پانا چاہتے تھے۔ تنہا جانا چاہتے تھے، اس لئے غسل خانے کے دروازے سے باہر نکلے۔

راستہ طاہر مرحوم کے کمرے کے آگے سے ہو کر جاتا تھا۔ ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ریحان کو اس کھرے کا خیال آ گیا، جو کئی دنوں سے وہ ٹھیک کروانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ لیکن جب بھی باہر جاتے لے جانا بھول جاتے ریحان برآمدے میں آئے اور طاہر کے کمرے میں آ گئے۔ لیکن مسہری پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹھک گئے۔ وہاں کوئی بیٹھا تھا۔ جس نے آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا اور ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے وزنی بم پھینک کر انکی حیات کا شیرازہ

درہم برہم کر دیا ہو۔ مسہری پر صاعقہ بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں طاہر و ناجی کی بڑی سی تصویر تھی۔ جس پر سر رکھے وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ پلنگ پر کئی تصویریں بکھری تھیں۔ آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ شدت گریہ سے آنکھیں اس حد تک متورم تھیں کہ انھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔ صبح ان آنکھوں میں ریحان نے سیلاب امنڈتے دیکھا اور اب اس سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے۔ یہ سیلاب انھیں کا آوردہ تو تھا۔

گھبراہٹ، پریشانی، پشیمانی اور ندامت کے جذبات نے انھیں گنگ کر دیا دونوں ہاتھ پریشانی سے ملتے ہوئے انھوں نے صرف ایک بار اسکی طرف دیکھا اور دیکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

آنچل سے آنکھیں پونچھتے ہوئے وہ اٹھی۔ پلنگ پر بکھری ہوئی تصویروں کو سمیٹا۔ گود والی تصویر انھیں دکھا۔ اور تصویریں الماری میں یونہی ٹھونس کر وہ مڑی ریحان نے دیکھا۔ اسکی سرخ سرخ آنکھوں میں اداسیاں یوں ڈھل رہی تھیں جیسے رات کی آمد پر تاریکیاں شفق میں ڈھلنے لگتی ہیں۔

"صاعقہ" اک مبہم سی سرگوشی ابھری۔ لیکن صاعقہ رکے بغیر ریحان کے قریب سے ہوا کے اک جھونکے کی طرح گزر گئی۔ جھونکا آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور۔ جسے قابو میں کر لینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔

ریحان نے اپنا نیلا گاؤن پہنا اور خوابگاہ سے باہر نکل گئے۔ کل کے سنگین واقعے کا اثر ابتک ان کے حواس پر تھا، بچھتاوا رہ رہ کر مچل رہا تھا اور ریحان کا

غم نا آشنا زندگی کو اک انوکھی سی کسک دیئے جا رہا تھا۔

رات بھر انھیں اچھی طرح نیند نہ آئی تھی۔ ذہن اس قدر متاثر ہوا تھا وہی دو شبنمی آنکھیں سوتے جاگتے میں تھرک رہی تھیں، رات بھر کی بیزار نیند اور ذہن پر ان آنکھوں کی شدید گرفت سے وہ جھنجھلائے ہوئے تھے۔

"کوئی بڑی بات نہیں۔ کسی وقت موقعہ ملا تو معذرت کر دیں گے ایسی کون سی بات ہے جس کے لئے اپنے آپ کو اس حد تک پریشان کیا جائے مانا کہ اخلاقی پستی ہے اخلاقی جرم ہے تو اب کیا ہو سکتا ہے، چلو معافی مانگ لیں گے۔ آئندہ اسے کبھی نہ بنائیں گے۔ اس سے اچھا سلوک روا رکھیں گے اس کی نخوست کا کبھی بھی مذاق نہ اڑائیں گے۔"

سوچتے سوچتے ریحان دریا کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ موسم انتہائی خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا اعصاب پر خوشگوار اثر ڈال رہی تھی۔ سبزہ۔ دریا کا کنارہ۔ اور ابھرتی صبح۔ ریحان کافی دور تک نکل گئے دماغی اشتعال، ذہنی گھبراہٹ اور روحانی اضطراب ختم نہ کر سکے۔ ہلکی ہلکی سنہری دھوپ سطح آب پر جھلملانے لگی۔ ریحان پہلے سے کہیں زیادہ بے قرار ہو کر واپس پلٹے۔ دریا کے کنارے جہاں اونچے نیچے درختوں تلے بڑے بڑے پتھر پانی میں کچھ ڈوبے کچھ ابھرے قدرتی جزیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ جہاں خودرو پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ جہاں نرم و نازک بیلیں تناور درختوں کے تنوں سے بڑی والہانہ انداز میں لپٹی ہوئی تھیں موسم کی رنگینی، ماحول کی نغمگی اور بھیگی بھیگی فضا کا ترنم متقاضی تھا کہ وہ کسی پتھر جزیرہ پر بیٹھ کر پانی میں پاؤں ڈالے اپنے سارے افکار سے نجات پا لیں۔ لیکن طبیعت کچھ چلی ہوئی تھی۔ قرار نہ تھا۔ بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ناشتے کا وقت بھی تو

ہو رہا تھا۔ وہ کچھ تیز قدم اٹھانے لگے۔ لیکن انکے بڑھتے ہوئے قدم خود بخود رک گئے۔ اک لطیف سی مدھم گنگناہٹ فضا کی نغمگی و ترنم میں ایک درد بھرا اضافہ کر رہی تھی۔ کوئی ہلکی سردی میں دلی کا درد فضا کی لہروں پر بکھر رہا تھا کشش ساحرانہ تھی۔ ریحان کے قدم خود بخود آواز کی سمت اٹھنے لگے۔ درختوں کے شاداب جھنڈ میں۔ جہاں خودرو پھولوں کی مہک تھی انھیں کالجی کپڑوں کی جھلک سی دکھائی دی۔ آواز رک گئی۔ اور ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کائنات نے دم روک لیا ہو۔ ریحان دم بخود کھڑے تھے۔

چند ثانیوں بعد پھر آواز ہواؤں کے دوش پر لہرائی۔ اور لہراتی رہی ایک ہی شعر کئی بار گنگنایا جاتا تھا۔ کبھی مدھم سروں میں کبھی دلکش لے میں۔ آواز کے ساتھ سوز و گداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے نغمہ نہیں سیالی درد بہہ رہا ہو۔ ریحان محتاط قدم اٹھائے جھکے درختوں کی ٹہنیاں ہٹا کر راہ بناتے کسی مقناطیسی کشش سے اس جانب کھنچے جا رہے تھے۔ قریب پہونچکر درختوں کی گھنیری اوٹ سے ریحان نے دیکھا۔ لمحہ بھر کو تو جیسے انکا دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

صاعقہ اک انداز بیخودی سے چوڑے پتھر کے کنارے بیٹھی تھی۔ پاؤں پانی میں لٹکا رکھے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لہریں قدموں کو مچلتے ہوئے گزر رہی تھیں۔ مستانہ ہوا کی چھیڑ چھاڑ سے بال کچھ پریشان سے ہو کر بکھر گئے تھے۔ گلابی کشمیری لباس کی سرسراہٹیں جاں گداز تھیں۔

صاعقہ ماحول سے بے خبر اور گرد و پیش سے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔ چہرے پر اداسیوں کے گھلتے رنگ بڑے واضح تھے۔ بڑی بڑی حسین آنکھوں میں ایک آنسو رکا تھا۔ کتنی افسردہ نظر آ رہی تھی۔ ایک درد بھرا شعر وجدانی کیفیت سے

کبھی مسلسل اور کبھی رک رک کر دہرا رہی تھی۔ بیچارگی اور تنہائی کا ترجمان جس انداز میں گنگنایا جا رہا تھا پتھر بھی پانی ہو جاتا۔ ریحان تو انسان تھے جو گوشت پوست کا دل رکھتے تھے ــــ دل ــــ جو احساس ندامت سے دھڑکنا بھی بھولتا جا رہا تھا۔ پتوں کی چلمن سے وہ صاعقہ کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔ پچھتاوں کا ردعمل افسردگی کے روپ میں ہو رہا تھا۔ ریحان بے قرار پہلے ہی تھے۔ اب انتہائی افسردہ نظر آنے لگے۔

صاعقہ کی آیا اسے بلانے کہیں سے آ گئی۔ ریحان کا مدہوش تاثر ٹوٹ گیا جلدی سے گھنے درختوں کی آڑ میں اس طرح کھڑے ہو گئے جہاں وہ کسی کو نظر نہ آتے تھے۔ لیکن پتوں کی آڑ ایسی تھی جہاں سے وہ صاعقہ کو بآسانی تک سکتے تھے وہ صرف دو فٹ کے فاصلے پر بیٹھی تھی۔ آیا کی آواز پر صاعقہ بھی اس دنیا میں لوٹ آئی۔ اک گہری سانس لے کر اس نے آیا کی طرف دیکھا۔

"چلو بیٹی۔ کب سے یہاں بیٹھی ہو۔ آج تو میرے جاگنے سے پہلے ہی تم اٹھ آئیں ــــ چائے وہیں پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہو گی۔"

صاعقہ نے ایک جھولتی ہوئی شاخ کو تھام لیا۔ اور، اس کے پتے نوچ کر پانی میں پھینکنے لگی۔

"آنٹو کہیں!"

"ہوں۔"

"دیر ہو رہی ہے بیٹی ــــ ناشتے پر سب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

صاعقہ نے سر گھما کر آیا کو دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں ایک استفسار اور ہونٹوں پر طنزیہ تبسم تھا۔

"ناشتے پر سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"وقت ہو گیا ہے۔ سب کھانے کے کمرے میں پہونچ گئے ہوں گے۔
آیا جیسے اس کے طنزیہ تبسم کو سہار نہ سکی۔
"صرف میں نہیں پہونچی۔"
"ہاں، تو۔"
"اس لئے سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔"
"اٹھو بھی صاعقہ۔"
"آیا۔"
"ہوں۔"
"تم جھوٹ کیوں بولتی ہو۔"
"میں۔"
"ہاں۔"
"میں نے کونسا جھوٹ بولا۔
"ابھی ابھی کہہ رہی تھیں نا۔ کہ سب ناشتہ پر میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔
اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے؟۔
"تو یہ سچ ہے۔"
"ہاں۔"
اور اس بات پر صاعقہ کھلکھلا کر ہنس دی۔
ریحان کو یہ ہنسی یوں لگی جیسے دق کے مریض کے کھوکھلے سینے سے آخری بار کھانسی اٹھی ہو۔ کتنی کھوکھلی اور طنز بھری ہنسی تھی۔ ریحان نے لاشعوری طور پر اپنے نچلے ہونٹ کے دائیں گوشے دانت تلے دبا لئے۔
"صاعقہ" آیا کے لہجے میں محبت بھری ڈانٹ تھی۔ کتنی بار سمجھایا ہے الٹ

پلٹ بات نہ کیا کرو۔

"کیسے نہ کروں آیا" صاعقہ سینے میں اٹھتی ہوئی ٹیس کی طرح بل کھا کر پیچھے ہٹ گئی۔ وہ مجسم آنسو نظر آ رہی تھی۔

آیا کی آنکھوں کے گوشے نم آلود ہو گئے۔ لیکن اپنے آپ پر قابو پا کر آگے بڑھی اور صاعقہ کا ہاتھ تھام کر اٹھانا چاہا۔

"تم کہتی ہو سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ آیا۔ یہ جھوٹے بہلاوے دے دے کر کب تک بہلاتی رہو گی مجھے۔"

آیا کے بجھے بجھے چہرے پر جذبات کا تلاطم تھا صاعقہ پھر ہنس دی۔ وہی بے رنگ بے کیف ہنسی۔ جیسے مدتوں سینے کی ہڈیاں کھڑکھڑا گئی ہوں۔

"میرا کسی کو انتظار نہیں ہوتا آیا۔ میری موجودگی ان لوگوں کے ذہنوں پر بار ہوتی ہے آیا۔ مجھے صبح صبح دیکھ کر ان کی رگ و پے میں سناہٹ دوڑ جاتی ہے جھنجھلاہٹ سی آ جاتی ہے سارا دن بدمزگی میں گزر جاتا ہے۔"

"صاعقہ!"

"میں بجلی ہوں، آیا، بجلی — جہاں گری بھسم کر ڈالا۔" صاعقہ اسی انداز میں کہنے لگی۔

"اف!" ریحان نے اپنے ہاتھ کانوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں صاعقہ انہی کے الفاظ دہرا رہی تھی۔

اتنا اثر لیا اس نے — ریحان نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا۔

"میری بچی کیا ہوا ہے تمہیں۔" آیا اس کے قریب بیٹھ کر اس کے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ صاعقہ بہتے پانی پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

"کل سارا دن درد کر ہلکان ہوتی رہی ہو۔ کچھ تو کہو۔ کیا ہے؟"

"کوئی نئی بات نہیں آیا ـــــ" وہ جلدی سے بولی۔

"پھر بھی؟"

"تھپڑ، وہی ہیں، صرف ضرب لگانے کے انداز نئے ہیں آیا۔"

"پھر کہا کسی نے کچھ؟"

"اگر میں ہاں کہہ بھی دوں، تو تم کیا کر لو گی آیا۔"

آیا کی آنکھوں میں اپنی بے بسی پر آنسو چھلک آئے۔ ذہنوں کے دھارے بدل دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

"آیا قدرے توقف کے بعد صاعقہ بولی۔

"ہوں؟"

"اگر ـــ" وہ چپ ہو گئی۔ آیا منتظر رہی۔

"اگر کیا؟" کافی وقفے کے بعد آیا نے پوچھا۔

"اگر میں یہاں سے چھلانگ لگا کر ان لہروں کی آغوش"

"صاعقہ ـــ!" آیا چیخ اٹھی اور ریحان سر تا پا کانپ گئے۔

"تم یہاں نہ آیا کرو ـــ نہ آیا کرو ـــ" آیا نے بے تحاشا اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"کیوں؟" صاعقہ نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بڑی منحوس جگہ ہے میری بچی ـــ" آیا خوفزدہ سی تھی۔

"منحوس ـــ؟"

"ہاں ـــ تمہاری بدبخت ماں بھی یہیں بیٹھا کرتی تھی، اور ظلم تشدد سے تنگ آ کر یہیں سے ـــ"

وہ کہتے کہتے ایک دم رک گئی ـــ پھر گھبرا کر بولی۔

"اٹھو — چلو یہاں سے۔ یہاں نہ آیا کرو — یہ بڑی منحوس جگہ ہے"
ریحان نے قدرے جھک کر آیا کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی لیکن رخ
رخ صاعقہ کی جانب تھا۔ آیا کی گھبراہٹ انھیں کچھ چونکا گئی تھی
صاعقہ از خود رفتہ سی بیٹھی تھی۔
"میری ماں بھاگ گئی تھی آیا —" صاعقہ نے گھٹے ہوئے اندر
میں ڈوبے درد بھرے لہجے میں کہا۔
"نہیں — نہیں — صاعقہ —" آیا نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا
"تم ہمیشہ یہی کہتی رہو گی — جھوٹی تسلیاں نہ دیا کرو — تمھاری
ہمدردی بہت دکھ دیتی ہے آیا —"
آیا نے کوئی جواب نہ دیا۔
"آیا"
"ہوں"
تم کیوں کر کہہ سکتی ہو کہ میری ماں بھاگ نہیں گئی تھی؟"
آیا ایک لمحے کو سٹ پٹا گئی۔ لیکن اب تو صاعقہ کے ایسے ایسے سوالوں
کی عادی ہو چکی تھی۔
"ہاں بتاؤ نا —"
"مجھے یقین ہے"
"یونہی —؟"
"اک عمر گذر گئی ہے یہاں رہتے ہوئے —"
پھر —"
"بہت کچھ سمجھا — بہت کچھ پایا —"

"یقین کہ میری ماں بھاگی نہیں تھی"

"میرا ایمان ہی"

"ہوں ہنہ"

صاعقہ ہنس دی۔

"سب کہتے ہیں"

"غلط کہتے ہیں"

"تم اکیلی سچ کہتی ہو"

"ہاں" آیا نے اس یقین سے کہا کہ ریحان نے پتوں کی اوٹ سے ایک بار پھر جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

اس سنگین چار دیواری میں بسنے والوں کے سینوں میں دل نہیں پتھر ہیں بیٹی، جو اپنے خون کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کر سکتے ہیں، انھیں اس غریب اور بھاتی لڑکی سے جارحانہ اور بہیمانہ رویہ روا رکھنے میں کیا پابندی ہے جو اور تشدد سے تنگ آ کر ہو سکتا ہے۔ وہ انھیں لہروں کی آغوش میں کھو گئی ہو"

صاعقہ نے ابھرتی ڈوبتی لہروں کی طرف دیکھا۔ اور اس عقیدت سے دیکھا جیسے ان ڈوبتی لہروں میں انکی ماں کی تربت ہو۔ لیکن ایک لمحے کے بعد اس نے یقین انظروں سے آیا کی طرف دیکھا۔

"یہ سب تمھاری قیاس آرائیاں ہیں آیا"

"نہیں مجھے یقین ہے بجی"

"یقین" صاعقہ پھر وہی بے رنگ سی ہنسی ہنس دی۔ آیا اس کا منہ

"دیکھنے لگی۔

"تمھیں تو یہ بھی یقین نہیں کہ بانا فتہ پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔

ناشتہ کرنے کو اس کا قطعاً جی نہ ہو رہا تھا۔ کل سے طبیعت سخت پریشان تھی زندگی سے بیزاری سی نظر آ رہی تھی۔ صبح ہی صبح آیا سے جو باتیں ہوئیں ان سے طبیعت اور مکدر ہو گئی تھی۔ آیا اسے زبردستی ناشتے کے لئے ڈائننگ ہال کی طرف لے آئی سب ناشتہ کر چکے تھے۔ ہال خالی تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی صاعقہ کی نظر میز کے کونے پر پڑی۔ ناشتہ کا سامان رکھا تھا۔ اور ریحان میز کے کنارے والی کرسی پر بیٹھے پیالی میں چائے انڈیل رہے تھے۔

"صاحبزادہ صاحب ــــ آج آپ تنہا ناشتہ کر رہے ہیں ــــ؟" آیا نے پوچھا۔

"بس دیر ہو گئی تھی ــــ" انھوں نے پل بھر کو صاعقہ کی طرف دیکھا۔ سفید لباس میں وہ کتنی پر وقار تھی۔

"صاحبزادی نے بھی ناشتہ نہیں کیا ابھی"

"یہیں آ جائیں ــــ کافی چیزیں پڑی ہیں ــــ" ریحان جانے کیوں صاعقہ کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکے۔ صاعقہ نے رک کر ریحان کی طرف دیکھا حیرانگی سے دیکھا۔

"ہاں بیٹی یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں پیالی لے آتی ہوں ــــ" آیا الماری سے پیالی لانے آگے بڑھ گئی۔

"بیٹھ جاؤ صاعقہ ــــ" ریحان آہستگی سے بولے۔

صاعقہ نے کرسی کی پشت تھامے تھامے پھر ریحان کی طرف دیکھا

اس کی آنکھیں صبح کے ان نازک لمحوں کی جھلک تھی۔ جن میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے میں حلول کر جاتا ہے۔ ایک خواب ناک سا اجالا — ایک — تابناک سا اندھیرا۔

ریحان کے لہجہ کی ملائمت نئی اور انوکھی تھی۔ لیکن وہ اس نئے پن سے محظوظ محسوس نہ کر سکی۔ . . ریحان . . . یہ وہی ریحان ہی تو تھے جو اسے تختۂ مشق بنانے میں پیش پیش تھے جو اس کا نام اپنے نام کے ساتھ لینا تک گوارا نہ کر سکتے تھے اور جو ابھی کل ہی دوستوں میں اسکے وقار کی دھجیاں اڑا رہے تھے۔

"بیٹھو نا!" ریحان نے نادم نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے میں سموئے ہوئے لاتعداد غموں نے انھیں بے چین کر دیا۔ صاعقہ نے پھر ریحان کی طرف دیکھا، اب اس کی آنکھوں میں طنز کی دھوپ تھی۔ چبھتی ہوئی دھوپ۔

"کافی چیزیں ہیں۔ آپا پیالی لا رہی ہے۔ ناشتہ یہیں کر لو۔" ریحان کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کہہ رہے تھے۔

"کیوں پریشانی مول لیتے ہیں۔" وہ زیر لب ہنسی۔

"صاعقہ۔ بات مجھ ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں جا گرا۔

صاعقہ ہنس دی۔ وہی پھیکی بے رنگ ہنسی — جو آج صبح ہی صبح ریحان نے سنی تھی، وہ بے چین ہو گئے۔

"صبح ہی صبح منہ دیکھ لیں تو سارا دن پریشانی میں گذر جاتا ہے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کریں گی تو ہفتہ بھر پریشانی سے طبیعت محفوظ رہے گی۔ صاحب زادہ ریحان —" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی۔

"صاعقہ!" ریحان بے ساختہ چیخ اٹھے — انکے لہجہ میں تلملاہٹ ہو گئی

بیچارگی تھی۔ لیکن صاعقہ نہ تو رکی نہ مڑ کر ہی دیکھا کسی سبک سی لہر کی طرح وہ آگے بڑھی۔ ہال کے آخری کونے میں ایک میز کے قریب جا بیٹھی۔ ریحان کی طرف اس کی پشت تھی۔

ریحان نے کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھ دیا۔ آیا پیالی لے کر آ گئی۔ ریحان کی طرف دیکھا اور پھر صاعقہ کی طرف۔ وہ چپ چاپ پیالی لئے صاعقہ کی طرف آ گئی۔

"وہیں ناشتہ کر لیتیں ــــ" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میرے لئے ناشتہ لاؤ۔" صاعقہ کے لہجے میں حکم تھا۔

آیا کچھ اور کہنا سنا سب نہ سمجھتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی۔ وسیع ہال پر اک سکوت طاری تھا۔ ریحان کی چائے پیالی میں پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ سب چیزیں جوں کی توں پڑی تھیں۔

"صاحبزادہ ریحان۔" یہ انوکھا طرز تخاطب کانوں سے ٹکرا رہا تھا دونوں ایک ہی ہال میں بیٹھے تھے لیکن کتنی دوریاں حائل تھیں، یہ ذہنی دوریاں کیا انھیں مٹایا جا سکے گا۔

صاعقہ نے ناشتہ کیا یا نہیں۔ ہاں وہ کچھ دیر ناشتے کی میز پر بیٹھی رہی پھر اس کے ہال سے جانے کے بعد ریحان بغیر ناشتہ کئے میز سے اٹھ گئے طبیعت پژمردہ پہلے ہی تھی، اب تو بجھ ہی گئی۔

سارا دن اپنے کمرے میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکتے رہے۔ اسد، نعیم زرخ، شاہد نے دھاوا بول دیا۔ یوں بے سدھ پڑے رہنے پر احتجاج کیا۔ لیکن دوستوں کی بے باکی اُلجھن بن گئی۔ طبیعت کی خرابی کا واسطہ دے کر سب سے پیچھا چھڑایا۔ زرخ نے بزدل کہہ کر طنز بھی کیا۔ اس خرابی

بلیغ کو کل واقعے پر محمول کر کے مذاق اڑایا۔ لیکن ریحان خوبصورتی سے بات کو اور موڑ دے گئے۔ طبیعت خراب ظاہر کی۔ سب بات سچ مان گئے۔ ہاں اسد عمیق نظروں سے اس بناوٹ کے پردے میں چھپی ہوئی حقیقت کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

دوستوں کا ہنسی مذاق راس نہ آیا۔ سمیرا کی ہمدردانہ احوال پرسی بھی اچھی نہ لگی۔ سارا ماحول اجنبی سا لگ رہا تھا۔ انھیں صرف اپنے جرم کا احساس تھا۔ وہ شدید ترین احساس ہوا جا رہا تھا۔

سارے ان جذبات کے شوریدہ سر موجوں سے ٹکراتے رہنے کے بعد ریحان نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ صاعقہ سے معافی مانگیں گے۔ پوری عقیدت سے وہ اس ذہنی دوری کو ختم کر دیں گے، وہ اجنبیت اور بیگانگی کے احساس کو مٹا کر صاعقہ کو وہی مرتبہ دیں گے جس کی وہ اہل ہے۔ بزم کی سنگینی کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے جذبہ عفو طلبی کی گہرائی کا بخوبی احساس تھا۔ اسی شام وہ پچھلے برآمدے کے گول ستون سے ٹیک لگائے، ڈوبتے سورج کی سرخیوں میں جانے کیا دیکھ رہے تھے کہ اچانک بغلی کمرے کا دروازہ کھلا۔ ریحان نے مڑ کر دیکھا۔ صاعقہ سامنے تھی۔

صاعقہ دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ خاموش، سنجیدہ اور باوقار۔ ہلکے بادامی رنگ کے لباس میں شام کے دھندلکے میں وہ اس حور سے خواب کی طرح نظر آ رہی تھی جو جاگتے میں آنکھوں میں ڈھل رہا ہو۔ اسے شاید بیرونی چمن کی طرف جانا تھا۔ ایک نابینا ریحان کو دیکھ کر ٹھٹکی پھر بڑھی اور ان کے قریب سے گزر کر برآمدے کی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

"صاعقہ!"

ریحان کا جذبہ عفو طلبی مچلا۔ صاعقہ نے گردن موڑ کر انکی طرف دیکھا لیکن اس کی نگاہوں میں بیگانگی کا ایک ایسا تاثر تھا کہ ریحان کوشش کے باوجود حرف مدعا ہونٹوں پر نہ لا سکے۔ صاعقہ نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ کیا کہنا چاہتے ہیں وہ کچھ نہ سمجھی ـــــ (صفحہ) سیہ فلک دلدادے چند تارے انھیں دیکھتی رہی۔

ریحان کے خوف کا ایک ایک قطرہ حرف مدعا بننے کے لئے تڑپ اٹھا لیکن جانے کون سی طاقت تھی جو وقت کو پائی سلب کئے جا رہی تھی۔ کچھ بار نگاہیں اٹھیں لیکن اپنے ہی بار سے جھک گئیں ـــ ریحان کا تذبذب ـــــ ہچکچاہٹ اور کشمکش صاعقہ کی نظروں سے نہاں نہ رہا۔

لیکن اس نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ریحان غریب تھے۔ وہ مڑی اور چمن میں اتر گئی۔ ریحان وہیں کھڑے اسے جاتا دیکھتے رہے۔ ہے دریا اپنے اوپر جھکی آسمان کی وسعت بھی، کتنا اچھا موقع تھا عفو طلبی کا۔ ضمیر سے بوجھ ہٹانے کا ذہنی دوریاں دور کرنے کا۔ لیکن اس سنہرے موقع سے وہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ کیا وہ بزدل تھے۔ یا جرم کا بار ہی اتنا تھا کہ اٹھانا مشکل تھا، بار سے زبان بند ہو گئی تھی۔ کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہ پائے۔

اس نشیلی صبح وہ حسب معمول دیر تک دریا میں تیرتی ڈوبتے پتھر پر بیٹھا رہا۔ دائرہ ہوائیں اس کے بالوں کو چھیڑتی رہیں، مست جھونکے اسکے لباس کی سرسراہٹوں کی سرگوشیاں بتاتے رہے۔ لیکن وہ بے خبر سی بیٹھی رہی وہ صبح خاموش

اور پرسکون دکھائی دے رہی تھی اس کے سینے میں اتنا ہی ہیجان و تلاطم تھا۔ پانی میں گرداب اٹھ رہے تھے اور اس کے ذہن میں بھی کچھ ایسے ہی گرداب بن رہے تھے، بگڑ رہے تھے اور پھر بن رہے تھے۔ لہریں پھیل پھیل کر اس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں۔ جن سے دل، پھکوے کھا رہا تھا۔

کئی دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ ریحان اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دو چار مرتبہ آمنا سامنا ہونے پر انھوں نے اسے مخاطب بھی کیا۔ لیکن بات کیوں کر دبنے سے گریزاں رہے تھے۔

وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟۔

یقیناً وہ کسی خوش فہمی کو اپنے ذہن میں سر اٹھانے کی مہلت دینے کو تیار نہ تھی۔ پھر ــــ پھر وہ کہنا کیا چاہتے تھے؟ ہر پھر کر دماغ اسی واقعہ کی طرف پھر جاتا۔ جب اس نے ریحان کی زبانی آزار دہ باتیں سنی تھیں اور کھڑکی میں پلٹنے کے بعد اس کا ریحان سے سامنا ہو گیا تھا۔ یہ باتیں انوکھی تھیں نہ نرالی اس کی تو زندگی طنز کے ایسے تیروں سے چھلنی ہو چکی تھی۔ ریحان نے اس کے سامنے نہ سہی پس پشت اس سے بڑھ کر اسے ذلیل کیا تھا پچھتاوہ تو ایک طرف کسی نے نادم نظر بھی اس پر نہ ڈالی تھی ــــ لیکن اب ــــ؟

وہ متاسف نظر آتے تھے۔ کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی نہ کہہ پا رہے تھے تاسف اور ریحان دو متضاد چیزیں نظر آتی تھیں۔ وہ دیر سے سوچ رہی تھی۔ یہی باتیں۔

اور پھر اس کے ذہن میں ایک لہر سی اٹھی جس کی کرناک ٹیسوں سے وہ بے چین ہو گئی۔ اس نے سوچا ــــ شاید ــــ شاید ریحان کی جدت پسند طبع نے یہ بھی تفنن کا کوئی نیا ذریعہ ڈھونڈا ہے اسے تختۂ تضحیک بنانے کی کوئی نئی

اسکیم دماغ میں سمائی ہے۔ یہ سوچ کر یہ خیال دل و دماغ میں شعلوں کی لپک پیدا کر گیا۔ اس نے جھکا ہوا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ اور پھر اسے چند سال ادھر کا وہ واقعہ یاد آ گیا۔ جب ریحان نے کچھ ایسا ہی روپ بدلا تھا اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل لیا تھا، چاہت اور خلوص میں پیش پیش تھے اسے منحوس کہنے والوں سے اُلجھ پڑتے تھے۔

اور صاعقہ کی محبت و پیار کے جذبات کے لئے ترستی روح اس بدلے ہوئے روپ سے پوری طرح بہک آئی تھی۔ لیکن چند ہی دنوں بعد بناوٹ کا پول کھل گیا تھا اپنے ہم جلیسوں کے سامنے ریحان نے وہ مذاق اڑایا تھا کہ بیمار روح تڑپ تڑپ اٹھی تھی۔

دو گرم گرم آنسو صاعقہ کی آنکھوں سے ہتھیلیوں پر ٹپکے۔ دل کا کتنا درد سمٹا تھا ان آنسوؤں میں انگلیوں کی نازک نازک پوروں سے اس نے آنکھوں کے بھیگے گوشے صاف کئے۔ آنسو اس کی کمزوری کے غماز تھے، وہ شاید یہ کمزوری اپنے آپ پر بھی ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔ یہ خود فریبی ہی سہی لیکن اس میں مصلحت تھی سورج ابھر آیا۔ بھیگی بھیگی ہواؤں کے خشک آنچل سوکھے جا رہے تھے فضا کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ نشیلی صبح کچھ ہوش میں آتی جا رہی تھی وہ دل گرفتہ سی اٹھی ڈھیلے ڈھالے گلابی گاؤن میں وہ کوئی الپسرا نظر آ رہی تھی۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی۔ سوچوں کے تانوں بانوں میں وہ اُلجھی وہ سر جھکائے الحمراء کی بلند و بالا عمارت کی طرف بڑھنے لگی۔

"صاعقہ!"

پشت کی جانب سے کسی نے پکارا — اس نے رک کر پیچھے دیکھا چند قدم کے فاصلے پر ریحان آ رہے تھے۔ وہ اس کے قریب آ کر رک گئے تھے۔ اس نے دیکھا

آج ان پر کچھ وہی کیفیت طاری تھی، تذبذب ــــ کشمکش، کچھ کہنے کو بیتاب نظر آ رہے تھے۔ لیکن کہہ نہ پاتے تھے۔ صاعقہ نے بیگانہ سی نظروں سے انھیں دیکھا۔ ان نظروں میں حیرت قطعاً نہ تھی۔ ریحان نے اس کی طرف دیکھا۔ لب پھڑ پھڑائے لیکن کچھ بولے نہیں۔ صاعقہ نے پھر پور نظر ان پر ڈالی۔ ہلکے نیلے گاؤن میں وہ کتنے حسین نظر آ رہے تھے۔

"کاش، ان کا دل بھی اتنا ہی حسین ہوتا" ضبط کے باوجود صاعقہ کے دل کے کسی نامعلوم گوشے سے صدا اٹھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے منھ پھیر لیا۔ اور جانے کے لئے قدم اٹھایا۔

صاعقہ! ایک سرگوشی ابھری۔ ریحان اس کے کندھے کے قریب آ چکے تھے وہ ایک طرف ہو گئی۔

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں ــــ؟" بڑی ہمت کر کے اس نے بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ــــ" ریحان کے لبوں سے نکلا۔

"کہیئے۔ وہ رک گئی۔

ریحان اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ایک بار اس کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں اس کے سامنے احساس جرم اتنا شدت اختیار کئے ہوئے تھا کہ زبان سے ایک لفظ نکالنا مشکل ہو جاتا۔

"میں منتظر ہوں صاحبزادہ ریحان"

جذبات سے عاری آواز تھی۔

"صاعقہ" ریحان اس طرز تخاطب سے تلملا گئے۔

صاعقہ بہ ظاہر مطمئن کھڑی تھی۔

"یہ انوکھا طرز تخاطب کب سے سیکھا ہے؟" ریحان کے خوبصورت چہرے پر کرب کے آثار تھے۔

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک زہریلا تبسم بکھر گیا۔ بڑے بیگانہ انداز میں بولی۔

"جب اسے اپنے اور آپ کے رتبے کی تفاوت کا احساس ہوا ہے۔"

"صاعقہ!" ریحان اس چوٹ پر تڑپ گئے۔

لیکن وہ تیزی سے وہاں سے چل دی۔ ریحان کا زخمی ذہن اس چوٹ پر تڑپ رہا تھا... انھوں نے دیکھا کہ صاعقہ درختوں کے گھنیر سائے تلے ہوتی ہوئی الحمراء کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ان سے چند گز کے فاصلے پر تھی لیکن ریحان کو یہ فاصلہ صدیوں پر پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ انھیں یوں لگا جیسے وہ اور صاعقہ ازدواجی بدلی کے دو سرے ہوں۔ یہ سرے کہیں کر ملیں گے۔ کیا انھیں ملانے کو کوئی قیامت بھی اٹھے گی۔ قیامت ـــ قیامت۔ قیامت تو ریحان کے سینے میں بپا تھی۔ کیوں کہ نہ یہ قیامت آج ہی بھل جائے۔ تیزی سے قدم اٹھاتے ریحان صاعقہ کی طرف بڑھے اور پھر اس کے برابر آ گئے۔

"صاعقہ!"

انھوں نے تیزی سے پکارا۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ـــ؟" وہ تنک کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"تم ناراض ہو صاعقہ!" ریحان نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے پوچھا صاعقہ کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا لیکن اس نے اپنے برانگیختہ جذبات پر جلد ہی قابو پا لیا۔ ریحان کو اچھی طرح جانتی تھی۔ پھر بھلا کسی خوش فہمی کو دل میں جگہ کیوں دیتی۔

"ناراض ہو؟" ریحان مجرم کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے تھے

"ناراض۔" سنجیدگی کی لہر کی طرح وہ گویا ہوئی۔

"مجھے انتہائی افسوس ہے۔ اس دن میری بیہودہ گوئی سے تمہارے"

"اوہ — اس کے لئے آپ پریشان ہیں؟" طنزیہ لہجہ تھا۔

ریحان کا سر اور جھک گیا۔ بے تابی سے ہاتھ مسلے جا رہے تھے۔

"میں نادم ہوں۔"

"یہ کوئی ایسی بڑی بات تو نہیں۔ جس کے لئے آپ پریشان ہوں۔"

"صاعقہ — مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔"

"شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے۔ راہ میں پڑی لاوارث چیزیں ٹھوکروں کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ جن کے وجود کی تخلیق ہی تختۂ مشق بننے کے لئے ہوئی ہو۔"

"صاعقہ" ریحان نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر آنکھیں بند کر لیں۔

صاعقہ کی بات ادھوری رہ گئی۔ صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کئی ثانیے اسی حالت میں کھڑے رہے، وہ اس وقت اس مجرم کی طرح نظر آ رہے تھے جس نے پولیس کی گرفت سے پہلے ہی اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دیا ہو۔

وہ حقیقتاً متاسف تھے یا اداکاری کر رہے تھے، صاعقہ کچھ بھی تو نہ سمجھ سکی یہ چند ثانیے کتنے کٹھن تھے۔ یہ صاعقہ کا دل ہی جانتا تھا، لیکن گزرے ہوئے ماہ سال سینے پر پھیلے ہوئے لاتعداد داغ صاعقہ کا ذہن اپنی طرف منتقل کر رہے تھے۔ اور ان داغوں کی موجودگی سے وہ اس وقت اسے ریحان کی اداکاری ہی سمجھ سکی۔ یہ کوئی اسکیم تھی۔ اسے بنانے کی وہ اپنے ہم جلیسوں کے لئے شاید قہقہوں کا سامان فراہم کر رہے تھے۔

ریحان سر جھکائے کھڑے تھے۔ صاعقہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی دل برداشتہ۔ دل گرفتہ ہو کر وہ مڑی، اور جانے کے لئے قدم اٹھایا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا گلا بند ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھوں کے آبگینے بھی تو جھلملا رہے تھے۔

"میں انتہائی نادم ہوں ــــ صاعقہ مجھے معاف کر دو" قدم بڑھا کر ریحان ان کے برابر آ گئے۔ صاعقہ رکی۔ پلٹ کر ریحان کی طرف دیکھا اور ڈوبتے لہجے میں بولی "آپ کی متنوع پسند طبیعت نے تفنن کی شاید نئی راہ نکالی ہے لیکن کبھی تو خیال کیا کیجئے کہ جسے آپ تختۂ مشق بناتے ہیں وہ بھی انسان ہے پتھر نہیں"

وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس کی آواز آنسوؤں سے رندھی تھی ریحان گنگ سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہو گئی، اور ریحان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی مجبور و مجبور کے ہونٹوں سے اک سسکی پھسل کر فضا میں تحلیل ہو گئی ہے۔

لیکن اتنا تو خیال کیا کیجئے کہ جسے آپ تختۂ مشق بناتے ہیں وہ بھی انسان ہے پتھر نہیں ــــ" آنسوؤں میں ڈوبی آواز ریحان کے کانوں سے مسلسل ٹکرا رہی ہے۔ بستر پر بے چین کروٹیں بدلتے ہوئے وہ اس آواز کے سوز میں اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ رات دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ ریحان کئی بار سر جھٹک کر افکار پریشان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر چکے تھے۔ مو

جانے کی کوشش میں بار بار آنکھیں بند کر چکے تھے۔ لیکن نہ نیند آتی تھی نہ قرار دل سیماب کی طرح بے قرار تھا۔ روح لاتعداد وزنی پتھروں کا دباؤ محسوس کر رہی تھی۔ سگریٹ پی پی کر ان کا حلق جلنے لگا تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر جسم دکھ رہا تھا۔ خوابگاہ کا خوابناک ماحول بھی نیند میں مددگار ثابت نہ ہو رہا تھا۔ سبز، لیمپ کی تیز روشنی کئی بار بجھی اور جلائی گئی۔ نہ اندھیرے سکون بخش سکے نہ اجالے۔ ایک ہی جملہ قیامت بپا کئے ہوئے تھا دل سوز تاثر سے سینے میں بیٹھا جا رہا تھا۔

"صاعقہ۔ صاعقہ" ان کا رواں رواں ہمہ آواز بنا جا رہا تھا۔

گھبرا کر ریحان بستر سے اٹھے۔ جلدی سے عقبی دریچے کے پٹ کھول دیئے انھیں کیا ہو گیا تھا، کیا ہو رہا تھا، پتھا وہ اتنا جانگسل کیوں بنا جا رہا تھا۔ احساس جرم اتنا شدید کیوں ہو گیا تھا کہ چین و سکون انکے لئے حرف غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ریحان کے تپتے ہوئے دل و دماغ کو کچھ سکون بخشا۔ دودھیا چاندنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔ گلابی جاڑوں کی یہ چاندنی رات دلکشی کے اعتبار سے انوکھی ہی تو تھی۔ انھیں کچھ سکون ملا۔ اور اپنے جذبات کا تجزیہ کرنے کو وہ اپنے ذہن میں توانائی کی پانے لگا۔ سگریٹ سلگا کر وہ کھڑکی میں کھڑے فضا میں گھورنے لگے وہ کھو گئے۔ اپنے آپ میں کھو گئے۔ اور جب الحمراء کے گھڑیال کی آواز نے انھیں چونکایا تو انکے دل کا کوئی گوشہ چپکے چپکے سلگ رہا تھا۔ لیکن یہ جلن اذیت نہ دے رہی تھی۔

ایک انوکھا سرور۔ اک کسک بھرا سکون اک مسحور کن سی تڑپ دے رہی تھی یہ جلن اور۔ یہ سکون، یہ تڑپ انکے حواس پر نشہ بن کر چھا رہی تھی ہونٹوں پر ایک محجوب تبسم تھا آنکھوں میں نکھرتے ہوئے جلوؤں کا پرتو سگریٹ باہر پھینک کر وہ پلٹے

سوچ رہے تھے کہ وہ اب تک کہاں تھے۔ صاعقہ کے قریب رہتے ہوئے بھی وہ اس کی رنگینی سے نگاہیں کو سیراب کیوں نہ کر سکے۔ صاعقہ جسے اک بے رنگ مصرعہ سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے تھے۔ عمر خیام کا مخمور کلام تھی۔

وہ کھڑکی سے ہٹے ۔۔۔ نیا سگریٹ سلگایا اور مسہری پر لیٹ گئے۔ کافی دیر تک وہ یونہی پڑے ۔۔۔ صرف صاعقہ کا خیال ان کے حواس پر چھایا ہوا تھا، انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے مدتوں کا سویا ہوا پیار اس ایک لمحہ میں جاگ اٹھا تھا۔ جب انھوں نے صاعقہ کی دھندلائی آنکھوں میں پہلی بار جھانکا تھا۔ اس ایک لمحے میں ازل و ابد کی ساری مسافتیں طے ہو گئی تھیں۔ صاعقہ سے معافی مانگنے کا جذبہ بےپناہ تھا۔ بلکہ پیار کی مچلی ہوئی جبلتیں تھیں۔

سگریٹ پھینک کر انھوں نے ایک طویل انگڑائی لی۔ یوں بستر پر لیٹے جیسے سارے روحانی بوجھ جھٹک کر ہلکے پھلکے ہو گئے ہوں۔ صاعقہ اور ریحان اور صاعقہ ایک ہی چیز کے دو نام محسوس ہو رہے تھے وہ انکی جنم جنم کی ساتھی ہو۔ ان کے دل کا درد ہو ۔۔۔ اور ان کی حیات کی گرمی ہو۔ رات گزر گئی اور اس گدلی رات کی آغوش سے ایک نورانی صبح جنم لے کر بیدار ہوئی۔

ریحان کی زندگی میں روشنی ابھر آئی۔ گدلی رات کے بھیگے اندھیروں کا کہیں نام نہ تھا۔ وہ سرتاپا بدلی ہوئی ذہنیتوں سے دوچار تھے، آنکھیں دھوری نیند کے نشے سے کچھ مخمور تھیں۔ بند بند میں ایک لطیف سا شبنمی اکڑاؤ تھا رات بھر کی بے قراری سے ایک کیف آمیز سی تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں اک انوکھا سا ۔۔۔ نرالا سا ۔۔۔ سکون بخش درد تھا۔

صاعقہ کی محرومیوں، مایوسیوں اور تنہائیوں کو اپنے پیار کی وسعتوں میں سمو لینے کا تہیہ کر کے وہ کتنے مسرور نظر آ رہے تھے۔

زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر کے ریحان انتہائی مطمئن نظر آ رہے تھے۔ اور اس دن کئی دنوں کی پژمردگی کے بعد ان کی طبیعت اپنے معمول پہ آئی۔ ساتھی ان سے نالاں تھے۔ ان کی مرجھائی ہوئی طبیعت سب کے لئے اضمحلال کا باعث بن چکی تھی۔ لیکن آج ان کے مزاج کی شگفتگی عود کر آئی۔ اس دن وہ اپنے ہم جلیسوں سے مل کر بیٹھے۔ ان کے قہقہوں سے بجھی ہوئی محفل نے نئی زندگی پائی۔

اسد ریحان کے اس پلٹے پر حیران ضرور تھے، اور دل سے کچھ زیادہ ہی ان کے قریب تھے، مزاج کے اس اتار چڑھاؤ سے انھوں نے بہت کچھ سمجھ لیا تھا۔ لیکن جو فیصلہ کر چکے تھے، وہ تو ان کی فہم دسترس سے بعید تھا۔

اسی شام ریحان اور اسد باتیں کرتے ہوئے پائیں باغ میں اتر گئے۔ ڈوبتے سورج کی سرخیوں کا انعکاس بڑا دلفریب تھا۔ ریحان اس حسین منظر میں خود بھی ڈوبے جا رہے تھے، فضا کا حسن ذہن میں اسے حسن سے کتنی مطابقت کر رہا تھا۔

"کاش وقت یہیں تھم جائے۔ دور خاموشی کے عالم میں وہ بولے۔

"اوہو۔" اسد مسکرائے۔

"کیوں؟"

"شکر ہے تم لوٹ آئے، اتنے دنوں جانے کہاں غائب تھے۔"

ریحان اس بات پر دھیرے سے مسکرا دیئے، ان کی نگاہیں مخمور تھیں۔

"مزاج شریف کو کیا ہوا تھا؟" اسد نے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

"سب باتیں نہیں پوچھا کرتے۔" وہ نیم وا نظروں سے اسد کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔

"وجہ؟"

"بس۔"

"اگر میں پوچھنے کی جسارت کروں!"

"یہی کہوں گا۔ نیا ڈگمگا رہی ہے۔"

"اور اب؟"

"کنارہ نظر آ گیا۔"

"نظر ہی آیا ہے صرف؟"

"نظر آ جائے تو پا لینا دشوار نہیں۔"

"موجیں بڑی طوفانی ہوتی ہیں۔"

"طوفانی ارادے ان سے ٹکراتے ہیں۔"

"حوصلے بڑے بلند ہیں؟"

ریحان نے جواب میں ایسی مستحکم سی نظر اسد پر ڈالی کہ انھیں یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی نظر کی رفعت کے مقابلہ میں آسمانوں کی بلندیاں حقیر سی پستیاں نظر آئیں۔

اسد کا اشارہ ساری گفتگو میں صاعقہ ہی کی طرف تھا۔ ریحان کے جواب سے وہ کچھ شدر رہے نظر آنے لگے۔ جیسے ان کی باتوں پر یقین نہ ہو۔

"کیوں؟" ریحان نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" جواباً مسکرا دیئے۔

کچھ دیر دونوں ٹہلتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اسد کے دل میں ریحان کی باتوں سے کچھ خلش سی ہو رہی تھی۔ اچانک انھوں نے موضوع بدلا بولے

"آج کل صاعقہ بڑی پریشان رہتی ہیں۔"

"ہوں۔" ریحان نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"شاید اس دن والی باتیں سن کر اثر لیا ہے۔"

"یقیناً ــــ"۔

"تم نے کبھی توجہ کردی تھی۔ کیا بدکلامی کی تھی توبہ"۔

"یہی خلش تو جگر کے پار ہے اسد"۔

"معافی مانگ لی ہوتی۔ زخموں کا مداوا نہ سہی، اسے کچھ سکون تو ملتا"۔

"کتنے دنوں سے یہی سوچ رہا تھا" ریحان شیفتگی سے مسکرائے۔

"سوچ ہی رہے تھے۔ عملاً کچھ نہ کرسکے" اسد نے تلخی سے کہا۔

ریحان نے چاہا اپنی زندگی کے اہم ترین پلٹے سے انھیں آگاہ کردیں لیکن کچھ سوچ کر وہ چپ ہو رہے شاید راز دل عیاں کرنے کا ابھی موقعہ نہیں تھا۔

"میں نے کہا اخلاقی تقاضہ تو یہی تھا معافی مانگ لیتے"۔

"میں نے بھی تو یہی کہا ہے کہ کئی دنوں سے یہی سوچ رہا تھا۔

"سوچ لیا؟" اسد کو تاؤ سا آگیا۔

"ہاں"۔

"کیا؟"

"یہی تمھیں کہہ رہا تھا تا کنارہ نظر آگیا۔

اسد نے کچھ پوچھنا چاہا۔ لیکن ریحان نے ان کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا "کنارہ نظر آجائے تو پا لینا دشوار نہیں ہوتا۔ اسد۔ موجیں کتنی طوفانی ہوں ناخدا ان سے ٹکرانا جانتے ہیں"۔

اسد کچھ سمجھے تو نہیں۔ ریحان انھیں تذبذب میں دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

کہاں مرگئی کمبخت۔ چابیوں کے لئے بھیجا تھا نہ خود آئی نہ چابیاں بھیجیں۔ لڑکی کے تیور دن بدن ادر سے ادر ہوتے جارہے ہیں۔ اللہ جانے کیا دن دکھائے گی۔

"یہ کس پر عتاب نازل ہو رہا ہے دادی حضور؟" ریحان نے دادی کی نشست گاہ میں آتے ہی پوچھا۔ دادی غصہ میں بھری چیزیں الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ بڑبڑاتی ہوئی ریحان کا جواب دیئے بغیر برابر والے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئیں۔

"یہ کس کی شامت آئی" ریحان نے مسکراتے ہوئے انجم پھوپھی سے کہا۔

"ایک ہی تو ہے، جس کی تقدیر میں عتاب ہی عتاب ہے" انجم کا دل دکھ رہا تھا۔ ریحان کا رنگ ایک لمحہ میں کئی رنگ بدل گیا۔ مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اور چہرے پر ایک گمبھیر سنجیدگی چھا گئی۔ وہ جہاں تھے وہیں رہ گئے چپ چاپ سے داہنے ہاتھ بیٹھی ہوئی فوزیہ بڑے طنزیہ انداز میں بولی "بڑا بڑا لگا؟"

"برا لگے؟" انجم برس پڑیں۔ "صبح شام اسی کمبخت کو کوسا جاتا ہے، قصور ہو نہ ہو، مورد الزام وہی ہے"

"قصور کے بغیر بھی کوئی کچھ کہتا ہے" الماری میں سے سعدیہ کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے بولیں۔

"دو گھنٹے چابیوں کے لئے کہا تھا خالہ جان نے۔ ابھی تک نہ لائیں تو کیا کرتیں" فوزیہ بولی۔ دادی کے حکم کا تو پاس ہونا چاہیئے تھا۔

"کیا ہو گیا۔ بھول گئی ہو گی۔ ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی جو اسے متواتر کوسنے دیے رہے ہیں۔" انجم غصے میں تھیں۔ "اس کی کسی بات کو درگزر کرنا تو کوئی جانتا ہی نہیں۔ بات بڑھائی جاتی ہے، دبائی نہیں جاتی۔

"اے ہے آپا، آپ آپ تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئیں، جیسے ہم اسے کوس رہے ہیں۔" فوزیہ نے خفگی سے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

"تمھیں کیا پڑی ہے — تم خواہ مخواہ الجھ پڑیں —" سعدیہ نے بہن کو ملامت کی۔

دادی کے حکم کا پاس تو ہونا چاہیئے تھا۔ میں نے اتنی سی بات کہی ہے۔

فوزیہ شاید لڑائی کے موڈ میں تھی۔

"انجم تم بھی خواہ مخواہ برا نہ مانو — سب دیکھ رہے ہیں کہ لڑکی دن بدن لاپرواہ ہوتی جا رہی ہے۔ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں —" سعدیہ نے نکتہ کیا

"نہ گھر سے دلچسپی، نہ گھر والوں سے —" فوزیہ نے قہقہہ دیا۔ "ماں کی طرح بیزار ہی رہتی ہے ہر وقت —"

"بیزار نہ رہے گی تو اور کیا ہو گا۔ گھر والوں کا سلوک اس سے کونسا اچھا ہے بھیانہ سلوک سوائے بیزاری کے اور کونسا جذبہ پیدا کر سکتا ہے۔"

انجم نے زہر اگلا۔

"سب اسے پتھر سمجھتے ہیں پھوپھی جان — پتھر — ریحان کے ہونٹ پھر کپکپا رہے ہیں۔

فوزیہ اور سعدیہ نے پلٹ کر حیرت سے ریحان کی طرف دیکھا، اسے سنجیدہ دیکھ کر فوزیہ ہنس دی — "سبحان اللہ تمھیں بھی زبان مل گئی اسما کی قصیدہ گوئی کے لئے۔"

"حق کی بات کہہ رہا ہوں۔" ریحان سنجیدگی سے بولے۔

"انجم تو حمایت کرتی ہی تھیں۔ اب یہ بھی بولنے لگے۔" سعدیہ نے تیز نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"کچھ خوف خدا بھی ہونا چاہئے سعدیہ!" انجم سمجھانے کی انداز میں گویا تھیں۔ "بن ماں باپ کی بچی ہے، کسی وقت تو ــــ"

"کیا بات ہے؟" دادی حسن بانو کمرے میں آتے ہوئے بولی۔ ریحان کمرے سے چپ چاپ نکل گئے۔

"آپ پوتی کو کوس رہی ہیں۔" انجم کو برا لگا۔ سعدیہ نے بات بڑھائی۔

"کیا تیر مار دیا ہیں نے؟" ماں بھر گئیں ــــ "تمھیں نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ انجم کام کی رہی ہے نہ کاج کی۔

"امی حضور!" انجم نے زبان کھولی۔ "ہمارا وقت کنیزوں کی طرح آپ اس سے کام لینا چاہتی ہیں!"

"اے ہے لڑکی ــ کیا ہو گیا ہے تجھے ــ کونسا کوٹھوں کے بیل کی طرح جتی رہتی ہے وہ کام میں ــ۔ وہ تو کسی کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔ کام کیا کرے گی۔

"میں نے تو اکثر اسے کام کرتے ہی دیکھا ہے، اور کبھی تو اس کے برابر کی لڑکیاں ہیں گھر میں ــ"

"ہماری لڑکیوں کا تو اس سے مقابلہ نہ کر دبہن۔" سعدیہ نے ٹوک دیا۔

بات خاصی الجھ گئی۔ اور اچھی خاصی دیر تک بحث ہوتی رہی۔ ریحان کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ ماں، چچی اور دادی کے سلوک کو دیکھ کر طبیعت مکدر سی ہو گئی۔ صاعقہ کے ساتھ سب کا سلوک ناروا تھا شاید آج انھیں اس

بات کا صحیح اندازہ ہوا تھا۔ ریحان باغ میں اتر گئے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی، مطلع ابر آلود تھا فضا میں خنکی تھی۔ جس میں سبزے کی باس رچی ہوئی تھی۔ رنگ برنگے پھولوں نے جیسے آگ لگا رکھی تھی۔

تناور درختوں کی جھکی جھکی گھنیری شاخیں ہوا کے چھیڑ سے جھوم رہی تھیں، ریحان اپنی سوچوں میں گم اُلجھے اُلجھے ٹہل رہے تھے۔

وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے درختوں کے مہکتے سایوں تلے پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ اچانک وہ رک گئے۔

ستار کے تاروں کو کوئی چھیڑ رہا تھا۔ ایک مبہم سی لے تھی، جو فضا میں ترنم بکھیر رہی تھی۔

چند ثانیے ریحان نے ادھر اُدھر دیکھا۔ آواز کی سمت اندازہ لگایا، آواز دائیں طرف درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے آ رہی تھی۔ ریحان مڑے اور اسی سمت چلنے لگے۔ آواز جیسے مقناطیسی کشش تھی۔ جو انھیں کھینچے لئے جا رہی تھی۔

ایک برگد کے بوڑھے درخت کے گرد گھومنے پر انکی نگاہیں سامنے سبزے پر پڑیں۔ صاعقہ بیخودی کے عالم میں درخت کے تنے سے کمر ٹکائے نیم دراز تھی۔ اس کی گود میں ستار تھا۔ اس کی انگلیاں لاشعوری طور پر تاروں کو چھیڑ رہی تھیں۔ وہ ستار بجا نہیں رہی تھی۔ یونہی تاروں سے کھیل رہی تھی۔ نظروں کا جمود بتا رہا تھا کہ وہ لاشعور سوچوں کے تانے بانے میں اُلجھی ہوئی ہے، بے چین خیالوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس کے ڈوبنے کا اندازہ کتنا دلفریب تھا۔ ریحان کا بے ساختہ جی چاہا کہ وقت کے پاؤں کی زنجیر بن کر اس کی رفتار کو یہیں روک لیں۔ لمحات تھم جائیں صاعقہ اسی انداز میں ڈوبی رہے۔ اور ــــ وہ درخت کی جھومتی شاخوں کو سہارا

لئے اس کے ڈوبنے کے دلفریب انداز میں کھوئے رہیں۔ لیکن وقت رک نہ سکا لمحات تھم نہ سکے۔

جانے کوئی آہٹ ہوئی، یا دل کی دھڑکن آواز بن گئی۔ صاعقہ کی نظروں کا جمود ٹوٹ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دائیں طرف دیکھا۔

"ریحان"

ایک حیران سی ــــ مبہم سی آواز اس کے لبوں سے نکلی۔ اسکی آنکھوں میں وہ کیفیت لہرائی جو سپنے حقیقت بن جانے پر آنکھوں میں گھل جاتی ہے لیکن دوسرے لمحہ اس پر گھبراہٹ طاری تھی۔

کچھ بھی حال ریحان کا تھا۔ گھبرا سے گئے، جیسے کوئی پارسا چوری کرتے پکڑا جائے۔ لیکن جلد ہی گھبراہٹ پر قابو پالیا۔ دماغ میں اس خفت و گھبراہٹ کو چھپانے کی بات آگئی۔

دو قدم اٹھا کر اس کے قریب آئے اور بولے "تمھیں دادی حضور بلا رہی ہیں"

"مجھے؟" کشادہ آنکھیں حیرت سے کچھ اور کھل گئیں۔

"ہاں" کیوں؟"

"شاید ان کی چابیاں ــــ"

"آ ــ و ــ ہ!" صاعقہ ایک دم سہم گئی، اس کی خوبصورت آنکھوں میں ڈر کے تاریک سائے لہرا گئے۔ مضراب اتارتے ہوئے وہ بری طرح گھبرا رہی تھی "وہ غصہ ہو رہی ہوں گی" وہ بڑبڑائی۔

"بیت!"

صاعقہ نے ستار ایک طرف رکھ دیا۔ میں قطعاً بھول گئی تھی" وہ جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر جانے لگی۔

"بھولنے کی سزا تو پاؤ گی"

ریحان نے شوخی سے کہا۔

"سزا تو مقدر بن چکی ہے" آہستگی سے کہہ کر صاعقہ تیز قدموں سے چلا دی، ریحان اسے دیکھتے رہ گئے۔

صاعقہ کے لہجے کی افسردگی نے ریحان کو بھی افسردہ کر دیا، پہلے ہی طبیعت مکدر تھی، اس پر یہ مایوس تکلم ۔۔۔ وہ بے طرح افسردہ نظر آنے لگے۔

صاعقہ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ وہ اسے دیکھتے رہے اک گہری سانس لے کر وہ مڑے۔ درخت کے تنے کے قریب ستار رکھا تھا انھوں نے ستار کی طرف دیکھا۔ اور جانے کس جذبے کے تحت وہ آگے بڑھے صاعقہ کی جگہ بیٹھتے ہوئے انھوں نے ستار اٹھا لیا۔ مضراب لی اور ستار کے تاروں پر ان کی انگلیاں رقص کرنے لگیں اور کافی دیر بعد جب صاعقہ واپس لوٹی تو باغ کا سناٹا ستار کے تین سروں سے ٹوٹ رہا تھا۔

وہ دبے قدموں سے آگے بڑھی۔ جھجکتی سی نگاہ ڈالی۔ ریحان بیخود تھے۔ آنکھیں بند تھیں، بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے، اور انگلیاں تیزی سے تاروں کو جھنجھوڑ رہی تھیں نغمے ابل رہے تھے۔ تار جھنجھنا رہے تھے اور ساری فضا میں درد ہی درد بھرا ہوا تھا۔ صاعقہ آج ریحان کا نیا روپ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ دیکھتی رہی۔ ریحان کی وجدانی کیفیت عروج پر تھی۔

تار چیخ رہے تھے، اور ان کی چیخوں میں صاعقہ کو اپنی زخمی روح کی پکار سنائی دے رہی تھی۔ اس پر مجنونانہ کیفیت طاری تھی۔ اتنا عظیم فنکار جس نے اس کے درد کو چھو لیا تھا۔ صاعقہ کا جی چاہا کہ اس قدموں سے لپٹ جائے اور انگلیوں کو تھام لے جو اس کی روح کے تاروں کو چھیڑ رہی تھیں تار چیخ رہے۔

درد فضا میں بکھرتا رہا۔ ریحان پر بے خودی طاری تھی۔ آخر ریحان نے صاعقہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔ آنسو بے اختیار آنکھوں سے گرنے لگے۔

"بس کرو — ریحان بس کرو!" وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہتی تھی لیکن کہہ نہ سکی۔ وہ بے اختیار رو گئی۔

اور بے اختیارانہ ریحان کی طرف بڑھی۔ اس عظیم فنکار کے قدموں کو چومنے کیلئے اس کی درد بکھیرتی انگلیوں کو تھام لینے کیلئے۔ لیکن دفعتاً اسے ہوش آگیا۔ وہ کیا کرنے والی تھی۔ انگاروں کی تپش دور ہی سے کیا کم تھی جو وہ انھیں چھو لینے پر تلی تھی۔

اسے ان انگاروں سے دور رہنا۔ دور — دور — اور دور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔ تیزی سے بھاگتی رہی۔ دور — دور — وہ ان انگاروں سے دور بھاگنا چاہتی تھی۔

اس موسم میں شام نگر کے باغوں میں پکنک تو اب ایک رسم بن گئی تھی۔ ہر سال یہ پکنک اک خاص اہتمام سے منائی جاتی۔ سارا کنبہ اکٹھا ہوتا اور تین چار دن ان مہکتی فضاؤں میں جی بھر کر لطف زندگانی اٹھایا جاتا۔

حسب سابق اس سال بھی پکنک کا پروگرام تھا۔ تیاریاں زوروں پر تھیں۔ خدام اور کنیزوں کا ایک قافلہ سارا روانہ ہو چکا تھا کہ لیلیٰ خانہ کے پہونچنے سے پہلے ضرورت و آرام کی ہر چیز تیار رکھی جائے۔

چھوٹے بڑے پکنک کی تیاریوں میں مصروف تھے، کمیرا نے تو پھولوں کی

مناسبت سے لباس تبدیل کروائے تھے۔ خاندان کی سب جوان لڑکیاں امنگوں اور چاہتوں سے اپنے لباسوں کی ترتیب میں مصروف تھیں۔

خوشی کی ایک لہر تھی، جو گھر کے ہر فرد کو چھوتے ہوئے گزر رہی تھی۔ ریحان بھی نئی امنگوں اک نئے ولولے سے تیاری کر رہے تھے۔ صاعقہ کی قربت کی ان دنوں میسر آنے کی بڑی توقع تھی، وہ اپنے دل کی دھڑکنیں اس رنگین فضا میں صاعقہ تک ضرور پہونچ جائیں گے۔

لیکن خوشی کی لہر صاعقہ سے ٹکرا کر رنج و غم کی ندی بن جاتی تھی۔ وہ آجکل کتنی پریشان تھی۔ ... طوفان میں گھر کر رہ گئی تھی۔ ریحان کا بڑھتا ہوا انتقامات ساری ذہنی پریشانیوں کا موجب تھا۔

ان کی نظروں کی ملاست ـــ خاموش تعاقب اور رازداز شیفتگی سے وہ بے خبر نہ تھی۔ لیکن اس کا ذہن ان کی صداقت سے انکاری تھا۔ وہ اس بدلے ہوئے رویہ کو ریحان کی جدت پسند طبع کا اک کرشمہ سمجھ رہی تھی، بہروپئے نے اور ہم جلیسوں کی دل لگی اور قہقہوں کے لئے سامان فراہم کرنے کے لئے ایک نیا روپ دھارا تھا۔

انجم پھوپھی اور خود چچا گھر والوں کے ذہنی دھارے نہ بدل سکے تھے۔ اسد نے کسی حد تک اپنے ہم عمر ساتھیوں کی سوچ کے رخ کسی حد تک ضرور موڑ لئے تھے، اور اب ریحان کے بدلے ہوئے رویہ سے تقریباً سب نوجوانوں کا رویہ صاعقہ سے کسی حد تک نرم ضرور ہو گیا تھا۔

اب اسے اپنی محفل میں شرکت کی دعوت دی جاتی۔ سنیما کا پروگرام ہوتا تو اسے مدعو کیا جاتا۔ گھر میں کوئی تقریب ہوتی تو اس کی شرکت دوسرے افراد کی طرح ضروری سمجھی جاتی۔ حسن بانو کو کوفت ہوتی۔ سعدیہ اور نوزیہ غراتی

رہتیں۔ لیکن نئی پود نے اپنے رویے میں خاصی لچک پیدا کرلی تھی۔ صرف کبریٰ واحد فرد تھی جس کے رویہ میں تبدیلی نہ ہوئی۔ صاعقہ اب بھی اسکی نظروں میں کھٹک رہی تھی۔ منحوس بدشگونیوں کا عنوان تھی۔ یہ سب اس کی والدہ فوزیہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ پکنک کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ ثمینہ نے صاعقہ سے چلنے کی پرزور سفارش کی تھی۔ گل رخ، شاہ رخ اور فریدہ نے بھی یاد دہانی کرائی تھی لیکن صاعقہ پکنک پر نہ جانے کا پختہ تہیہ کر چکی تھی۔ ان سب کا التفات اسکی ذہنی پریشانیوں میں نئے افسانے کا باعث بنتا جا رہا تھا۔ وہ اس اخلاق و مروت کو رجحان کی سوچی سمجھی سازش سے تعبیر کر رہی تھی۔ مطمئن ہونے کی بجائے وہ خوفزدہ سی ہو جاتی تھی۔

پکنک پر روانگی کا دن آپہونچا۔ صبح ہی صبح یہ قافلہ کوچ کرنے والا تھا موٹروں کی قطار کھڑی تھی۔ جو گیٹ تک جا پہونچی تھی۔ کچھ ضروری سامان پیچھے میں لادا جا رہا تھا۔

صاعقہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اداس پریشان افسردہ زندگی نے کاش اسے بھی جینے کا حق دیا ہوتا۔ کتنی چہل پہل تھی الحمراء میں۔ اسکی ہم عمر لڑکیوں کے شوخ و شنگ لباس انکے سینے میں دھڑکتی ہوئی خوشیوں، امنگوں اور ولولوں کی ترجمانی کر رہے تھے۔ مسکراتے چہروں پر ذہنی سکون و طمانیت کی کتنی واضح جھلک تھی۔ وہ ثمینہ، شاہ رخ اور فریدہ وغیرہ کے اصرار کے باوجود پکنک پر نہیں جا رہی تھی۔

پچھلے ہی سال کا تو واقعہ تھا۔ گل رخ اسی طرح تھی۔ صبح ہی صبح کاریں الحمراء کے پورچ سے لے کر گیٹ تک لمبی قطاریں بناتی چلی گئی تھیں۔ بچے بچے دل سے وہ بھی تیار ہوئی تھی اور پورچ میں ایک ستون کے ساتھ ٹک کر کھڑی کاروں

بیٹا سوار ہونے والوں کو دیکھ رہی تھی۔

"آجاؤ صاعقہ۔" انجم پھوپھی نے بلایا تھا۔

"اس موٹر میں جگہ نہیں ہے۔" ریحان نے اسٹیئرنگ تھامتے ہوئے کہا تھا اور اس کے اٹھتے قدم برآمدے کی سیڑھیوں پر ہی رک گئے تھے۔

"کیوں تنگ کرتے ہو ریحان۔ پچھلی سیٹ پر تین لڑکیاں بیٹھ سکتی ہیں۔"

"صاعقہ نہیں۔" ریحان نے ہنس کر آہستگی سے کہا تھا لیکن اس نے اپنا نام سن لیا تھا۔

"کیوں۔؟"

"پھوپھی جان کیوں اجل کو اپنے ساتھ سوار کرا رہی ہیں۔ آپ چلاتی ہیں راستے ہی میں ٹکر ہو جائے۔"

"ریحان۔ چپ رہو۔" انجم پھوپھی نہیں چاہتی تھیں، یہ آواز صاعقہ تک پہنچے۔

"غلط تھوڑا ہی کہہ رہا ہوں۔ ہماری زندگی عزیز نہیں۔ تو بیشک آزما دیکھئے"

"ایسے بھی ہو جاتا ہے آخر۔"

"سامان والی ویگنوں میں بٹھا دیجئے۔ ٹکر ہو بھی گئی تو مالی نقصان ہوگا۔ جانی نہیں۔" ریحان نے قہقہہ لگایا تھا۔

اور صاعقہ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں بھاگی تھی۔

ریحان کو بری طرح ملامت کرنے کے بعد انجم پھوپھی نے آکر کتنے پیار سے اسے چمکارا تھا۔ کتنی تسلیاں دی تھیں۔ کس محبت سے اس کے آنسو پونچھے تھے اور جب بھی وہ چپ نہ ہوئی تو خود بھی رونے لگی تھیں۔ کتنا فراخ اور دردمند دل تھا ان کے سینے میں صاعقہ والہانہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

لیکن اس پیار کے باوجود ریحان کی باتوں کی خلش دل سے نہ نکلتی تھی

پچھلے سال کا واقعہ چٹان بن گیا تھا۔ اور فریدہ، شاہ برغ اور ثمینہ کے محبت بھرے اصرار کے باوجود وہ چٹان نہ پھلانگ سکی تھی۔ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی رنگ و بو کے جھلملاتے سیلاب کو دیکھ رہی تھی۔

الحمراء کے بیرونی برآمدے میں ایک مسرور سا شور تھا۔ نئی پوداج مادی حسن بانو سے کبھی مرعوب نہ تھی۔ سبھی خوشی چہچہا رہے تھے سب ——

ریحان آئے۔ فاختئی سوٹ میں ان کا فراخ حسن کتنا نکھرا ہوا تھا۔ کتنے مسرور نظر آرہے تھے وہ ——

آتے ہی انھوں نے برآمدہ اور پورچ میں جمع شدہ لوگوں پر اک اچٹتی سی نگاہ ڈالی نگاہیں گوہر مقصود نہ پاکر حیران سی ہوگئیں۔ لوگ کاروں میں بیٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ ریحان جلدی سے کاروں کی طرف آئے ایک ایک گاڑی دیکھی۔ —— رنگ و بو کا سیلاب موٹروں میں سما گیا تھا۔ لیکن صاعقہ انھیں کہیں نظر نہ آئی —— کیا وہ پکنک پر نہیں جا رہی۔؟ اس خیال سے انکی ساری خوشیوں پر جیسے اوس پڑ گئی۔ کا۔ چار رینگنا شروع ہو گئیں۔ اسد، فرخ، فریدوں اور شاہ برغ نے موٹر کا ہارن زور سے دے کر انھیں متوجہ کیا۔ لیکن ریحان انکی طرف دیکھے بغیر اندر کی طرف لپکے۔ وہ صاعقہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ برآمدے میں آیا سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"صاعقہ کہاں ہیں ——؟" ریحان نے جلدی سے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں ——!"

"تیار ہو رہی ہیں ——؟"

"نہیں"

"کیوں ——؟"

"وہ تو نہیں جا رہی ہیں۔"

"کیوں۔؟"

"اللہ جانے۔ بہتیرا کہا ہے۔ ایک رہی نہ ہے"

آیا جانے کیا کہتی رہی۔ ریحان تیز قدموں سے اس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"صاعقہ!" پردہ ہٹاتے ہوئے انھوں نے ملائمت سے پکارا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو نگاہ حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ اسکی محویت اس آواز سے ٹوٹی۔ جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ ریحان کو پردہ تھامے کھڑے دیکھ کر وہ حیران سی رہ گئی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں۔؟" ریحان اس کی نظروں سے کچھ نادم سے ہو گئے۔

"کیوں۔؟" وہ اب تک حیران تھی۔

"جاؤ گی نہیں۔؟" وہ اسی انداز میں بولے۔

صاعقہ نے سر تا پا ریحان کو دیکھا۔ ریحان دو قدم بڑھا کر اندر آ گئے۔ پریشان پریشان سے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے صاعقہ کی طرف دیکھا۔ دونوں نظریں ملتیں۔ جذبات کے اظہار میں کتنی صادق ہوتی ہیں نظریں۔ سب کچھ صاف صاف کہہ دیتی ہیں۔ کچھ بھی تو نہیں چھپاتیں۔ لیکن بھٹکے ہوئے ذہن ان نظروں کی صداقت پر ایمان کہاں لاتے ہیں۔ صاعقہ نے جلدی سے رخ پھیر لیا۔ اور باہر دیکھنے لگی۔ چند لمحے بوجھل سا سکوت رہا۔ پھر ریحان آہستگی سے مایوسی کی آواز میں بولے۔ "تم نہیں جا رہی ہو۔؟"

"نہیں۔!" تلخ سا جواب تھا۔

ریحان نہ جانے کی وجہ پوچھنے کی جرأت تو نہ کر سکے۔ ہاں اسے آمادہ کرنے کے لئے بولے۔ "سب جا رہے ہیں۔ تم اکیلی یہاں کیا کرو گی۔!"

اور صاعقہ نے جواباً ایسی نظروں سے انھیں دیکھا کہ ریحان تڑپ کر رہ گئے۔
کتنا طنز تھا اس کی نظروں میں۔!

"تیار ہو جاؤ نا۔!" وہ لجاجت سے بولے۔ صاعقہ نے مڑ کر ریحان کی طرف دیکھا۔ اور پچھلے سال کا سلگتا ہوا واقعہ اس کے ذہن میں اس طرح دہک اٹھا جس طرح پھونک مارنے سے راکھ اڑنے پر چنگاریاں دہکنے لگتی ہے۔

ریحان ان نظروں کی تاب نہ لاکے مرتے ہوئے گھبرائی کی آواز میں بولے "جلدی کرو ــــ تیار ہو جاؤ ــــ تمھیں جانا ہوگا۔

"لیکن جاؤں گی کیسے۔" صاعقہ کے لبوں پر ایک جلتی ہوئی مسکراہٹ تھی۔

ریحان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا ــــ حیران کی نظروں سے طنز کا لپکا سا نظر آیا صاعقہ کی آنکھوں میں استفہامی نظروں سے دیکھا۔ لیکن کچھ کہا نہ گیا۔

"دو منٹ میں تو کھپ کی جا چکیں ــــ" صاعقہ نے بھرپور وار کیا۔

"صاعقہ!" ریحان تڑپ اٹھے ــــ بیچارگی، ندامت اور احساس شکستگی ان کے سراپا پر چھا گیا۔ اپنے الفاظ انھیں بھولے نہیں تھے اور آج ہی صبح صاعقہ نے بھی تو پچھلے سال کا یہ واقعہ دہرا کر انھیں احساس ندامت سے دوچار کیا تھا۔

اک خراش مٹانا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں تو زخم ہی زخم تھے۔ ریحان کتنے مضطرب، کتنے پریشان اور کتنے ناداں دکھائی دے رہے تھے۔ وہ صاعقہ کے ذہن سے اتار سے زخموں کو کیوں کر مٹا سکیں گے۔ یہ احساس جان لیوا ہی تو تھا۔

اک دھواں سا سینے سے اٹھا اور انکا دم گھٹنے لگا۔ دل فگار سی آہ لبوں پر تھرتھرائی۔ مایوس آواز میں بولے: "تم اب تک مجھے معاف نہیں کر سکیں۔؟"

یہ لمحہ۔!

یہ لمحہ صاعقہ کے لئے کتنا پر خطر تھا۔ یقین اور بے یقینی کا درمیانی فاصلہ

لیکن اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"صاعقہ۔!" لجاجت، منت اور اپنائیت سے بھرپور آواز تھی۔
لیکن صاعقہ کسی خوش فہمی کو ذہن میں جگہ دینے کو تیار نہ تھی۔ رخ پھیرے بغیر جواب دیا۔ "جائیے ریحان۔ سب گاڑیاں جا چکیں۔"

کتنے بے جان لمحے گزر گئے۔

صاعقہ نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں ـــ بے حس ـــ اور لاتعلق سی کھڑی رہی اور ـــ اور جب کچھ دیر کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو ریحان کمرے سے جا چکے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر اس پردے کو دیکھتی رہی ـــ جو ان کے جانے کے بعد بھی لرز رہا تھا۔ جانے کیوں اسکا دل پھوٹ پھوٹ کے رونے کو چاہا۔ ریحان چلے گئے تھے۔ شاید اس کا دل یہی تھا کہ اس کے کہنے کے باوجود وہ وہیں ٹھہرے رہتے انکا چلے جانا ہی تو کھٹک رہی تھی جو بھرے پیمانوں کو لگی ـــ لبالب پیمانے چھلک جانے کو تھے۔ وہ خوب روئی ـــ دوپہر کے کھانے کے لئے جب آیا اسے کہنے آئی تو اس کی سرخ سرخ متورم آنکھوں کو دیکھ کر بیقرار ہو گئی اس کی حرمان نصیبی پر دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ لیکن کسی قسم کی جذباتی کمزوری کا اظہار کر کے وہ اسے اور غمزدہ نہ کرنا چاہتی تھی ـــ اور پھر یہ کوئی نئی بات بھی تو نہ تھی۔ سالوں کے سیاہ و سفید سینوں پر یہ دھبے پڑتے ہی چلے آئے تھے۔

صاعقہ نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔

"بھوک نہیں ہے آپا۔"

"تھوڑا سا کھا لو ـــ!"

"سلطانہ جی یہیں چاہ رہا ـــ"

کبھی تو مان لیا کرو بات ـــ چلو میری خاطر ہی سہی لو تم نے کھانا

نہ کھایا تو میں بھی نہ کھاؤں گی ۔"

"یہ بڑی بری عادت ہے تمھاری ۔"

"تم اچھی طرح جانتی بھی ہو ۔۔

"لیکن جی نہیں چاہ رہا ۔"

"بہت اچھا ۔۔ مجھے سخت بھوک لگی ہے ۔ لیکن میں کھانا کھاؤں گی نہیں ۔۔ بھوکی رہوں گی ۔ میری خاطر تم دو نوالے بھی نہیں لے سکتیں ۔؟"

اور اسے آیا کی خاطر اٹھنا پڑا ۔ واقعی جس دن بھی اس نے کھانا نہیں کھایا آیا بھوکی رہی ۔ کتنی بے مثل چاہت تھی ۔ اس بھری دنیا میں کوئی تو تھا جسے وہ اپنا سچا غمخوار سمجھ سکتی ۔

مونس آیا کی خوشنودی کے لئے صاعقہ اٹھی اور ڈائننگ روم کی طرف چل دی طبیعت بیزار تھی اس نے لباس بھی تبدیل نہ کیا ۔ رونے سے چہرا اتر اسا گیا تھا لیکن حسن کا یہ مضمحل انداز تڑپا دینے کی ساری صلاحیتیں رکھتا تھا ۔

کھانے کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر میز کے دائیں طرف بیٹھے ہوئے ریحان پر پڑی ۔ میز پر کھانا چنا ہوا تھا ۔ لیکن ریحان نے شروع نہیں کیا تھا ۔ سر قدرے جھکا رکھا تھا ۔ بڑے پریشان سے نظر آرہے تھے ۔ صاعقہ انھیں دیکھ کر متذبذب سی رہ گئی ۔

کیا وہ اس کی وجہ سے پکنک پہ نہ گئے تھے ۔؟"

دل سے ایک حسرت بھری لہر اٹھی ۔ لیکن یہ لہر دماغی نسوں سے ٹکراتے ہی پاش پاش ہو گئی ۔ صاعقہ کو جھرجھری سی آگئی ۔ وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی ۔ کہنیاں میز پر ٹکا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا ۔

ریحان پہلے جھجکے لیکن پھر بھرپور نظروں سے اسے دیکھا ۔ کئی ذہنی ڈوریاں

تھیں۔ یہ کیوں کر مٹیں گی۔ یہ فاصلہ کیسے پاٹا جا سکے گا۔ گم صم بیٹھی ریحان سوچ رہی ہے۔

صاعقہ اک بار پھر ڈگمگا رہی تھی۔ یقین اور بے یقینی کا خلا سنا پر خطر تھا۔ وہ بھٹک رہی تھی۔ کنارے سے ٹکرا کر ڈوب رہی تھی کھانا ریحان نے چھیڑا تھا نہ صاعقہ نے ــــ ایک خاموشی مسلط تھی۔ لیکن یہ خاموشی روحوں کو برابر چھیڑ رہی تھی۔ اس چھیڑ سے گھبرا کر صاعقہ نے ہاتھوں سے سر اٹھایا۔

ریحان نے اس کی سرخ مغموم آنکھوں کو دیکھا جن کا یہ مضمحل اور سوگوار انداز تڑپا ہی تو گیا۔ کتنے بے چین اور بیقرار نظر آئے وہ ــــ انھوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن صاعقہ اٹھ کر چل دی۔ ریحان کھانا کھانے کے بجائے سیڑھی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔

"آپا ــ!"

"ہوں ــ!"

"ایک بات پوچھوں ــ؟"

"پوچھو ــ!"

"کچھ بھی پوچھوں ــ"

"آپا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے ــ؟"

"قیامت کے دن نکلے گا۔"

"آپا ــ" صاعقہ بے اختیار اٹھ کر چیخ اٹھی، اور آپا کے ہاتھوں پر جا گئے

ی پریشانی لرز گئی۔

"کیا ہوا بیٹی۔؟" پیالی میز پر رکھتے ہوئے آپا نے گھبرا کر پوچھا۔

"کبھی تو دل خوش ہونے دیا کرو آپا۔ کبھی تو خوش ہونے دیا کرو۔۔۔"

صاعقہ نے تکیے پر سر پٹخ دیا۔

"بیٹی۔!"

"کبھی تو دل خوش ہونے دیا کرو۔!" اس نے تکیے میں منہ چھپا لیا

"کیا ہوا میری بچی۔؟" آپا اس پر جھک گئی۔ شفقت سے ہاتھ اس کے بالوں پر پھیرتے ہوئے پوچھا۔

صاعقہ اسی طرح پڑی بڑبڑاتی رہی۔

"بتاؤ گی نہیں۔ آپا نے کندھوں سے پکڑ کر اسے پیار سے اٹھایا کیا ہوا کچھ نہیں سمجھ بھی تو نہیں۔۔۔" صاعقہ اپنے ہیجانی جذبات پر قابو پا کر آہستگی سے بولی۔

لیکن اس کچھ نہیں سے آپا مطمئن نہ ہو سکی۔

"کیا بات ہے؟" صاعقہ کے قریب بیٹھ کر آپا نے اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے قدرے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔" وہ بڑبڑائی۔

"کوئی خواب دیکھا ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔ خواب ہی دیکھا ہے۔"

"کیا دیکھا۔؟"

"کچھ نہیں۔۔!" صاعقہ نے سر نفی میں ہلا کر کہا

"بتاؤ تو سہی۔۔۔" آپا نے پیار سے چمکارا۔ "تعبیر بتاؤ گی کیا خواب

"بڑا سہانا" صاعقہ گہرا سانس لے کر بولی۔

"پھر اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔؟"

صاعقہ نے ایک گہرا سانس لے کر آیا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کیلئے صبح کی چائے لے کر آئی تھی۔ لیکن صاعقہ کی پریشانی نے اسے بھی پریشان کر دیا تھا لیکن وہ بھی مجبور تھی۔

"کیا دیکھا تھا۔؟" آیا نے اس کے مرمریں شانوں پر ڈھلکتی ڈوریوں کو درست کیا۔ گلابی ریشمی گاؤن کے پھیلاؤ کو سمیٹ کر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی ڈوری کی گرہ ڈال دی۔ صاعقہ چپ چاپ بیٹھی سامنے دروازے کو دیکھتی رہی

"کیا خراب تھا۔؟"

"کچھ دیا نا بڑا سہانا"

"کب دیکھا۔؟"

"آج ۔۔۔؟ ہر روز دیکھتی ہوں آیا ۔۔۔ مسلسل دیکھ رہی ہوں۔ آج رات بھی دیکھا ۔۔۔" وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"یہی تو پوچھ رہی ہوں ۔۔۔ کیا دیکھتی ہو ۔۔۔؟"

"دیکھتی ہوں ۔۔۔ دیکھتی ہوں آیا ۔۔۔ سورج مغرب سے نکل رہا ہے ۔۔۔ مغرب سے ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ لیکن یہ ممکن تو نہیں ۔۔۔ تم ۔۔۔ کہتی ہو ۔۔۔ سورج قیامت کے دن مغرب سے نکلے گا۔ آیا ۔۔۔ آیا ۔۔۔ یہ کہہ کر تم نے میرے حسین خواب کا طلسم توڑ دیا ہے"

اس نے آیا کی جھاتی میں منہ چھپا لیا

آیا نے محسوس کیا کہ اس کا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ آیا

نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ پیار بھرے لہجہ میں بولی "گھبرانے کی بات نہیں بیٹی ـــ خواب کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ جو کچھ دیکھتی ہو ـــ اسکے برعکس بات ہوگی"

"آپا ـــ" صاعقہ تڑپ کر اس سے الگ ہوگئی۔ سر کو اضطرابی جنبش دیتی ہوئی وہ بستر پر گر گئی اور تکیوں میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"یا اللہ ـــ آپا بے طرح گھبرا گئی" یہ کیا ہو گیا ہے تمھیں ـــ گھبرائی گھبرائی سی آپا۔ کبھی پیار سے تھپک کر ـــ کبھی اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کبھی اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے رونے کا سبب پوچھنے لگی۔ لیکن وہ سسکتی رہی ـــ کچھ نہ بتایا۔

"اللہ جانے کیا ہوتا جا رہا ہے اسے" آپا بڑبڑائی ـــ "کل پکنک پر چلی جاتیں تو اچھا تھا۔ طبیعت بہل جاتی۔ صبح شام کھوئی کھوئی رہتی۔ صحت کتنی گرتی جا رہی ہے ـــ اٹھو ـــ اٹھو میری بچی ـــ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے لو پیالی۔

"آپا ـــ تم جاؤ ـــ جاؤ ـــ مجھے تنہا چھوڑ دو ـــ" صاعقہ نے لجاجت سے کہا۔

"تم جاؤ ـــ چلی جاؤ ـــ مجھے نہ ستاؤ ـــ چلی جاؤ" صاعقہ چیخ پڑی کو تھی آپا چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔ صاعقہ کی یہ حرکت اس کی سمجھ پریشانیوں کی غماز تھی۔ پریشان وہ کئی دنوں سے تھی لیکن کل کے واقعہ سے تو پریشانیاں جنوں کی حدود کو چھونے لگی تھیں۔ ریحان پکنک کے لئے اصرار سے اسے لینے آئے تھے۔ وہ نہیں گئی تھی۔ ریحان خود بھی رہ گئے کیوں؟؟؟

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اٹھتا گیا کہ اس کی ساری ہمتیں اسکی لپیٹ میں آ گئیں۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں اور دماغی قوتیں اس کیوں کا جواب نہ دے سکے ریحان کسی مسلسل مذاق کی بنیاد پر استوار کر رہے تھے۔

یقیناً یقیناً۔

صاعقہ کی ذہنی کیفیتوں کا ایک ہی جواب تھا۔ دماغی قوتوں کا منفی رد فیصلہ لیکن اس نفی کے باوجود اس کے دل کی دنیا میں کچھ رنگین سی چھائیاں لہرا گئی تھیں۔ اک خوش فہمی جسے وہ کسی طور پر سر اٹھانے نہ دیتی تھی۔ پیدا ہو گئی جذباتی تضاد نے صاعقہ کو پاگل بنا رکھا تھا۔ رات اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کا بدن دکھنے لگا۔ اس کا سینہ پھٹ جانے کو تھا۔ گھبرا کر وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جانے رات کو کونسا پہر تھا۔ وہ اپنے سلگتے جذبات کی تسکین کے لئے چمن کی طرف آ نکلی تھی۔ چاند کا سفید نیلگوں آسمان کی وسعتوں میں ہر چیز پر چاندنی کا عکس لرزاں تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے اندھیروں پر سمائی خول چڑھا دیا ہو اس سمائی خول میں لپٹے ہوئے اندھیرے بڑے دلکش تھے۔

لیکن صاعقہ کے من کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ پارے کی طرح مضطرب تھی گھبرا کر وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ اپنے تپتے ہوئے ذہن سے پوچھنے لگی۔

"کیوں ۔۔۔؟"

اور صاعقہ نے اس آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے قریب بالکل سامنے ریحان کھڑے تھے ۔۔۔ وہ گھبرا گئی اس کا دل بے طرح دھڑکا۔

"صاعقہ!" ریحان نے ایک پاؤں سیڑھی پر رکھ دیا۔ انکے لباس

شب خوابی کی سنہری ڈوریاں چاندنی میں چمک رہی تھیں۔

صاعقہ کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کر لی۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی صدا نہ نکل سکی۔

"صاعقہ۔!" ریحان قدرے جھک گئے۔ وہ اس کے کتنے قریب تھے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہلکے گلابی رنگ کے ریشمی گاؤن کی سمٹی تہیں پھیل گئیں اس کا سنہری پیکر گاؤن میں لپٹا ہوا کتنا حسین نظر آ رہا تھا۔ سیاہ بکھری زلفیں نیند کے نشہ سے مخمور آنکھیں، تھکا ہوا حسین چہرہ۔ ریحان کو وہ کسی گیت دلنواز گیت کا تاثر معلوم ہو رہی تھی۔

"اس وقت یہاں کیا کر رہی تھیں۔؟" ریحان نے اس کے جانے کے ارادے کو بھانپ لیا۔

"کچھ نہیں ——"

"جانتی ہو کیا وقت ہے ——؟"

"نہیں ——!"

"دو بج رہے ہیں ——"

صاعقہ نے حیرانگی کا مطلق اظہار نہیں کیا۔ اسے وقت کا بخوبی اندازہ تھا۔

"اتنی رات کیوں جاگ رہی ہو ——؟" بڑی ہمت سے ریحان نے پوچھ لیا۔

صاعقہ جواب دیئے بغیر مڑی۔

"صاعقہ!" ریحان جلدی سے سیڑھیوں پر قدم رکھتے اسکے برابر آ گئے لیکن وہ رکی نہیں —— برآمدے میں آ گئی۔ ریحان نے پھر اسے پکارا اسکے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

کچھ سوچ کر ریحان بڑھے —— صاعقہ کے سامنے آتے ہوئے انھوں نے

اس کا راستہ روک لیا۔ "میری کسی بات کا جواب بھی دینا تمھیں گوارا نہیں ہوا؟" کتنا گلہ تھا۔ کتنی بے چارگی تھی۔

صاعقہ نے دراز پلکوں کو اٹھا کر انھیں دیکھا۔ محرابی دروں سے چاندنی برآمدے میں پڑ رہی تھی۔ ریحان اندھیرے میں تھے لیکن ان کا خاکہ اپالو کے مجسمے کی طرح نظر آ رہا۔ گھبرا کر صاعقہ نے نظریں جھکا لیں۔

"خطاکار سنگینیٔ جرم کے باوجود مستحسن سلوک کا متمنی رہتا ہے۔ میں نے اپنی خطاؤں ۔"

"مجھے جانے دیں۔" وہ گھبراہٹ سے گرا جا رہی تھی۔ ریحان کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ رہی تھی۔

"کچھ دیر کے لئے رک جاؤ ۔" ریحان کا انداز جذباتی ہو گیا۔

"کیوں؟" نہ جانے کیوں صاعقہ کے لبوں سے نکلا۔

"کیوں؟" ریحان نے اسے دیکھا ۔ یتیم و خوابیدہ کی نظروں سے۔

صاعقہ نے ستون کا سہارا لے لیا ۔ ریحان کیا کہنا چاہتے تھے وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود سمجھنا نہ چاہتی تھی۔ ریحان اس کے قریب آ گئے۔ ان کی مخمور نگاہوں میں پیار کے سمندر کن جذبے لہرا رہے تھے۔ صاعقہ نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

"شاید ۔ شاید مجھے یہ بات نہ کہنا چاہیئے تھی ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن میں خود نہیں جانتا ۔ صاعقہ ۔ ۔ ۔

ان کی پوری بات سنے بغیر صاعقہ بھاگی۔ اور بھاگی ہوئی اپنی خوابگاہ پہونچ کر مسہری پر گر گئی۔ اس کا دم یوں پھول رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت دوڑتے ہوئے طے کر آئی ہو۔ اور پھر باقی رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی

اور جب اس کا ذہن معمول پہ آیا تو وہ ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔
"کیا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے۔!"
اس کا جی چاہتا تھا کہ اس انہونی بات کو اٹل حقیقت سمجھ لے۔
لیکن ناممکن کو ممکن سمجھ لینا بھی تو اس کے بس میں نہیں تھا۔
صبح سویرے جب آیا اس کے لئے چائے کی ٹرے لے کر آئی تو وہ اسی ادھیڑبن میں تھی۔ کبھی یقین سے ہمکنار تھی۔ اور کبھی بے یقینی کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ اس گومگو کی کیفیت میں اس نے آیا سے پوچھا تھا کہ
"کیا سورج مغرب سے بھی نکل سکتا ہے؟"
اور آیا کے جواب نے اس کے جذبات کی کرچیاں کر دی تھیں۔
صاعقہ کا یقین محکم ہو گیا کہ سورج کبھی مغرب سے نہیں نکل سکتا۔ ناممکن کبھی ممکن نہیں بن سکتا۔ اور ——— اور!
ریحان وہ کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو آج کل بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔
بڑے بھائی کا ذہنی انتشار بڑھاؤ کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ ریحان کے اس بننے کی کوشش کا وہ منہ توڑ جواب دے گی ——— وہ کسی کمزوری سے مغلوب نہ ہو گی ——— وہ اپنے وقار کے تحفظ کے لئے سینے میں مچلتے طوفانوں کا پوری طرح مقابلہ کرے گی۔

ریحان نے ان ذہنی دوریوں اور خیالی تفرقوں کو جو صاعقہ اور اس کے درمیان خلا بن چکے، دور کرنے کا عزم کر لیا۔ شام ڈھل رہی تھی

ریحان بیرونی باغ میں ٹہل رہے تھے۔ اپنے اس عزم پر وہ پورے استحکام سے قائم تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہے تھے۔

دفعتہً ان کی نگاہ درختوں کے جھنڈ کے عقب میں مرمریں چبوترے پر پڑی وہاں صاعقہ بیٹھی تھی ہلکے پھلکے سفید لباس میں وہ کوئی زردوی مخلوق نظر آرہی تھی اس کے ہاتھ میں زرد گلاب تھا۔ بے خیالی کے عالم میں اسکی پتیاں نوچ رہی تھی۔ چہرے پر بشاشت نہ تھی۔ ایک تھکن تھی۔ جو پژمردگی سے شابہ تھی۔ سوگوار شبنمی آنکھوں میں غم کے سائے رینگ رہے تھے۔

ریحان کے قدم خود بخود اس کی جانب اٹھنے لگے۔ چند لمحوں بعد وہ درختوں کا جھنڈ پار کرکے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ صاعقہ نے چونک کر انکی طرف دیکھا۔ سوگوار آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے ایک چمک ابھری۔ لیکن دوسرے لمحہ یہ چمک بجھ گئی۔ آنکھوں میں تاریکی ہی تاریکی رہ گئی۔ بالکل ایسے جیسے بجلی کی چمک معدوم ہونے پر بادلوں سے کثیف مطلع پر تاریکی ہی تاریکی رہ جائے۔ چہرے پر بیزاری کا تاثر لاتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

"صاعقہ!" ریحان نے چبوترے کی سیڑھی پر دایاں پاؤں رکھتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔

"جی" بلا جھجک جواب تھا۔ وہ تو جیسے ہر آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لئے سینہ سپر بیٹھی تھی۔

"یہاں تنہا بیٹھی ہو۔ پکنک پہ چلی جاتیں تو اچھا ہی تھا۔"

"میری تنہائیوں کا آپ کو کچھ ضرورت سے زیادہ ہی احساس ہونے لگا ہے۔"

طنز یہ لہجہ دل میں نشتر کی طرح اتر گیا۔ لیکن ریحان اس طنز کو خفیف سی

مسکراہٹ میں ڈوبتے ہوئے بولے "شکر ہے تم نے اتنا جان تو لیا۔
"جان لینے کو تو بہت کچھ جان لیا ہے ــــ" وہ بدستور تلخ لہجے میں طنز کر رہی تھی۔
"پھر بھی یقین نہیں ــــ" ریحان آج شاید بعد کی ساری مسافتیں طے کر لینے پر تلے تھے۔
"اور میرے کو اجالا کہنا خود فریبی ہو گی" وہ لاتعلقی سے بولی۔
"صاعقہ۔!" ریحان نے سر جھکا کر کہا "میرے جذبات کو یوں مجروح نہ کرو ــــ"
صاعقہ نے ان کی جانب بڑی بیباکی سے دیکھا۔ نادم خادم سے ریحان دل کی گہرائیوں میں کس سرعت سے اترے جا رہے تھے۔ لیکن وہ کسی جذباتی کمزوری کا شکار نہ ہونے کا تہیہ کر چکی تھی۔
"آپ کے جذبات قابل احترام ہیں ریحان ــــ" اس آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے "مجروح کرنا تو بہت بڑی بات ہے۔ انھیں تو ٹھیس پہونچانا بھی گناہ ہے!"
"اتنا طنز نہ کرو ــــ جس کا میں متحمل نہ ہو سکوں ــــ" وہ تڑپے
"اور اتنا بنیئے بھی نہیں ــــ جس کی میں متحمل نہ ہو سکوں" صاعقہ الجھ پڑی
"تم کتنا غلط سمجھ رہی ہو ــــ کتنا غلط سمجھ رہی ہو صاعقہ ــــ" ریحان کے لہجے میں بیچارگی تھی "صدق و خلوص کو پرکھ تو لیا ہوتا ــــ"
"عمر بھر پرکھا ہے ــــ" صاعقہ کی آواز رندھ گئی۔ اسکی سوگوار آنکھوں میں اداسیاں کھلنے لگیں۔ اس نے دھیرے سے ریحان کی طرف پشت موڑ لی۔
"صاعقہ۔ میں بے حد نادم ہوں ــــ جانتا ہوں ــــ طویل برسوں

پر چھایا ہوا میرا سلوک بھلا دینا تمھارے لئے آسان نہیں۔ تمھاری حیات کا گزرا ہوا ہر لمحہ میرے بیرحم رویے پر خونچکاں ہے۔ لیکن میں نادم ہوں صاعقہ کس قدر نادم ہوں۔ تم شاید اندازہ بھی نہ کرو۔ اک اک لمحہ میری روح کے لئے گراں بار بوجھ بنا ہوا ہے۔"

صاعقہ کی پشت پر نظریں جمائے وہ دل گرفتہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ صاعقہ گھبرا گئی۔ لیکن سنبھلتے ہوئے اٹھی۔ ریحان کو سرتاپا بغور دیکھا۔ اور جانے کے لئے قدم اٹھایا! اس کے چہرے پر اک آکردہ سے بیزاری تھی۔

"صاعقہ ــــ" ریحان آگے بڑھ کر اس کے سامنے آگیا، جذبۂ عفو طلبی بخشش کا منتظر تھا۔

"مجھے معاف کر دو ــــ"۔ ریحان نے اک دل فگار آہ کو روکتے ہوئے صاعقہ کی طرف دیکھا۔

"آپ کی ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟" صاعقہ نے تلخی سے پوچھا۔ ضبط ریحان نے سر اٹھا کر دیکھا ــــ نیم وا خوابناک سی نظریں اپنا مفہوم ادا کر گئیں۔ ان کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی، سر جھکا کر آہستگی سے بولے۔

"تمھیں کیسے سمجھاؤں؟"

"ریحان ــــ" صاعقہ ان فسوں کار نظروں کے وار سے بہک سی گئی۔

"صاعقہ!" مسحور کن خوابیدہ کی نظریں پھر اس کی جانب اٹھ گئیں۔

صاعقہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ نظروں کے طلسم سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی ــــ اسکے حواس منتشر تھے۔ اور سخت گھبراہٹ طاری تھی۔

"میری تبدیلی تمھارے لئے پریشان کن ہے ــــ میں خود نہیں جانتا کہ

یہ سب کیسے اور کیوں کر ہوا ــــ لیکن ــــ" وہ اپنے عشق کا اعتراف کر رہے تھے۔

"لیکن میں تمھیں یقین ــــ" قدرے رُکنے کے بعد وہ بولے۔

"ریحان" صاعقہ نے ان کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا "مجھے ابھی اپنے آپ سے ہمدردی ہے۔ اتنا نہ بنائیے کہ میں اپنے آپ سے نفرت کرنے لگوں۔"

"صاعقہ" ریحان بے قرار ہو گئے۔

"آپ کی تفریح میری زندگی کا مہلک زخم ہوگی" وہ رو دی۔

"میری زندگی کی اٹل حقیقت کو تفریح کا نام نہ دو ــــ" ریحان پیار گی سے بولے۔

"نہیں ــــ نہیں ــــ" وہ چیخ اٹھی ــــ "سورج مغرب سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں ــــ میں جانتی ہوں سب کچھ جانتی ہوں۔"

"گناہگار کو بار بار گناہگار نہ کہو صاعقہ ــــ گناہوں کا بوجھ پہلے ہی کچھ کم تو نہیں ــــ تم احساس دلا دلا کر اسے اتنا گراں بار تو نہ بناؤ۔ جسے اٹھانے کی ہمت بھی نہ رہے ــــ!"

صاعقہ نے ریحان کی طرف دیکھا۔ عجز و انکسار کا مجسمہ نظر آ رہے تھے۔ کیا یہ حقیقت تھی۔

"نہیں۔ نہیں" وہ دیوانہ وار چیخ اٹھی۔

"صاعقہ" ریحان قدرے سختی سے پکارا۔

"لیکن وہ "نہیں نہیں" کہتی بھاگ گئی۔

ریحان اس کے مجنونانہ انداز و رد پر کچھ جوش میں آ گئے۔ لپک کر اس کے سامنے آ گئے۔ اس نے ایک طرف سے کترا کر نکل جانا چاہا۔ ریحان نے اسے کندھوں سے پکڑ لیا۔ اپنے مقابل کھڑا کرتے ہوئے بولے "تمھیں کیوں یقین نہیں آتا؟"

"چھوڑ دو ــــ مجھے چھوڑ دو ــــ!"

"پاگل نہ ہو ــــ ہوش میں آؤ۔"

ریحان نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ــــ صاعقہ کے آنسو تیزی سے بہہ نکلے۔

"تمھیں میری باتوں کا کیوں یقین نہیں آتا ــــ صاعقہ ــــ میری نداموں کا احساس کیوں نہیں ہوتا ــــ میں اپنا دل چیر کر کیسے تمھیں دکھاؤں۔ میرے سینے میں طوفان ہیں ــــ میری آنکھوں میں دیکھو ــــ صاعقہ میری آنکھوں میں دیکھو ــــ تمھیں کچھ نظر نہیں آتا ــــ بتاؤ ــــ بولو ــــ کچھ نظر نہیں آتا ــــ" ریحان پر جنون سا طاری تھا۔ صاعقہ کو کندھوں سے تھامے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہے تھے ــــ "دو میری آنکھوں میں دیکھو۔ تمھیں کچھ نظر نہیں آتا؟"

صاعقہ نے ان کی آنکھوں میں دیکھا اور روتے روتے ہنس دی۔

"کہو ــــ کہو نا ــــ کچھ نظر نہیں آتا ــــ" ریحان اسی وارفتگی سے پوچھ رہے تھے۔

"آتا ہے ــــ" وہ روتی آنکھوں اور مسکراتے لبوں سے بولی۔

"کیا؟" ریحان تیزی سے بولے۔

"طنز ــــ تمسخر ــــ مذاق ــــ" وہ روتے ہوئے ہنسے جا رہی تھی۔

"صاعقہ ــــ" ریحان تڑپ کر چیخے۔

"ہٹ جاؤ ــــ مجھے چھوڑ دو۔" صاعقہ مجنونانہ انداز میں بولی۔ ریحان نے ہاتھ نہ ہٹائے۔

"چھوڑ دو ــــ مجھے چھوڑ دو۔" بڑے وحشیانہ طریق سے انکے ہاتھ جھٹک کر وہ بھاگ گئی۔ ریحان سکتے میں آ گئے۔ اور جب کئی لمحوں بعد ان کا

سکتہ ٹوٹا۔ تو صاعقہ وہاں نظر نہ آ رہی تھی۔

ریحان آج ازل و ابد کی مسافتیں طے کر لینے پر کچھ اور تل گئے۔ تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کے تعاقب میں چل دیئے۔

جب ریحان صاعقہ کی خوابگاہ کا بھاری سبز پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے تو وہ مسہری پر پڑی تکیے میں منہ چھپائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ آیا اس پر جھکی ہوئی محبت سے رونے کا سبب پوچھ رہی تھی۔

ریحان آگے بڑھے۔ آیا نے انھیں دیکھا۔ زرد چہرہ، خشک ہونٹ، بکھرے بال اور پریشان نظریں بہت کچھ کہہ گئیں۔

"نہ جانے کیا ہو گیا ہے میری بچی کو۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"تم جاؤ آیا۔!" ریحان نے سنگین سے لہجے میں کہا۔

آیا تعمیل حکم کے لئے کمرے سے نکل گئی۔

ریحان مسہری کے قریب آئے۔

"صاعقہ!" انھوں نے مایوسیوں میں ڈوبتی آواز میں پکارا۔

لیکن وہ اسی انداز میں پڑے روئے گئی۔

ریحان قدرے جھکے۔ ایک ہاتھ مسہری کے تکیے پر تھا۔ دوسرے سے صاعقہ کا کندھا ہلایا۔ صاعقہ نے سر اٹھایا۔ سرخ سرخ آنکھوں سے لپٹیں نکل رہی تھیں۔ آج اس کے سینے میں طوفان ٹکرا رہے تھے اور اس کی ساری ہستی اس ٹکراؤ میں پسی جا رہی تھی۔

"صاعقہ۔!" دکھی آواز میں ریحان نے پکارا۔

"آپ ــــ آپ ــــ یہاں کیوں آ گئے ــــ کیوں آ گئے ہیں؟"

وہ بپھری۔

"اپنے کردہ وناکردہ گناہوں کی معافی کے لئے یہ ریحان افسردگی سے سر جھکا کر بولے۔

"صرف ایک بار ــــ ایک بار اقرار کر لو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

"مجھے کیوں ستاتے ہیں ریحان ــــ میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ آپ کا مذاق میری جان لے لے گا۔ میں نے آپ کی ہر زیادتی خاموشی سے سہ لی ہے لیکن ــــ یہ ــــ یہ زیادتی ــــ" اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ کس بیدردی سے روئے جا رہی تھی وہ۔

ریحان گنگ سے اسے دیکھتے رہے۔ یہ بعد کی منزلیں کیوں کر پاٹ سکیں بیچارگی، افسردگی اور جذبات شکستگی نے ان کے چہرے کو قابل رحم بنا رکھا تھا آنکھیں جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے۔

"تمہیں کیسے یقین دلاؤں" انھوں نے آخری کوشش کی۔

"یقین دلا کر اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کی کوشش نہ کرو ریحان آپ۔ آپ، وہ نہیں ہیں جو بننے کی کوشش کر رہے ہیں ــــ میں سب جانتی ہوں۔ خلوص کا یوں مظاہرہ کر کے خلوص کی دھجیاں نہ اڑاؤ۔" اس نے زار و قطار روتے ہوئے رک رک کر یہ الفاظ کہے۔ یہ الفاظ نہ تھے۔ آگ تھی جو اس نے ریحان پر انڈیل دی۔ وہ بے بسی کے عالم میں اسے تکتے رہ گئے۔ صاعقہ کے الفاظ نے ان کی حیات کا جیسے سارا رس چوس لیا۔ وہ بے جان تودے کی طرح کھڑے تھے۔

صاعقہ روئے جا رہی تھی۔ نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے انھوں نے دیر ان نظروں سے اسے دیکھا۔

"صاعقہ!" انھوں نے ہمت کر کے پکارا۔

"چلے جائیے ریحان ــــ چلے جائیے ــــ" وہ چیخی۔

"میں مایوس لوٹ جاؤں ــــ!" ان کی آواز ڈوب رہی تھی۔

"ریحان ــــ" وہ پھر چیخ اٹھی "آپ مجھے جینے بھی دیں گے یا نہیں۔ یہاں سے چلے جائیے ــــ میں آپ کی موجودگی ایک لمحہ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ــــ جائیے ــــ جائیے ــــ" وہ چیختی رہی۔

ریحان کی افسردگی انتہا کو پہونچ چکی تھی۔ مسلسل چوٹ سے احساس کے شیشے چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ پلٹے اور کمرے سے تیزی سے باہر نکل گئے۔

"چلے جائیے ــــ چلے جائیے" صاعقہ کے مجنونانہ انداز میں چیخنے کی آواز برآمدے کے آخری موڑ تک سنائی دیتی رہی۔

ریحان صاعقہ کی خوابگاہ سے نکلے تو دل کی طرح انکی ہر آرزو بھی لٹ چکی تھی۔ طبیعت بیزار تھی۔ گھبراہٹ بھی محسوس ہو رہی۔ کسی پہلو قرار نہ آ رہا تھا۔ گھنٹہ بھر باغ میں پھرتے رہے۔ طبیعت میں رچی سی افسردگیاں اور گہری ہو گئیں روح جذبات کے شکنجے پر چڑھی تھی۔ قرار آتا بھی کیوں کر۔!

صاعقہ ان سے اس قدر دور ہو گئی، یہ انھیں کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا۔ ہاں وہ انھیں صرف معاف ہی کر دیتی، اسکی محبت نہ سہی، اس خیال سے تسکین تو ہوتی کہ اس کے لہولہان ماضی کا وہ مداوا تو کر پاتے ہیں۔

ریحان کی طبیعت بیزار سے بیزار تر ہوتی گئی۔ وہ سکون چاہتے تھے۔

لیکن الحمراء کے در و دیوار ان کی شکست پر خندہ زن تھے۔ الحمراء کی اونچی اونچی چھتوں تلے ان کا دم گھٹ رہا تھا۔ یہ گھر — یہ گھر اک جیتے الاؤ سے کم نہیں تھا ہر طرف سے آگ کی لپٹیں آ رہی تھیں۔

انھوں نے سکون دل کی خاطر اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ عالم آباد والی پرسکون کوٹھی میں انکی مچلی ہوئی جبلتوں کی تسکین کا سامان ہو سکتا تھا۔ اس خیال کو انھوں نے فوراً عملی جامہ پہنایا — رخت سفر باندھا۔ اور رات کا کھانا کھائے بغیر وہ الحمراء سے عالم آباد روانہ ہو گئے۔

صاعقہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی اسے رہ رہ کر یہی احساس مارے جا رہا تھا کہ اس نے منزل پا کر منزل کھو دی ہے۔ دوسری شام پکنک والا قافلہ لوٹ آیا۔ الحمراء کا سکوت ٹوٹ گیا۔ پھر وہی شور و غل۔ پھر وہ زندگی کی گہما گہمی لیکن ہر زبان پر ریحان کی عدم شمولیت کا شکوہ۔

"سارا لطف کرکرا ہو گیا۔"

"کچھ مزا ہی نہیں آیا۔"

"جانِ محفل جو نہ تھا۔"

"اللہ جانے کیا بات ہوئی۔"

"خیال تھا کہ دوسرے ہی دن آ جائیں گے۔"

"کچھ سمجھ نہیں آیا — اچھے بھلے تیار تو ہوئے تھے۔!"

"اچانک ایسا کونسا کام پڑ گیا۔ جو اتنے دن فرصت ہی نہ مل سکی۔"

آنے والوں کی باتیں اور قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ حسن بانو نے آتے ہی ریحان کو طلب کیا۔

"وہ تو عالم آباد تشریف لے گئے ہیں۔" نوکر نے مودبانہ کہا۔

"کب؟" حیرانگی سے پوچھا گیا۔

"کل شام۔!"

"کیوں۔؟"

"معلوم نہیں سرکار۔"

"کچھ کہہ کر نہیں گئے؟"

"جی نہیں۔"

"آنے کا بھی نہیں کہا۔؟"

"جی نہیں۔"

"عجیب بات ہے!"

"شاید کوئی کام ہو گا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک تو تھے نا؟"

"جی۔ کچھ طبیعت پریشان سی نظر آئی تھی۔ ویسے ٹھیک تھے۔!"

ریحان گھر والوں کے لئے ایک اچھا خاصا موضوع بن گئے۔ ماں فکر مند تھیں۔ دادی فکر مند تھیں ہم جلیس فکر مند تھے اور سب سے زیادہ تو کبیر فکر مند تھی۔ جس نے اللہ جانے چار دن کیسے گزارے تھے۔ کتنے سہانے سپنے دیکھے تھے اس نے پکنک کے کتنے حسین ملبوسات اک امنگ سے بنا گروائے تھے۔ گو ریحان نے اس سے کبھی محبت و چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن اپنی ذات میں انکی دلچسپی کو وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اور پھر پھر اتنا بھی تو جانتی تھی کہ تقدیر کی گرہ ان دونوں کو یک جا کرنے والی عاصم آباد اس نے دو مرتبہ فون کیا۔ لیکن ریحان ملے نہیں۔

بڑی بے چین نظر آنے لگی تھی۔

سب زندگی کی مصروفیتوں میں کھو گئے۔ اس دن ریحان کے ٹیلیفون سے سب کو تسلی بھی تو ہو گئی تھی۔ کچھ کام کا بہانہ اس خوبصورتی سے کیا تھا کہ سب کو تسکین ہو گئی تھی۔ اور جب ان سے واپسی کا پوچھا گیا تو انھوں نے ملائمت سے جواب دیا۔ "شاید تین چار ہفتے رکنا پڑے۔ کام پہلے ختم ہو گیا تو جلدی آجاؤنگا۔"

اسد کو ریحان کے اس جواب سے تسکین نہ ہو سکی۔ انھوں نے اگلی رات خود انھیں فون کیا۔

"کیا بات ہے ریحان۔؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"یہ فرار کیسا ہے؟"

"تمھاری سمجھ کا پھیر ہے۔ کاش فرار ممکن ہوتا۔ میں تو اس حد تک جگر گیا ہوں کہ چھٹنے کی امید ہی نہیں رہی۔"

"یہ راز فلسفیانہ کب سے سیکھا ہے؟"

"سب باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں۔"

"تم تو خاصہ معمہ بنتے جا رہے ہو۔ کہو کب آ رہے ہو؟"

"فی الحال پروگرام نہیں۔"

"وہاں اکیلے کیا کرتے رہتے ہو۔؟"

"سکون دل کی تلاش۔"

"معاملہ کچھ سنگین معلوم ہوتا ہے۔ میں کل آؤں گا۔"

"نہ ہی آؤ تو اچھا ہے اسد!"

"کیوں۔؟"

"میں تنہائی چاہتا ہوں۔ اس تنہائی میں جہاں میرے اپنے خیالوں کا بھی گزر نہ ہو۔ تم آئے تو میرا یہ ظاہری سکون بھی ختم ہو جائے گا۔"

"اس آدم بیزاری کی وجہ۔؟"

"خدا حافظ۔" ریحان نے ریسیور رکھ دیا۔ اسد نے پھر سلسلہ جوڑنے کی بہتیری کوشش کی۔ لیکن ادھر سے جواب نہ ملا۔

وہ تین دن اسد نے رابطہ جوڑنے میں گزار دیئے۔ ریحان عید کے چاند ہو گئے۔ مجبوراً تیسری شام انھوں نے راصم آباد جانے کی ٹھانی۔ رات وہ ریحان کے پاس تھے۔

"تم آ ہی گئے آخر۔" ریحان نے افسردہ سی مسکراہٹ سے خیر مقدم کیا۔

"خود ہی بلایا ہے۔"

"میں نے۔؟"

"اور کس نے۔؟"

"کب؟"

"میاں فون پہ مل جاتے تو یہاں آنے کی کسے ضرورت پڑی تھی۔"

"سخت غلطی کی ہے۔" ریحان مسکرائے۔

"اب خمیازہ بھگتو!"

"کتنے دن۔؟"

"جتنے دن یہاں رہو۔"

"تم جاؤ گے نہیں۔؟"

"نہیں۔؟"

"پھر مجھے راتوں رات کہیں اور منتقل ہونا پڑے گا۔"

"سایہ ہر جگہ تعاقب کرے گا ـــ جاؤ گے کہاں؟"

"اندھیروں میں ـــ جہاں سایہ تعاقب چھوڑ دیتا ہے"

ریحان نے اتنے سوگوار انداز میں کہا کہ اسد گھبرا کر انھیں دیکھنے لگے۔

اس رات دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ زمانے بھر کی باتیں کیں۔ لیکن ذاتیات تک کوئی نہ آیا۔ اوپری۔ ظاہری اور دنیاداری کی باتیں۔ اسد نے محسوس کر لیا کہ ریحان زخم خوردہ ہیں۔ ان کی ہر مسکراہٹ سے خون رس رہا ہے۔ لیکن اس کا سبب۔؟"

بہت کرید کرنے پر بھی نہ پا سکے ـــ اس سلسلہ میں ریحان کے لبوں پر ایک ہی حامد۔ چپ تھی۔ اسد کا خیال ہر پھر کر انھیں صاعقہ تک لے آیا لیکن ـــ صاعقہ ـــ اور ریحان ـــ تضاد کا نام نہ سہی ـــ پھر بھی ـــ ریحان اور صاعقہ کے لئے اتنا ڈوب جائیں کہ اپنی ہستی تک کو بھول بیٹھیں۔ یہ ممکن کیوں کر تھا۔ اس سے ہمدردی ماننے کی بات تھی پچھتاوے کے ردِ عمل کے طور پر پریشانی بھی ہو سکتی تھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ حد درجہ سے بہت آگے نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات ظاہر تھی۔ لیکن اس ظاہر پر یقین کون کرتا ـــ کیسے کرتا ـــ!

دو دن تک اسد رہے لیکن کچھ سمجھ نہ پائے۔ دو ایک بار انھوں نے محسوس بھی کیا کہ ریحان کچھ کہتے کہتے رک گئے ہیں۔ لیکن اصرار پر انھوں نے کچھ کہا نہیں۔

ان کی پریشانی روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ وہ اسد کی موجودگی میں خوش نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ لیکن بناوٹ کے تار تار پردے حقیقت کی ستر پوشی سے قاصر آتے تھے۔

تین چار دن بدمزگی سے گزارنے کے بعد اس نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔
ریحان نے انھیں روکا نہیں ــــ صرف اتنا کہا "اگر تم نے کچھ محسوس کیا بھی ہو اسد۔ تو وہاں جا کر کسی سے کچھ نہ کہنا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں پریشان ہوں۔ لیکن یہ پریشانی گھر والوں، دوستوں اور ہم جلیسوں کے استفسار سے بھی ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے۔ میں یہاں تنہا رہنا چاہتا ہوں۔ یقین ہے کہ طبیعت جلد ہی سنبھل جائے گی۔ میں خود ہی آ جاؤں گا ــــ ذرا سکون چاہتا ہوں ــــ تم صرف اتنا کہہ دینا کہ میں ــــ کسی دوست کے لئے رکا ہوا ہوں۔"
ریحان کے لہجے میں اتنی دل گرفتگی تھی کہ اسد بے چین ہو گئے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کچھ نہ کہیں گے۔ بلکہ سب کو یقین دلائیں گے کہ وہ خوش و خرم ہیں۔ لیکن ــــ اسد کی باتوں کے باوجود دادی حسن بانو نے روزانہ فون کروانا معمول بنا لیا۔ سمیرا ہر روز رات کو فون کر کے انکی تنہائی میں مخل ہوتی رہی ــــ جب بھی سمیرا کا فون آتا ــــ ریحان کی بیزاری نقطۂ عروج پر پہونچ جاتی ــــ ترش کلامی پر بھی اتر آتے۔ لیکن سمیرا نے فون کرنا بند نہ کیا۔

"رات سے بڑا جھگڑا ہو رہا ہے۔" آیا قالین پر بیٹھی صاعقہ کے دوپٹہ پر فیتہ ٹانک رہی تھی۔
"جھگڑا کیسا۔؟" کھڑکی میں کھڑی صاعقہ نے منہ پھیرے بغیر پوچھا
"ریحان سیاحت کے لئے یورپ جانا چاہتے ہیں ــــ" سوئی میں ناگہ

ڈالتے ہوئے آیا بولی۔

"ہوں ــــ ں" بے آواز سی صدا ہونٹوں پر تھرائی۔ صاعقہ نے پلٹ کر آیا کی طرف دیکھا ــــ حیران سراسیمہ سی نظروں سے۔

آیا نے اک نظر اس پر ڈالی۔ وہ صاعقہ کی پریشانیوں کا راز سمجھ چکی تھی۔ اس دن ریحان جس انداز سے صاعقہ کی خواب گاہ میں آئے اور جس طرح ایوں ٹوٹے تھے۔ آیا کی جہاندیدہ نظروں نے پرکھ لیا تھا کہ کوئی شدید سی غلط فہمی دونوں کے مابین حائل ہے۔ ریحان کے طرزِ عمل سے وہ آگاہ تھی۔ صاعقہ کے سب سے بڑے دشمن وہی تھے۔ لیکن اب ریحان یکسر بدلے ہوئے تھے۔ ریحان کے خلوص اور صدق کا اسے انکی حالت دیکھ کر پختہ یقین ہو گیا تھا۔

"ریحان واپس آ گئے ہیں نا۔" آیا نے پھر بات چھیڑی۔

"ہیں ــــ جاتی ہوں ــــ" وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"بس انہی کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا ہے۔"

"میں کبھی نہیں۔"

"ریحان یورپ جانا چاہتے ہیں۔" صاعقہ چپ چاپ آیا کا منہ تکنے لگی

"لیکن بڑی بیگم صاحبہ برہم ہیں۔ گھر کا ہر فرد مخالفت کر رہا ہے۔ ریحان کی ضد ایک ہی ہے ــــ رات تو ریحان اتنے بھڑکے تھے کہ دادی کو بھی جواب دینے رہے ــــ" صاعقہ گم صم کھڑی آیا کو دیکھتی رہی۔

"جانے کیا ہو گیا ہے صاحبزادے کو ــــ" آیا غصہ لگا۔تے ہوئے بولی

"تین ہفتے عاصم آباد رہ آئے ہیں۔ اب آتے ہی باہر جانے کی ضد پکڑ رکھی ہے۔ کسی کی سنتے ہی نہیں۔ دادی نے بہتیرا سمجھایا۔ پھر کبھی سیر کا پروگرام بنا لینے کو کہا باپ نے روکا ــــ لیکن وہ تو کسی کی سنتے ہی نہیں۔ کتنے پریشان ہیں اتنا سا

منہ نکل آیا ہے۔ بشاشت تو چہرے پر نام کو نہیں رہی۔ لٹے لٹائے سے نظر آتے ہیں۔" کون کہہ سکتا ہے یہ وہی ریحان ہیں جو ــــ"

"چپ رہو آیا ــــ" صاعقہ نے جلدی سے کہا اور گھبرا کر منہ پھیر لیا۔

"کیوں بیٹی؟" آیا نے سوئی دوپٹے میں ٹانک دی۔ ٹوکری ایک طرف رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ صاعقہ نے اپنا سر کھڑکی کی چوکھٹ پر اپنے بازوؤں کے حلقے میں رکھ دیا تھا۔

"صاعقہ بیٹی۔!" آیا نے پکارا۔

"کیا ہے آیا۔؟" اس نے سر اٹھایا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟"

"ہاں۔!"

"مضمحل کیوں ہو گئی ہو۔؟"

"آیا ــ آیا ــ!"

"کیوں بیٹی۔؟"

"میرا دل گھبرا رہا ہے آیا ــ" صاعقہ کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ لیکن یہ بہانہ آیا پر کارگر نہ ہوا۔ وہ صاعقہ کی ذہنی کیفیت سے پوری طرح آگاہ تھی۔

"صاعقہ" وہ اس کے قریب آ گئی۔

"ہوں"۔

"ایک بات پوچھوں۔؟"

"کیا۔؟" صاعقہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ریحان کیوں بھاگ رہے ہیں۔؟"

"ریحان ــــ" صاعقہ ایک دم گھبرا گئی۔ جیسے وہ ان کے جانے کا سبب

جانتی ہو اور یہ جان لینا اک ایسا جرم ہو۔ جس کی تشہیر سے اسے گزند پہنچنے کا احتمال ہو۔

"کیوں جاننا چاہتے ہیں وہ ــــ" آیا نے پھر سوال کیا۔

"میں ــــ میں کیا جانوں آیا ــــ" اس نے جیسے جھوٹ بولا۔

"تم جانتی ہو۔"

"نہیں۔ نہیں ــــ میں نہیں جانتی ــــ مجھے کچھ علم نہیں۔"

"میں بتا دوں۔!"

"نہیں ــــ" اس نے آیا کی چھاتی میں منہ چھپا لیا۔ اس کی تیز تیز سانسیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ آیا اس کی اضطراری حرکت اور اضطرابی کیفیت سے کیا کچھ نہ سمجھ گئی۔

"میری بچی۔" آیا نے اس کی پیٹھ پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"آیا۔" صاعقہ اسکے سینے کی شفیق گہرائیوں میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔

"غلط فہمیاں بعض اوقات ایسی بھیانک جدائیوں کا روپ دھار لیتی ہیں میری بچی۔" آیا سوچوں کے گہرے ساگر میں ڈوبتے ہوئے بولی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ جنھیں آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آیا۔" صاعقہ نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا "تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"سچ کہتی ہوں۔" وہ سچ کے ساگر سے ابھری۔ آنچل سے آنکھوں کے گوشے صاف کر کے اداس لہجے میں بولی "غلط فہمی بری بلا ہے میری بچی۔"

تم کیا کہنا چاہتی ہو۔؟"

"عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے ــــ اور تم ضرورت سے زیادہ عقلمند ہو۔"

"تمہارا مطلب۔؟"

"اچھی طرح جانتی ہو۔"

"آیا۔"

"میں تمھیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"ازلی بدنصیبوں سے ایسی توقع ہے۔"

"تقدیر کے پلٹے ان دیکھوں کی نذر نہ کرو۔"

"حقیقت کو پرکھا کرو آیا۔ خوش فہمیاں جان لیوا بھی بن جاتی ہیں۔"

"تم نادان ہو۔"

"یہ بھی تمھاری غلطی ہے آیا۔"

"یہ نہ سمجھو کہ میں قطعاً بے خبر ہوں۔ ریحان تم سے مایوس ہو کر زار چلے گئے۔ انھیں روک لو۔ صاعقہ۔ ورنہ گیا وقت لوٹ کر نہیں آئے گا۔"

"میں — میں کیا کروں آیا۔؟" صاعقہ بیچارگی سے رو دی۔

"میں سب کچھ سمجھتی ہوں — ریحان کو اس دن تم نے مایوس کر دیا تھا۔ عاصم آباد چلے گئے۔ اب باہر جانے کے لئے بضد ہیں۔"

صاعقہ سر جھکائے خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

"ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا۔ حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ تم انھیں جانے سے روک لو — سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آیا۔ ریحان کے خیالات سے تم بھی بے خبر تو نہیں ہو۔ انھوں نے ہمیشہ مجھے پتھر سمجھا ہے۔ اب بھی۔ وہ۔ وہ شاید کوئی مسلسل مذاق کر رہے ہیں یا طویل تفریح —" صاعقہ کو اپنے الفاظ آپ ہی جھوٹے لگ رہے تھے۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو صاعقہ۔ تفریح اتنی طویل اور مذاق ایسا مسلسل نہیں ہو سکتا یہ ان کی زندگی کی اٹل حقیقت ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو۔؟"

"ریحان کے چہرے کے جامد سناٹے۔ آنکھوں کے ویران چپ ظلمت کی وحشت۔ پکار پکار تو کہہ رہی ہے۔"

"آیا ــــ" صاعقہ اس سے سینے سے لگ کر بے اختیار ہو کر رو دی "غلط فہمیاں خطرناک نتائج کی حامل ہوتی ہیں بیٹی ــ ریحان کو باہر جانے سے روک لو۔ وہ یونہی بھٹکتے پھریں گے۔ منزل سے دور ہو کر وہ زندگی سے بیزار ہو جائیں گے۔"

"آیا" وہ سسک رہی تھی۔ آیا اسے تھپ تھپاتی رہی۔

"لیکن میں۔ میں کیسے یقین کر لوں۔ کہ یہ سب سراب نہیں حقیقت ہے"

"ریحان کی گمبھیر ادائی یقین دلانے کو کافی ہے۔"

"مجھے یقین نہ دلاؤ ــــ میں ازلی بدنصیب ہوں۔ یہ خوش فہمی۔"

"حقیقت کو خوش فہمی نہ کہو۔"

"اپنے نصیبوں کو اتنا درخشاں کیسے مان لوں آیا۔ تاریکیاں ہی مقدر ہیں ــ روشنی کی کرنیں کیسے پھوٹ سکتی ہیں۔"

"اکثر اوقات سیاہ بادل اچانک پھٹ جاتے ہیں، صاعقہ۔ روشنی ہی روشنی بکھر جاتی ہے۔ تقدیر کے پلٹے کسی کے بس میں نہیں ہوتے۔"

"سچ آیا۔؟"

"بالکل سچ میری بچی ــ"

"آیا ــ آیا ــ!" صاعقہ اس سے لپٹ گئی۔ وہ اب بھی تذبذب کے عالم میں تھی۔ آیا نے اسے سینے سے چمٹا لیا۔ تسلیوں اور تشفیوں سے اس کی ہمت بندھانے لگی۔

"حد کر دی تم نے بھی ۔ نافی حضور کے سامنے اتنی بیباکی سے جواب دیتے رہے ۔"

"میں مجبور ہوں اسد ۔"

"ان کے لحاظ ۔"

"حیران ہوں ۔ سب اس قدر مشتعل کیوں ہیں ۔ یورپ جا رہا ہوں ۔ جہنم میں تو نہیں جا رہا ہوں ، اتنی گھبراہٹ ۔ سمجھ میں نہیں آتا گھر کا ہر فرد زنجیر کیوں بننا چاہتا ہے ۔ باہر جانا جرم ہے کیا ۔؟"

"قطعاً نہیں ۔!"

"تو پھر اتنی لے دے کیوں ہو رہی ہے ۔ ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے ۔ جیسے میں کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہوں ۔"

"یہ بات نہیں ۔!"

"تو اور کیا ہے ۔؟"

"تمھیں جشن تک روکنا چاہتے ہیں سب ۔"

"اوہ ۔"

"کچھ تو سوچو ریحان ۔"

"بہت کچھ سوچ لیا ۔"

ریحان نے سگریٹ سلگایا ۔ وہ جھلائے ہوئے نظر آ رہے تھے ۔ آج ان کی دی سے خاصی جھڑپ ہوئی تھی ۔ وہ راستے کا سنگ گراں جو ہٹا رہا تھا ۔ سید ریحان علی

فطرت کے انسان کا اس سنگ گراں سے ٹکرانا بعید از قیاس تو نہ تھا۔ اسد دیر سے انھیں سمجھا رہے تھے۔ لیکن ہر نصیحت نقش بر آب تھی۔ دونوں کچھ دیر خاموشی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔ ریحان اپنی نشست گاہ کی عقبی کھڑکی کے قریب کھڑے تھے۔ کمرے کی دودھیا روشنی میں ان کے چہرے پر پریشانی اور جھنجھلاہٹ کے تاثرات نمایاں نظر آ رہے تھے۔ اسد صوفے پر بیٹھے تھے۔ میز پر تازہ میگزین رکھا تھا۔ لیکن وہ سوچ میں ڈوبے تھے۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد انھوں نے بغور ریحان کو دیکھا۔

"اس ضد کی وجہ۔؟" اسد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ریحان کو مخاطب کیا

"شاید میں بتانے سے انکار کروں" ریحان نے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں" اسد گمبھیر آواز میں بولے۔

"تو پھر پوچھتے کیوں ہو" ریحان لاپروائی سے بولے۔

"کچھ انہونی کا بات نظر آئی ہے" جیسے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"انہونی جب ہو جائے تو شدت کی انتہا ہوتی ہے" ریحان نے جیسے اعتراف کر لیا۔

"کیا واقعی۔؟"

"ہوں"

"کیا واقعی ایک انتہا دوسری انتہا کو جنم دے چکی ہے؟"

"مجھے اقرار میں کوئی بات نہیں"

اسد نے نظریں ریحان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ریحان سگریٹ پھونکتے جا رہے تھے۔ اسد کو اس اقرار سے جو دلی مسرت ہو رہی تھی۔

"لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اسد بولے۔

"کیا۔؟"

"تمھاری اس آدم بیزاری۔ افسردگی۔ پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ یہ بلٹا تو خوشگوار ہونا چاہیئے تھا۔!"

ریحان نے کچھ جواب نہ دیا۔ نیا سگریٹ سلگاتے وقت انکے چہرے پر رنج و غم کے تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ ایک ٹھنڈی اور دلدوز آہ کھینچ کر وہ گئے سگریٹ سلگا کر انھوں نے منہ پھیر لیا۔ صحن چمن میں چاندنی ساحرانہ جال پھیلا رہی تھی۔ وہ اس طلسماتی جال سے نظریں الجھائے جانے کیا سوچنے لگے۔ اسد اٹھ کر ان کے قریب آ گئے۔ کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔

"ہوں" ریحان اسی انداز میں کھڑے رہے۔

"بتاؤ۔ نہیں۔؟"

"کیا۔؟"

"اس سارے عقدے۔"

"اسد کچھ نہ پوچھو۔"

"میں تمھارا دوست بھی ہوں اور بھائی بھی۔"

"پھر۔"؟

"کیا معمہ ہے۔؟"

"پریشان نہ کرو اسد۔"

"خواہ مخواہ بات بڑھائے جا رہے ہو۔ کہہ بھی دو۔!"

"کیا کہہ دوں۔ کچھ کہنے کو ہے ہی نہیں۔"

"تکلف برتنے کی ضرورت نہیں۔"

"اسد۔!"

"کچھ تو کہو دوست۔"

"کچھ بھی نہیں کہنے کو۔"

"میں بہت کچھ جان گیا ہوں۔ تمہاری اور صاعقہ۔"

"صاعقہ۔ صاعقہ ۔" وہ گہری سانس لے کر بولے "مجھے اعتراف ہے اسد۔ کہ وہ میری روح میں سما چکی ہے۔"

"یجان نے گہری سانس لے کر سگریٹ باہر پھینک دیا۔ مڑ کر اسد کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی جو افسردگی میں گھل مل گئی تھی۔ وہ قدرے مسکرائے۔ لیکن اس مسکراہٹ کو جیسے آگ سی لگی تھی۔

"یہی راز اگلوانا چاہتے تھے نا۔"

"نہیں ۔ یہ میں کئی دنوں سے جان گیا تھا۔"

"پھر ۔ پھر کیا چاہتے ہو۔"

"اس اعتراف کے باوجود پریشان کیوں ہو۔"

"اسد۔!"

"ہوں۔"

"میں نہیں جانتا کہ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہو گیا ہے۔ سوئے ہوئے جذبے کس شدت سے بیدار ہوئے ہیں۔ تمہیں کیوں کر بتاؤں اسد۔ اب تو اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی ممکن نظر نہیں آتا۔" وہ چپ ہو گئے نچلے ہونٹ کو کاٹتے ہوئے وہ اپنے زخمی جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

"ہوں۔ پھر۔" اسد نے آہستگی سے کہا۔

"اسد۔ میں۔ میں اپنے والہانہ عشق کے جواب میں کچھ ایسی ہی

جذبات کا متمنی ہوں۔"

"یہ خطرناک بات ہے۔!"

"لیکن۔" ریحان چپ ہو گئے۔ ان کے چہرے سے آثار کرب مترشح تھے۔ اسد خاموش رہے۔ ریحان کی گفتگو سمجھ کر وہ پریشان ہو گئے۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اسد۔ شدید نفرت۔ ایسی نفرت جس میں کسی لچک کی گنجائش نہیں۔ وہ۔ وہ میری موجودگی تک برداشت نہیں کر سکتی۔ اتنی سنگین نفرت ہے مجھ سے۔"

اسد کچھ کہنے کو الفاظ تلاش کر رہے تھے۔ غیر متوقع سی بات تھی نا؟

"اور تو پوچھنے کو کچھ باقی نہیں رہ گیا۔" ریحان نے مسکرانے کی کوشش کی پریشان چہرے پر افسردگیوں کا لامتناہی سیلاب سا امنڈ رہا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ دونوں مضطرب تھے۔ بیدردی سے سگریٹ پھونکتے رہے۔

"صاعقہ تم سے نفرت نہیں کر سکتی۔" آخر اسد بولے۔

"طفل تسلیوں سے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔"

"تمہیں ضرور غلط فہمی ہے۔"

"اسد۔ معاملہ ان خوش فہمیوں کی حدود سے آگے نکل چکا ہے۔"

"تمہیں اس نے کچھ کہا۔؟"

"اس نے مجھے دھتکار دیا ہے۔ وہ میری شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ نفرت۔"

اور پھر ریحان نے اس طرح کھڑے کھڑے اپنی ناکام محبت کی ادھوری اور نامکمل داستان اسد کے گوش گزار کر دی۔ اور حیران رہ

گئے ریحان کی حالت دیکھ کر انھیں ان پر رحم آ رہا تھا۔

"میری یہی سزا ہے اسد۔" ریحان ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ "میں نے عمر بھر جو کچھ اس کے ساتھ کیا ہے وہ اسی جذبۂ تنفر کو جنم دے سکتا ہے۔ قدرت کا انتقام خاموش ہوتا ہے۔ لیکن کتنا زبردست۔!"

ریحان نے کھڑکی کے پٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسد کا دل ان کی حالت دیکھ کر سلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ریحان نے آنکھیں کھول کر اسد کی طرف دیکھا۔ قدرے آگے کو جھک کر مایوس آواز میں بولے۔ "کاش وہ مجھے ایک بار معاف کر دیتی مجھے اپنی ناکامی کا دکھ اتنا شدید نہ ہوتا۔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر یہ دکھ سینے سے لگا لیتا۔ لیکن وہ تو مجھ سے اس حد تک متنفر ہے کہ میری پیہم کوششوں کے باوجود مجھے معاف تک نہیں کر سکی کوئی اور توقع رکھنے کا سوال ہی نہیں اسد۔"

"ہوں۔" اسد گم صم کھڑے تھے۔

"تم ہی کہو اسد میں کیسے یہاں رہ سکتا ہوں۔ یہاں آگ کی لپٹیں جو میری زندگی کو بھسم کئے دے رہی ہیں۔ میرا دل آگ کی لپٹوں سے دور بھاگ جانا چاہتا ہے دور ــــ بہت دور ــــ"

"سمجھتے ہو کہ دوری تمھیں سکون دے گی۔؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"زخم تو جہاں بھی جاؤ گے کسک دے گا۔"

"صرف کسک ہی ہو گی نا۔ نشتروں کی چبھن تو نہ ہو گی۔ تنفر بھری نظروں کا تازیانہ تو نہ ہو گا ــــ یہ لمحہ لمحہ کی موت میری برداشت سے باہر ہے اسد ــــ یہاں ناکامیاں میرا منھ چڑاتی ہیں ــــ۔"

اسد چپ تھے۔ کافی دیر خاموشی رہی۔ سگریٹ سلگتے اور ختم ہوتے رہے
ریحان نے ان کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے مسکرائے "تم جیسے لوگوں سے
بھی نوچھکا رامل جائے گا۔ پریشان کر کے زلیخا کو تم بل بھر راحت نہ دے
اسد مسکرا نہ سکے۔ وہ سنجیدگی سے کسی سوچ میں ڈوبے تھے۔

ہر جذبہ انتہا سے ٹکرا کر احساس کا رنگ کھو دیتا ہے۔ انسانی ذہن اس
لمحہ چٹیل میدان کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے۔ اس لمحہ سے صاعقہ بھی دوچار
ہوئی۔ وہ اس دروازے کے قریب کھڑی تھی جس میں ریحان اسد کے سامنے
اپنے دل کے کھوٹے کھوٹ رہے تھے۔ وہ دانستہ باتیں سننے نہیں رکی تھی
لاشعوری طور پر اس کے قدم رک گئے تھے۔ کچھ بے نام سے جذبوں کی کشش
نے مغلوب کر لیا تھا۔ ریحان کا سنجیدہ سا اعتراف سن کر وہ انتہا کی حد تک
سے جا ٹکرائی۔ جہاں خوشی و غم احساس کا رنگ کھو دیتے ہیں۔ درجہاں
ثانیہ بھر کے لئے ذہن چٹیل میدان کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے لیکن
جب وہ ہوش میں آئی تو اس کی حالت اس شرابی کی سی تھی جو کیف
و سرور سے بہک بہک جائے۔ اس لمحہ وہ کتنی خوش تھی۔ اس کا جی
چاہتا تھا چنچل ہواؤں کی طرح سرسراتی پھرے۔ غم غموں کی طرح ہر
ذرا سی بے پناہ مسرتوں کے سمیٹے سے سمٹ کر رہ جائے۔

جسے وہ اک طویل مذاق اور مسلسل تفریح سمجھ رہی تھی وہ ریحان کا
کتنا اصل حقیقت تھا۔ یہ بھی اس نے کبھی نہ جانا تھا۔ خود اس کی روح

بات پر ایمان لانے کو مچل رہی تھی۔ لیکن صاعقہ جس نے زندگی کے بیس سالوں میں تنفر۔ حقارت اور تضحیک کے سوا ریحان سے کچھ نہ پایا تھا۔ اس یقین کو جھٹلاتی رہی۔ آج اچانک ریحان کے اعترافِ عشق نے اس کے ذہن سے سارے بوجھ ہٹا دیئے۔ وہ جھوم جھوم گئی۔ اس کی روح میں لطیف سی گدگدی برداشت کی حدود کو توڑ توڑ گئی۔ ریحان جنھیں ان کے تنفر و حقارت کے باوجود اس نے چاہا تھا۔ جنھیں ناکامی کی روح فرسا احساس کے باوجود پوجا تھا جنھیں ایک ہولناک تغیر کے تعین کے باوجود رنگین سپنوں میں بسایا تھا۔

وہ ریحان۔ وہ دیوتا۔ وہ محبوب۔ وہ جان آرزو اس کا تھا۔ بالکل اپنا۔

صاعقہ بلندیوں پر پرواز کر رہی تھی۔ اس کی روح رقصاں تھی۔ اک وجدانی سی کیفیت اس کے سراپا پر چھائی ہوئی تھی۔

رات گئے حسب عادت آپا اس کی خواب گاہ میں آئی۔ تو وہ جاگ رہی تھی۔

"سوئی نہیں ابھی تک۔؟"

"نہیں۔"

"نیند نہیں آ رہی۔؟"

"نہیں۔!"

"بتی گل کر دوں۔؟"

"نہیں۔!"

"سو جاؤ!"

"نہیں۔" یہ کہتے ہوئے صاعقہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

آیا نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کمبل اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی

"میں نہیں سوؤں گی آیا۔"

"آدھی رات بیت چکی ہے۔"

"پوری بیت جانے دو آیا۔" اس نے وفورِ جذبات سے مغلوب ہو کر آیا کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"کیا بات ہے۔؟"

"آیا۔!"

"میری بچی۔"

"میں آج کتنی خوش ہوں آیا۔ تم نہیں جانتیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔ جاگ کر مجھے ان خوشیوں سے لطف اندوز ہونے دو۔" وہ آیا کے بازو ہٹا کر الگ ہو گئی۔ آیا نے پہلی بار اسے اتنا خوش دیکھا تھا زندگی میں پہلی بار۔ اس کی حسین آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹوں کی جگہ خوشیوں کے سوتے ابلتے دیکھے تھے۔ پہلی بار اس کے چہرے کی سپیدی میں سرخیوں کی چمک دیکھی تھی کانپتی پلکوں کے اٹھنے گرتے سایوں میں پہلی بار خوشیوں کے رقص دیکھے تھے۔

"مجھ سے پوچھو تو یہی آیا۔!" اس نے پیار سے آیا کا چہرہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ کتنی مجنونانہ حرکتیں کر رہی تھی۔ صاعقہ کو خوش دیکھ کر آیا کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔ کتنی مطمئن نظر آ رہی تھی وہ ــــ جیسے عمر بھر کی ریاضت کا ثمر پا لیا ہو۔

"کیا بات ہے؟" آیا نے جذبات سے رندھی آواز میں پوچھا۔ اک والہانہ انداز سے آیا کو دیکھ کر صاعقہ مسکرائی۔ موج کی طرح بل کھا کر مڑی اور بغیر دیئے

کے پٹ کھول دیئے۔ نرم جھونکے اس کے بالوں کو چھیڑتے ہوئے گزر گئے۔
"کھڑکی بند کر دو ہوا ٹھنڈی ہے۔" آیا نے کہا۔
"آج مجھے مت روکو آیا۔ کسی بات سے مت روکو مجھے وہی کرنے دو جو میں چاہتی ہوں۔"
"بڑی خوش ہو آج۔" آیا نے قریب آکر اس کے گالوں کو چھوا۔
"میری خوشیوں کا اندازہ نہ کر سکو گی آیا۔" وہ جھوم گئی۔
"کیا پا لیا۔"
"جس کی تمنا بھی جرم سمجھی تھی۔"
"سچ۔؟"
"سچ آیا۔ بالکل سچ۔" اس نے آیا کے کندھے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔
"سچ کہتی ہیں آیا۔ سچ کہتی تھیں تم۔ ریحان میرے ہیں۔ میرے ہیں آیا۔ ڈر لگتا ہے خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں کہیں۔"
وہ آیا سے لپٹ گئی۔ آیا کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ صاعقہ کو ساتھ لپٹا کر اس نے اس کی اندھیری راتوں جیسے سیاہ بال چوم لئے۔
"تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں میری بچی۔"
صبح ناشتہ کی میز پر صاعقہ نے ریحان کو دیکھا۔ اک سنسناہٹ سی اس کے پورے میں دوڑ گئی لطیف سی کپکپی ہونے لگی۔ خواہ مخواہ چہرہ سرخ ہوا جا رہا تھا۔ کتنا حجاب آ رہا تھا اسے ریحان سے۔ گھبرا بھی تو رہی تھی وہ انکے سامنے سے۔
ریحان کتنے پژمردہ اور نڈھال سے نظر آ رہے تھے۔ سب کا ساتھ دینے آ بیٹھے تھے۔ صرف چائے کی دو پیالیاں پی تھیں۔ ناشتے کی کسی چیز کو چھوا تک

نہیں تھا۔ صاعقہ انکے سامنے والی قطار میں بیٹھی تھی۔ لیکن انھوں نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا تھا۔ یہ دکھاوے کا تغافل دیکھ کر آج صاعقہ کتنی مسرت بھری تڑپ محسوس کر رہی تھی۔ منبر سے اُٹھتے وقت دونوں کی نظروں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ ریحان کی مایوس، افسردہ نگاہیں کتنی حسرتیں لئے تھیں۔ صاعقہ کا دل اس مایوس خفگی پر مچل گیا۔ جانے کیوں، اسکے ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ ریحان نے بھی یہ تبسم دیکھا۔ اور پھر بڑی دل آزاری سے گردن دوسری طرف پھیر لیا۔

ریحان باہر جانے کے لئے ضدی بچے کی طرح مچلے تھے۔ دادی کا کہا مان رہے تھے نہ والدین کی سرزنش کی پرواہ تھی۔ نہ پیار اور سختی کسی طرح سے بھی تو قابو میں نہ آ رہے تھے۔ حسن بانو کو ان دنوں طاہر یاد آ جاتے تھے۔ دونوں کے مزاج میں کتنی ہم آہنگی تھی۔ نٹ کھٹ ضدی سے ریحان طاہر ہی تو لگتے تھے حسن بانو کو پختہ یقین تھا کہ ریحان ضد سے ٹلنے کے نہیں، اسی لئے انکے رویہ میں کچھ لچک آ گئی۔ جانے کی اجازت اس صورت میں دی کہ وہ عید کے بعد منائے جانے والے جشن میں شرکت کر کے جائیں۔

ریحان بھلا ان صدبندیوں کے قائل کیوں کر ہوتے۔ اور یہ جشن جس سلسلے میں منایا جانے والا تھا۔ اس سے بھی آگہی تھی۔ پھر بھلا وہ اتنی مدت کیسے رک جاتے فوزیہ بھی چاہتی تھی کہ ریحان جشن کے بعد ہی جائیں۔ جوان لڑکے کو منگنی کی بندش ڈال دینے سے انکا باہر جانا مخدوش نہ تھا۔ لیکن ریحان جہاں دادی کی بات نہیں ٹال رہے تھے۔ ماں باپ کے سامنے بھی خم نہیں کھا رہے تھے۔ فوزیہ کا

کیا بھلا کتنا سود مند ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے زیرک دماغ نے اک راہ نکالی
سمیرا ریحان کو روک سکتی تھی۔ ریحان کا ترجمی سلوک اور سمیرا کے جذبات سے
وہ واقف بھی تو تھی۔ سمیرا ریحان کی ضد سے خود ہی متفکر تھی۔ ماں کی ایما پر
اس نے ریحان کو روکنے کے بارے میں سوچا۔ اپنے آپ پر اسے اعتماد تھا
وہ مناسب موقعہ کی تلاش میں رہی۔ ادھر صاعقہ بھی سوچ رہی تھی ریحان کو روک
لینے کے متعلق۔ لیکن کیسے اور کیوں کر۔؟ یہ مسئلہ کسی صورت حل ہونے میں آ ہی
نہیں رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ پچھلے پہر کی دھوپ کے لانبے لانبے سائے
دریچے کی راہ سے اندر آ رہے تھے۔ ان میں حدت تو نہ تھی ہاں روشنی کچھ
اجاگر ضرور ہو گئی تھی۔

صاعقہ طاہر کے کمرے میں تھی۔ کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔ گود میں ایک
پرانا البم رکھا تھا۔ بڑے انہماک سے وہ ان تصاویر کو دیکھ رہی تھی ہر صفحے پر
ایام رفتہ کے جامد نقوش تھے۔ طاہر دتاجی کے پیار کے عکس۔ صاعقہ کے دل
میں عقیدت کا بحر خار موجیں مار رہا تھا۔

"اوہ۔!" قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی کسی کے لبوں سے نکلا۔ صاعقہ
نے گردن موڑ کر دیکھا۔

دروازے میں ریحان کھڑے تھے۔ سیاہی مائل سلیٹی سوٹ میں ان کا
چہرہ اچھا خاصا زرد نظر آ رہا تھا۔

معاف کرنا مخل ہوا ہوں"۔ ریحان کمرے کے اندر آتے ہوئے بولے۔
ان کی بوجھل آواز ادائیوں میں ڈوبی تھی۔ صاعقہ کا چہرہ خواہ مخواہ سرخ ہو گیا
دراز پلکیں حسین آنکھوں پر بار بار جھکنے اٹھنے لگیں۔ کتنی نادم مسکراہٹ تھی
اس کے لبوں پر۔

"مجھے کچھ کاغذات لینے ہیں۔" ریحان اسی کی جانب دیکھے بغیر الماری کی جانب بڑھے کمرے کی مشرقی دیوار کے ساتھ بڑی سی الماری رکھی تھی جس میں کچھ پرانے کاغذات تھے۔ البم تھے اور طاہر کے ہاتھوں کی ہزاروں تصویریں تھیں۔ ریحان نے الماری کھولی اور مطلوبہ کاغذات ڈھونڈنے لگے۔ صاعقہ نے گود میں رکھا البم بند کر دیا۔ اور ان کی پشت پر نظریں جمائے ان کے وجیہہ پیکر کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

ریحان کبھی اوپر والے خانے میں کاغذ، البم اور تصاویر الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ کبھی جھک کر درمیانی خانے میں تلاش کر رہے تھے۔ کبھی گھٹنے کے بل جھک کر نچلے خانے میں چیزیں ادھر ادھر کر کے کاغذات ڈھونڈ رہے تھے۔ پانچ منٹ کی رائیگاں کوشش کے بعد وہ اٹھے۔ کرسی پر بیٹھی صاعقہ کی طرف دیکھا۔ حسن پر اک پُرنور سی شگفتگی تھی۔ ریحان اک لمحہ کے لئے بھول گئے کہ وہ کیا لینے کمرے میں آئے تھے۔

صاعقہ نظروں کی تندی اور انہماک سے گھبرا سی گئی۔ جھکی جھکی نظریں دو ایک بار اٹھیں اور ریحان کی نگاہِ شوق سے ٹکرا کر جھک گئیں۔ ریحان جلد ہی اپنے آپ میں لوٹ آئے۔ وہ پہلے سے بہت زیادہ دکھی نظر آنے لگے۔ "یہاں ایک فائل ہوا کرتی تھی، لمبی سی ـــــ سبز جلد والی؟" انھوں نے بڑی لاتعلقی سے پوچھا۔

"وہ دوسری الماری میں ہے۔" صاعقہ البم میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

ریحان کونے والی الماری کی طرف پلٹے۔ قریب پہنچ کر دیکھا۔ اس میں تالا پڑا تھا۔ تالے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ریحان نے صاعقہ کی طرف دیکھا۔

"چابی میرے پاس ہے" کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ خراماں خراماں محشر بداماں

پہلی الماری کی طرف گئی۔ اوپر والے خانے میں ایک ڈبہ پڑا تھا۔ اُٹھایا۔ چابیوں کا گچھا نکالا۔ پیتل کی چابی پکڑتے ہوئے اس نے گچھا ریحان کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لیجئے"

"شکریہ"

ریحان نے چابیاں لے لیں۔ صاعقہ ان کے قریب ہی کھڑی رہی۔ ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس دونوں کے حواس پر اثر انداز تھا۔ ریحان بہکے بہکے سے نظر آ رہے تھے۔ اور صاعقہ پر بھی گھبراہٹ کی خفیف سی کپکپی تھی۔ ریحان نے مطلوبہ فائل نکالی اور قریب ہی میز پر رکھ دی۔

"میری موجودگی تمہارے لئے ناقابل برداشت تو نہ ہوگی؟" ریحان نے گہری اداس آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "لیکن مجبوری ہے کہ کچھ کاغذات ضروری لینا تھے ورنہ میں تمہارے لئے بار نہ بنتا"

ریحان کی چوٹ پر صاعقہ دھیرے سے مسکرا دی۔ جیسے ہواؤں کی آوارہ چھیڑ سے کلیاں جھوم گئی ہوں۔ اس خواب ناک سی بھیگی بھیگی حیا بار مسکراہٹ کا مفہوم ریحان نہ سمجھ سکے۔

میز پر قدرے جھک کر فائل کھولی اور مطلوبہ کاغذات نکالنے لگے۔ صاعقہ اسی جگہ کھڑی رہی۔ ریحان نے فارغ ہو کر فائل بند کر دی۔ کاغذات اکٹھے کر کے میز پر رکھ دیئے۔ اور فائل واپس الماری میں رکھنے کے لئے اس طرف آئے۔ الماری کے پٹ کے ساتھ ہی تو صاعقہ کھڑی تھی۔ لیکن ریحان نے اس پر نگاہ نہیں ڈالی۔ اس تغافل پر وہ کچھ مسکرا دی۔ ریحان نے فائل اوپر والے خانے میں رکھنے کے لئے ایک طرف جگہ بنائی۔

"آپ واقعی یورپ جا رہے ہیں۔؟" ایک نغمہ بار آواز ریحان کے

کانوں سے ٹکرائی۔ اور اس غیر متوقع استفسار پر جو بلاشبہ بڑی اپنائیت سے کیا گیا تھا۔ ریحان حیران ہوئے۔ فائل پر ہاتھ رکھے انھوں نے گردن کو قدرے خم دے کر صاعقہ کی طرف دیکھا۔ صاعقہ سر جھکائے پاؤں سے قالین کو مسلے جا رہی تھی۔ ہاتھ پشت کی طرف تھے۔ جس سے اس نے کھڑے ہونے کے لئے الماری کا پٹ کا سہارا لیا تھا۔

رسمی استفسار سمجھ کر ریحان کی ادائی اور گہری ہو گئی۔ گردن موڑ کر اور پردے خانے کے دائیں طرف کتاب اٹھا کر فائل رکھ دی۔ اور بڑی لاتعلقی سے بولے۔

"میں ہفتے کو پرواز کر جاؤں گا۔!"

"کیوں جا رہے ہیں۔۔؟" اک چور تبسم ہونٹوں میں دبائے صاعقہ نے آہستگی سے کہا۔

ریحان نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ حیرانگی سے کہیں زیادہ وہ چونک گئے تھے اس ردعمل پر۔ صاعقہ کے لہجے کی اپنائیت اور لگاؤ اچنبھے کا باعث تھا۔ لیکن یہ لگاؤ اجنبی سا لگا۔ سوچ کے دھاروں کا رخ بدل نہ سکا قدرے ترشی سے بولے "یہ پوچھنے کا تمھیں کیا حق ہے۔"

"شاید کوئی ہو۔۔" وہی کھوکھلی آواز ابھری۔ لگاؤ سے بھرپور۔ اپنائیت کا پہلو لئے ہوئے۔

ریحان کے ہاتھوں سے کتاب، گرتے گرتے بچی۔ صاعقہ کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں میں دبا دبا سا تبسم بکھر جانے کی کوشش میں تھا۔ ریحان کو اپنی بصارت و سماعت پر قطعاً یقین نہیں آ رہا تھا۔ چند ثانیے خاموشی رہی وہ اسے دیکھتے رہے۔ خاموشی سے گھبرا کر سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر صاعقہ نے سر اٹھا کر ان کی طرف حیا بار نظروں سے دیکھا

مسکراہٹ قابو میں نہ رہ سکی۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔ چور تبسم پھسل پھسل گیا۔

"صاعقہ" ریحان جیسے خواب میں بڑبڑائے۔

"جی" جواب میں سرگوشی ابھری۔

"کیا کہا تھا۔؟" بہت کچھ سمجھنے کے باوجود یہ استفسار بے محل نہ تھا۔

"سن لیا ہوتا" اک شوخ ادا سے نگاہ غلط انداز ان پر ڈالتے ہوئے وہ قریبی کھڑکی کی طرف گھوم گئی۔ ریحان گنگ سے کھڑے تھے۔

صاعقہ بظاہر لاتعلقی سے دریچے میں کھڑی باہر حد نگاہ تک پھیلے ہوئے سبزے کو دیکھتی رہی۔ چند ثانئے یوں ہی گزر گئے۔ امید نے اک راہ دکھائی ریحان ڈگمگاتے قدموں سے اس پر چل دیئے۔ بڑھ کر اس کے قریب آ گئے۔

"سن تو لیا۔ لیکن سمجھا نہیں"

صاعقہ وہ اسکے برابر آ کر دریچہ میں کھڑے ہو گئے صاعقہ نے حسین گردن کو ہلکا سا خم دے کر اپنی گوشہ چشم سے بڑے مستانہ انداز میں دیکھا آج کوشش کے باوجود لبوں پر مسکراہٹ لہرانے سے بر سے آ رہی تھی اسکا ہر انداز جرات کی کھلی دعوت تھا ریحان کی سنجیدگی کچھ اور بڑھ گئی۔

صاعقہ نے ایک کافر نگاہ ان پر ڈالی" سمجھ میں نہ آنے والی کیا بات تھی" ریحان از خود رفتہ سے کھڑے ہو گئے۔

صاعقہ نے ادائے دل نوازی سے انکی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر حیات افروز تبسم لہرا گیا۔ گردن موڑ کر وہ پھر باہر دیکھنے لگی۔ ریحان بے بسی بے خود نظر آ رہے تھے۔ ان کی حالت اس مسافر کی سی تھی۔ جو مدتوں بھٹکتے رہنے کے بعد اچانک اور بالکل اچانک منزل سے ہم کنار ہو گیا ہو۔

انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے عالم خواب میں ہوں۔ واقعات خود بخود ڈھلتے جا رہے ہوں۔ اور ان کا ان پر اختیار ہو نہ قابو۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ خاموشی جو دونوں کے صبر کی انتہا سے ٹکرا رہی تھی اور پھر! خاموشی ہی خاموشی میں جذبات مچل گئے۔ ریحان نے صاعقہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ ریحان نے اسکا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ وہ کسی مشینی گڑیا کی طرح انکی طرف گھوم گئی۔ خاموشی کے طلسم سے دونوں مسحور نظر آ رہے تھے۔

وہ ریحان کے مقابل کھڑی تھی۔ ریحان کا بایاں ہاتھ اسکے کندھے پر تھا۔ داہنے ہاتھ سے انھوں نے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔ انگلی کے سہارے سے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

صاعقہ کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

"تمھیں... کیا سمجھوں۔" خاموشی میں اک سرگوشی ابھری۔

"اپنے دل کی آواز۔" صاعقہ نے لمحہ بھر کو آنکھیں کھول کر ریحان کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سچ۔؟" وفور جذبات سے آواز کانپ گئی۔ صاعقہ کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ وہ لہرا گئی جیسے اپنا ہی بوجھ اٹھانے کی سکت نہ رہی ہو۔

"صاعقہ۔!" بیتابی سے ریحان نے اس کے لہراتے وجود کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ وہ کسی مدافعت و مزاحمت کے بغیر ان کی چھاتی سے جا لگی۔ ریحان کے بازوؤں کی گرفت اور سخت ہو گئی۔ وہ اسے سینے میں چھپا لینا چاہتے تھے۔ جیسے دل کی آواز کو دل ہی میں سمو لینا چاہتے ہوں۔

"ریحان۔!" صاعقہ سسک اٹھی۔ اس کے آنسوؤں سے ریحان کی قمیص

نم ہو گئی۔ ریحان گنگ سے ہو گئے۔ صاعقہ کے ریشمی بالوں پر گال ٹکا کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اس مسافر کی طرح نظر آ رہے تھے جو پہروں تپتی دوپہر میں ریتلے میدان میں ننگے پاؤں چلنے کے بعد اچانک کسی گھنیرے درخت کی چھاؤں پا کر بے سدھ ہو گیا ہو۔!

اسی شام کے ڈوبتے اندھیروں میں سمیرا ریحان کے انتظار میں برآمدے کے ستون کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ ماں کے ایما اور دل کے تقاضوں سے مجبور ہو کر آج وہ ریحان کو باہر جانے کی ضد سے باز رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی حسب توقع ریحان ادھر آئے۔ وہ بڑی ترنگ میں تھے۔ کسی دلنواز نغمے کی طرح لہرا رہے تھے۔ سمیرا کو دیکھ کر وہ خود بھی رک گئے۔ دو چار رسمی باتوں کے بعد ریحان نے جانا چاہا۔ لیکن سمیرا نے انھیں باتوں میں الجھائے رکھا۔

"آپ کب تک جا رہے ہیں ریحان؟" اس نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں۔؟"

"یورپ۔"

ریحان مسکرا دیئے۔

"کب جا رہے ہیں۔؟"

"تمھیں کس نے کہا۔"

"کیا۔؟"

"کہ میں کہیں جا رہا ہوں"

"ٹالئے نہیں"

"ٹالنے کی کیا بات۔ میں جا ہی کب رہا ہوں" وہ ہنس دیئے۔

"ارادہ بدل دیا۔؟ سمیرا سنجیدہ تھی" "بتلایئے نہیں۔ سچ سچ کہیئے"

"ہاں۔!"

"سچ۔؟"

"با لکل"

"آپ کی ضد تو ہنگامہ بن چکی تھی۔ یہ اچانک تبدیلی کیسی کہیں مذاق تو نہیں کر رہے۔!"

"نہیں سمیرا مذاق نہیں ـــ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں"

"اچانک ارادہ بدل گیا۔!"

"ہاں اچانک"

"کیوں۔؟"

"ہر بات پوچھا نہیں کرتے۔!" ریحان نے اس طرح کہا جیسے کسی چھوٹے سے بچے کو بہلانے کی کوشش کی ہو۔

"کچھ کہی۔؟" سمیرا سنجیدہ تھی۔

"تم کیا چاہتی ہو۔ کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں" ریحان نے مذاق میں کہا۔

"ہائے اللہ! آپ تو ہر بات مذاق میں اڑا دیتے ہیں ـــ میں تو پوچھ رہی ہوں آپ یوں اچانک ارادہ ملتوی کیوں کر بیٹھے۔؟"

"کہہ دیا نا ہر بات پوچھا نہیں کرتے" ریحان کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی سمیرا انھیں اتنے دنوں بعد مسرور دیکھ کر حیران بھی تھی۔

"بڑے خوش نظر آرہے ہیں۔"

"مجھ سے دشمنی ہے کوئی۔"

"کیوں۔؟"

"خوشی دیکھ جو نہیں سکتیں۔"

"ہائے اللہ۔!" وہ لجا گئی۔

"کبھی کہتی ہو۔ میں نے جانے کا ارادہ کیوں ترک کر دیا۔ یعنی تمھارے خیال کے مطابق مجھے چلا جانا چاہیئے تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میرے جانے سے خوش ہو۔"

"تو یہ۔ باتیں بنانا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ میں آپ کے جانے سے خوش کیوں ہونے لگی۔ میں تو خود نہیں چاہتی کہ آپ جائیں۔" کیمرا کی آواز کچھ کانپ سی گئی۔

"دیکھ لو۔ ہم نے تمھاری خواہش کا کتنا احترام کیا۔" ریحان نے بڑی ترنگ میں کہا۔ "جانے کا ارادہ ہی بدل دیا۔"

کیمرا مذاق کو حقیقت کا رنگ دے کر فرط مسرت سے سرخ ہو گئی۔ گناہ رخ کے آجانے سے وہ چپ ہو گئی۔ ریحان چند ایک ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے گئے۔ آج وہ کتنے خوش تھے۔ یہ ان کا دل ہی جانتا تھا۔ پھول کی طرح کھل رہے تھے۔

لپکتے لپکتے وہ طویل برآمدہ طے کر کے دائیں طرف مڑے۔ اپنی دھن میں تھے۔ اسد سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"اوہ!" دونوں کے منھ سے نکلا۔ پھر دونوں مسکرا دیئے۔

"میں تمھیں ہی تلاش کر رہا تھا۔ کہاں تھے۔ کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اسد نے کہا۔

"ایسی کیا ضرورت تھی۔؟" ریحان شوخی سے مسکرائے۔

"تمھارے کاغذات لے آیا ہوں۔"

"اوہ۔!"

"پورا دن نذر ہو گیا ان سرکاری کارروائیوں میں۔"

"مجھے افسوس ہے۔ تمھاری محنت رائیگاں گئی۔" وہ ہنس دیئے۔

"کیوں۔؟" اسد کچھ نہ سمجھے۔

ریحان شوخی سے مسکرائے۔

"محنت رائیگاں کیوں گئی۔؟"

"ان کاغذات کو آگ دکھا دو۔" وہ شوخ نظروں سے اسد کی طرف دیکھ کر بولے۔

"کیا کہہ رہے ہو۔؟" اسد جھنجھلائے۔

"میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے اسد۔" ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ریحان شوخی سے مسکرا دیئے۔ "اب میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جا سکتا نہیں جا سکتا اسد۔!"

ریحان دفعتہ جذبات سے مغلوب ہو کر اسد سے لپٹ گئے۔ یہ والہانہ اندازِ تکی بے پناہ خوشیوں کا غماز تھا۔ اسد کو اپنے عزیز دوست کی خوشی سے بے پناہ مسرت ملی۔ "یہ مجھ سے زود آزمائی کس لئے کر رہے ہو۔ بات کیا ہے مجھے تو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا۔ چہرہ تو دکھاؤ۔ ریحان ہی ہو۔ یا ان دونوں کے پیکر میں کوئی اور روح سما گئی ہے۔" اسد ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"مذاق نہ کرو اسد۔ میری خوش بختیوں پر مجھے مبارک باد دو۔" ریحان

ان سے الگ ہو کر بولے۔

"یہ خوش بختیاں اچانک کہاں سے ٹپک پڑیں۔

"اللہ کی دین ہے۔"

"وہ تو ہے ہی۔ لیکن یہ دین اچانک ہوئی کیسے؟ وہ آگ کی لپٹیں کیا ہوئیں؟"

"گلزار بن گئیں۔"

"وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسے؟"

"یہ تو میں ابھی تک خود بھی سمجھ نہیں پایا۔"

"بنتے کیوں ہو۔"

"واللہ نہیں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔"

اور پھر اسد کے اصرار پر ریحان نے صاعقہ سے ملاقات کی ساری روئداد کہہ ڈالی۔ اسد مسکراتے ہوئے سن رہے تھے۔

"میں نہ کہتا تھا۔ تمھیں ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"مایوسی کے اندھیروں میں ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔"

"واقعی ہر چیز سیدھی نظر آتی تھی۔"

"اور اب۔؟" اسد نے شوخی سے پوچھا۔

"اب۔ اب کچھ نہ پوچھو دوست۔" ریحان شوخی سے جھوم گئے۔ شعر کی لطافت محسوس کی جا سکتی ہے۔ تشریح اس لطافت کو کثیف کر دیتی ہے۔"

"اور ہو۔!"

وہ دونوں مسکرا دیئے۔!

رات فسوں خیز تھی۔ ریحان خواب گاہ کے مغربی دریچے کھولے باغ کی اونگھتی فضاؤں اور مدہوش ہواؤں میں گم سے تھے۔ تقدیر کا اچانک اور غیر متوقع التفات جہاں بے پناہ خوشیوں کا حامل تھا۔ وہاں اک لطیف سی الجھن بھی پیدا کر گیا تھا۔ صاعقہ کے نرم و گداز جسم کا لمس اور اس کے میکدہ سانسوں کا ہوش ربا طلسم ابھی تک حواس پہ چھایا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے جاگتے میں کوئی حسین سا خواب دیکھ لیا ہو۔ اور پھر جانے کیوں وہ یہ سوچ کر بے قرار سے ہو گئے کہ یہ کہیں کوئی انوکھا خواب ہی نہ ہو۔ کوئی فریب خیال۔ کوئی سراب۔ اپنی تشنہ آرزوؤں کا عکس۔ وہ سوچ سوچ کر گھبرانے لگے۔

شام کے بعد انھوں نے صاعقہ کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ رات کے کھانے پر بھی حاضر نہ تھی۔ کیا عجب تنہائی کے فسوں نے ان لمحوں کو جنم دیا ہو۔ جنھیں اپنی تقدیر کے درخشندہ ستارے سمجھ بیٹھے ہوں۔ یہ خیال مضحکہ خیز بھی حد سے بعید بھی۔ لیکن ریحان اس خیال سے بے طرح گھبرانے لگے۔ بعض اوقات انسان اپنی الٹ پلٹ سوچوں ہی سے اپنے لئے خاصی الجھنیں پیدا کر لیتا ہے۔ ریحان بھی اسوقت کچھ اسی کیفیت سے دوچار تھے۔ وہ کمرے سے نکل آئے کچھ دیر برآمدے میں ٹہلتے رہے۔ ان کا جی چاہا۔ صاعقہ کی خواب گاہ میں جا کر اسے بلا لائیں اور مدہوش اور متوالی فضاؤں میں ایک دوسرے کے قریب ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ وقت گزرتا جائے۔ گزرتا جائے اور

وقت اور ماحول کی قید سے آزاد ایک دوسرے میں کھوئے رہیں۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ جرأت کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ لیکن عشق عقل کی قید و بند میں کب تک محبوس رہ سکتا تھا۔ وہ بڑے برآمدے کا آخری مور گھوم کر صاعقہ کی خواب گاہ کی طرف چل دیئے۔

دروازے سے چند قدموں کے فاصلے پر تھے کہ آیا خوابگاہ سے باہر نکلی ریحان کچھ جھجکے۔ پھر آگے بڑھ گئے۔ "صاعقہ سو تو نہیں گئیں؟" ریحان نے چلتے چلتے آیا سے پوچھا۔

"نہیں" آیا نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی لازوال چمک تھی۔

ریحان قدم بڑھا کر دروازے کے قریب پہونچے۔ لیکن پردہ اٹھانے سے پہلے آیا کی آواز پر پلٹے۔

"صاحبزادہ صاحب وہ کمرے میں نہیں ہیں"

"کہاں گئیں ۔۔؟"

"شاید باغ میں"

"اس وقت ۔۔؟"

"ہاں ۔ کہہ رہی تھیں نیند نہیں آ رہی"

ریحان نے چاہا پوچھ لیں ۔ بیرونی باغ میں گئی ہیں ۔۔ یا پچھلے ۔۔ لیکن آیا سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ جہاں بھی ہوں گی جذبۂ عشق اسے ڈھونڈ لے گا وہ مڑے ۔ آیا نے آہستگی سے کہا "پچھلے باغ میں شاید بارہ دری کی طرف گئی ہیں ۔ شام مجھے ستا [illegible] کے لئے کہا تھا۔

آیا مسکراتے ہوئے کہہ [illegible] ریحان اس مسکراہٹ سے کچھ خفیف سے نظر آنے لگے ۔ آیا کو محبت سے دیکھتے ہوئے وہ ساتھ والے کمرے کا

دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ پچھلے باغ میں جانے کیلئے یہ راستہ مختصر تھا ریحان جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتے چلے جا رہے تھے۔ مقناطیسی کشش منزل کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔

بارہ دری کی سنگین عمارت ٹھنڈی اور دھیمی چاندنی میں بڑی پراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں جانب کی سیڑھیوں پر ارغوانی قالین بچھا تھا جو چاندنی میں سیاہی مائل نظر آ رہا تھا۔ صاعقہ نے دودھیا رنگ کا چمکیلا گاؤن پہن رکھا تھا جس کی ڈوریاں اس کے کندھوں کے ڈھلانوں پر پھسل رہی تھیں باریک سا دوپٹہ شانوں پر پھیلا تھا۔ گاؤن کا پھیلاؤ بارہ دری کی دوسری طرف پڑتا تھا۔ وہ اس ملگجی سی چاندنی میں کوئی خوابناک سا تصور لگ رہی تھی۔ ستار قریب ہی رکھا تھا لیکن صاعقہ کا دھیان اس کی طرف نہ تھا۔ قریب ہی پھولوں کی بیلیں اٹھتی چلی گئی تھیں۔ صاعقہ لاشعوری طور پر بیل سے پھول اور پتیاں نوچتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ ریحان دبے قدموں سے اسکے قریب آ گئے دودھیا چمکیلے لباس میں صاعقہ بیٹھی انھیں یوں محسوس ہوئی جیسے چاند کی ساری چاندنی صاعقہ کے پیکر میں سمٹ آئی ہو۔ نگاہ شوق و تجسس سے دیکھتے ہوئے وہ اس کے سامنے آتے ہوئے رک گئے۔

"اوہ" صاعقہ کی محویت ٹوٹی۔ کچھ گھبراہٹ، کچھ شوق، کچھ وارفتگی اس کے سراپا پر چھا گئی۔ ریحان مسکرا دیئے۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی لیکن اس کی مسکراہٹ میں حیا کا بار اتنا تھا کہ وہ پھر ریحان کی طرف نہ دیکھ سکی آج شام اسے جانے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کس بیباکی سے ریحان کے سینے سے جا لگی تھی۔ اس احساس سے وہ کتنی زیر بار تھی۔ کتنی شرم آگیں تھی اسے رات کھانے کے کمرے میں بھی تو اسی لئے نہ گئی تھی ریحان سے سامنا کرتے ہوئے

سے بڑی جھجک آتی تھی۔ وہ دیر ہی سے سوچ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ اب ریحان کو یوں سامنے کھڑے دیکھ کر وہ گھبراہٹ اور ندامت کے ملے جلے جذبات سے دوچار تھی۔ لیکن ان جذبات میں شوق کا عنصر بھی تھا۔ ہجوم تمنا بھی اور جانفزا آرزو بھی۔ وہ جھجک کر سمٹی۔ ریحان بلا جھجک اسکے قریب جا بیٹھے۔ صاعقہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ ریحان کی جوان جوان نظروں سے کتنا حجاب آ رہا تھا۔

"مخل تو نہیں ہوا۔؟" ریحان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

صاعقہ لجا گئی۔

"صاعقہ۔!" ریحان قدرے وقفے کے بعد پھر بولے۔

صاعقہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی تو زبان گنگ ہو گئی تھی جیسے ریحان کی قربت لطیف احساسات کو بھڑکا رہی تھی۔ ایک سرور سا تھا جو سر تا پا چھایا جا رہا تھا۔ جواب دینے کی فرصت ہی کسے تھی۔ ریحان نے گردن کو خم دیکر قدرے جھکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ شرمائی لجائی صاعقہ دل کی گہرائیوں میں اتر گئی اک طمانیت کا احساس ان کی شریانوں میں دوڑتے لہو میں نشیلی کیفیت پیدا کر گیا۔

"میری موجودگی ناقابل برداشت تو نہیں۔؟" محجوب نظروں کی شہ پاکر ریحان شوخی سے بولے۔ صاعقہ نے اک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالی۔ اس کے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ ایسی خاموشی جس میں نغموں کا ترنم تھا۔ بہاروں کی دلکشی تھی۔ ایک دوسرے کی جانفزا قربت کا احساس جو اس پر سرور انبساط بن کر چھا رہا تھا۔

"صاعقہ۔!" سکوت کو اس سرگوشی نے توڑ دیا۔

"جی ــــ" وہ آہستگی سے بولی۔

"نیند آرہی ہے۔؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"پھر چپ کیوں ہو ــــ کوئی بات کرو۔"

صاعقہ نے ان کی طرف دیکھا ایسی نظروں سے جن پر خواہ مخواہ پیار آجائے۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں۔ اب بات کرنے کو رکھا ہی کیا ہے۔

"تنہائی چاہتی ہو۔ تو میں چلا جاؤں۔" کچھ رک کر ریحان بولے۔

"تنہائیوں سے نباہ کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔" صاعقہ مترنم لہجے میں بڑی آہستگی سے بولی۔

"صاعقہ۔" ریحان وفور جذبات سے آگے کچھ نہ کہہ سکے بے اختیار ہو کر انھوں نے صاعقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اسی مترنم خاموشی کا فسوں طاری تھا۔ نرم و گداز سنہری ہاتھ ریحان کے مضبوط ہاتھ میں تھا۔ وہ بے اختیاری کے عالم میں بار بار ہاتھ دبا رہے تھے۔ یہ دباؤ انکے پیار کی شدت اور عشق کی تڑپ کا غماز تھا۔ صاعقہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ریحان نے اسکا ہاتھ نہیں اس کی زندگی کی باگ ڈور اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لی ہو۔ اس رات دونوں دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے کی قربت کا جانفزا احساس نشہ بن کر چھایا رہا۔ دونوں نے بہت کم باتیں کیں۔ لیکن۔ جو سرور تکلم اس خاموشی میں تھا وہ شاید صدیوں باتیں کرنے پر بھی میسر نہ آسکتا تھا۔!

ابھرتی صبحوں کے فرحت بخش اجالے اور ڈوبتی راتوں کی چاندنی کے نور میں ڈوبے اندھیرے صاعقہ اور ریحان کے عشق کے شاہد تھے۔ دن میں بہت کم دونوں کا ٹکراؤ ہوتا۔ اگر ہوتا بھی تو صاعقہ بڑی خوبصورتی سے کترا جاتی۔ ریحان بعض اوقات جھنجھلا بھی جاتے۔ شاکی ہوتے تو صاعقہ بڑی ادا ئیت سے کہتی۔ "آپ بدل گئے ہیں ریحان۔ زمانہ تو نہیں بدلا۔ جبھی ہوئی نظروں کا نشانہ کیوں بنانا چاہتے ہیں مجھے"

ریحان قائل ہو جاتے۔ گھر والوں کے خیالات سے وہ بے خبر تو نہ تھے صاعقہ بچی ہی تو تھی۔ یہ اسکی محتاطروی تھی۔ جواب تک دونوں کے تعلقات عشق کی بلندیوں کو چھونے کے باوجود کسی کی نظروں میں نہ کھٹکے تھے۔ ریحان کے ہمدم و ہمراز اسد تھے۔ ریحان کی دل کی دھڑکنوں کی نئے پرتھرکتے ہوئے نغمے انھیں سنا دیا کرتے تھے۔ اسد کتنے خوش تھے۔ لیکن اسکے باوجود ماحول و فضا دیکھتے ہوئے ریحان کے رازان کے سینے کی گہرائیوں میں دفن تھے لیکن احتیاط کے باوجود صادق جذبات کا اظہار موقع بے موقع ہونے ہی لگا کوئی صاعقہ کی نخوست کا نام لیتا تو ریحان کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو جاتا بات کرنے والے کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ یہ حمایت اکثر نظروں میں کھٹکنے لگی۔ کوئی کھیل کھیلا جاتا تو صاعقہ کا وہاں ہونا ضروری ہو جاتا۔ کھیل میں حصہ لینا نہ سہی۔ خاموش تماشائی کی حیثیت سے اسے وہاں بیٹھنا پڑتا۔ اب تو ریحان کی نگاہیں ایسے موقعوں پر محبت و عقیدت کے خاموش اظہار میں

بھی بیباکی سے کام لینے لگی تھیں۔ ریحان کے بدلتے تیور کئی ہم جلیسوں کی نظروں میں کھٹک رہے تھے لیکن ابھی تک اظہار خیال کی جرأت کسی کو نہ ہوئی تھی ایسی انہونی بات پر یقین کرنا بھی تو آسان نہ تھا۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔

فرخ نے سینما کا پروگرام بنایا اس تفریح کے لئے وہ دن سنیما میں بہت تھا کچھ ردّ و کد کے بعد وادی حسن بانو سے اجازت لے لی گئی۔ کہ نوجوانوں کی پارٹی سینما جائے گی۔ مقررہ وقت پر دس پندرہ لڑکوں اور لڑکیوں کا حسین جمگھٹا برآمد، تھا۔ چار موٹریں تیار تھیں۔ سب سے اگلی موٹر ریحانہ کی ذاتی گاڑی تھی۔ جس کے پائدان پر ایک پاؤں رکھے وہ سیاہ چشمہ ہاتھ سے گھما رہے تھے۔ اگلی سیٹ پر کیمرہ بھی رکھا تھا۔ سب سے الگ تھلگ کھڑے وہ سراپا انتظار تھے۔ سراسمہ میں خاصا شور تھا۔ لپٹی اور رنگین لباسوں کی مہکتی سرسراہٹیں اس شور کو مترنم بنا رہی تھیں۔

"سب آ گئے۔؟" فریدہ نے آتے ہی اک اطمینانی نظر اس حسین جمگھٹے پر ڈالی۔

"ہاں۔" کسی نے جواب دیا۔

"تو انتظار کس کا ہے۔ وقت تو ہو رہا ہے"

"صاعقہ نہیں آئیں۔" نگینہ نے کہا۔

"وہ بھی جائے گی۔؟" سمیرا نے بڑی نخوت سے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" شاہد بولے۔

"کسی نے کہا تھا اس سے۔؟" فرخ نے پوچھا۔

"پروگرام تم نے بنایا کہنا بھی تمہارا ہی فرض تھا۔!" نعیم بولے۔

"مجھے تو اس کا خیال ہی نہ آیا۔" فرخ نے کہا۔

"اب جا کر کہہ دیں، وہ کون سا جائے گی۔" سمیرا نے جیسے اسکی کس میپرسی

پر رحم کھایا ہو۔

"جائیں گی کیوں نہیں۔" اسد بولے۔

"اب کہوں تو برا مانیں گی۔" فرخ کچھ کسمسائے۔

"کچھ ضرورت نہیں اب۔ میں نے کہہ دیا تھا۔" اسد بولے۔

"پھر آئی کیوں نہیں۔"

"میں نے کہا نا۔ اس کو جانا تھوڑی ہی ہے۔ یہ پروگرام کوئی نیا تو نہیں۔ پہلے کب ہمارے کسی پروگرام میں حصہ لیا ہے اس نے۔" سمیرا بڑے غرور سے بولی۔

"کبھی جائیں گی اور ضرور جائیں گی۔" اسد نے دور کھڑے ریحانہ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن اس مسکراہٹ کو معنی کا جامہ کوئی نہ پہنا سکا۔ بے معنی باتیں ہوا کیں۔

"وہ آ گئیں۔" اسد نے برآمدے کے آخری سرے پر صاعقہ کو دیکھا۔ سفید لباس میں وہ یوں نمودار ہوئی جیسے شفاف طلاع پر اچانک ماہ کامل نمودار ہوا ہو۔ جھجکتے قدموں سے وہ اس رنگ و بو کے سیلاب کی طرف بڑھی۔

"چلو چلو جلدی کرو۔" نعیم نے آستین کھینچ کر وقت دیکھا۔

کئی نظریں صاعقہ کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ کوئی اس کے حسن کی معترف ہوئیں کوئی مرعوب ہو کر رہ گئیں۔ سمیرا نے اسے سر تا پا یوں گھورا جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔ اس کے آجانے سے محفل کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا تھا۔ اب تک ستارے ہی جھلملا رہے تھے۔ چاند اتر آنے سے جیسے ستاروں میں روشنی نہ رہی ہو۔ باتیں کرتے ہوئے لڑکوں لڑکیوں کا حسین جھرمٹ پل بھر میں آ گیا صاعقہ سب سے پیچھے تھی۔ ثمینہ ساتھ دینے کو کچھ رسمی سی باتیں کر رہی تھی۔ ریحانہ اسے دیکھ کر سب کی طرف آ گئی۔

"بیٹھنے کی کیا ترتیب ہوگی۔؟" فرخ نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی۔

"چار موٹریں ہیں حساب نکالو۔" نعیم بولے۔

"چار نہیں۔" ریحان نے ٹوکا۔

"کیوں۔ چار ہی تو ہیں۔" فرید گھنتے ہوئے بولے۔

"میری گاڑی شامل نہ کرو۔" ریحان اسد کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھ کر بولے۔

"کیوں۔؟" کئی آوازیں تھیں۔

"اس میں صرف ایک سواری کی گنجائش ہے۔" ریحان ہنسے۔ اسد انھیں گھور کر مسکرائے۔ اور صاعقہ اس شوخ جسارت پر سرتاپا کانپ گئی۔

"وہ کون خوش نصیب ہے۔؟" نعیم نے کن آنکھوں سے کمیرا کی طرف دیکھا۔ ماہ رخ نے کمیرا کی کمر میں ٹھوکا دیا۔ کمیرا کانوں کی لوؤں تک سرخ ہوگئی۔!

"بھئی جلدی کرو نا دیر ہو رہی ہے۔" اسد نے بات کا رخ بدلا۔

"کون کس گاڑی میں بیٹھے یہ بھی تو پتہ چلے۔" ریحان نے تو صاف جواب دے دیا ہے۔ اب ایک گاڑی اور نکالنا پڑے گی۔"

"میں نے تو صاف بات کہہ دی۔"

"تو پھر لے جائیے اپنی سواری کو۔"

ریحان بڑھے۔

سب کی نظریں کمیرا پر لگی تھیں۔ جو پھولوں سے لدی شاخ کی طرح دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ لیکن سب کا قیافہ غلط تھا۔

ریحان سب کے پیچھے سے گھوم کر صاعقہ کی طرف آئے۔ صاعقہ اس غیر متوقع بات پر بے طرح گھبرا گئی۔ اسی کا رنگ فق ہوگیا۔ سب کی نظریں اسکی طرف اٹھ گئی تھیں

"آؤ۔!" ریحان نے اس کی حیرت سے پوری کھلی آنکھوں میں مسکرا کر دیکھا۔

صاعقہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"آؤ بھی" ریحان نے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے اسکا ہاتھ تھاما۔ اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے گاڑی تک لے گئے۔ اک سناٹا سا طاری ہو گیا تھا۔ شدید اور حیرت سے بت بنے سب دیکھتے رہ گئے۔ ریحان نے کسی کی پروا کئے بغیر اسے اگلی نشست پر ڈھکیلا۔ دروازہ بند کر کے دوسری طرف آئے۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے دروازہ بند کیا اور پھر سب کی طرف دیکھے بغیر گاڑی چلا دی۔ اسد کے علاوہ کوئی بھی تو کچھ نہ سمجھ سکا۔

"یہ کیا!؟؟" آنکھوں ہی آنکھوں میں استفسار ہو رہے تھے۔ ایسا خاصا معمہ تھا۔ جو نوعیت کے اعتبار سے انوکھا بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ ہر کوئی اس معمے کا حل چاہتا تھا۔

"بیچاری۔!!"

تو اور کیا۔ ریحان ساتھ لے گئے ہیں۔ اللہ جانے کیا گت بنائیں گے۔"

"کوئی نیا مذاق سوجھا ہے انھیں۔؟"

"میں بھی دیکھ رہا تھا کئی دنوں سے ریحان اس کی حمایت کر رہے ہیں۔"

"یہی تو ان کے مذاق کی تمہید ہے۔!"

"پچھلے واقعات یاد نہیں آپ کو۔"

"ہاں ہاں۔ ایک دفعہ پہلے بھی ریحان نے یوں ہی اسے بنایا تھا۔"

"لیکن ہے بری بات۔ جب تو خیر وہ چھوٹی تھی۔ اب تو یہ فعل کچھ زیب نہیں دیتا۔"

"اسی لئے تو میں نے بیچاری کہا۔

"مجھی بات ہے"

"واقعی۔!"

اسد سگریٹ ہونٹوں پر دبائے یہ تبصرہ سن رہے تھے۔ انکے ہونٹوں میں سگریٹ سے کہیں زیادہ مسکراہٹ دبی تھی۔

"اب یہیں کھڑے رہنا ہے۔؟"

"چلئے۔!"

"ایک موٹر باہر نکالیئے"

"لانا پڑے گی"

"مجھے تو بار بار صاعقہ کا خیال آرہا ہے۔ بیچاری" کیمرا نے پھر ہمدردی جتائی شاید دل میں اٹھنے والے کسی مبہم خدشے کا ردِ عمل تھا۔ سب کیمرا کے ہمخیال نظر آرہا ہے تھے۔ جذبۂ ترحم سوچ میں آیا ہوا تھا۔ بار بار صاعقہ ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ چھوٹی گاڑی بھی لائی گئی۔ سب نے اپنی اپنی جگہ سنبھالی اور اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے سینما کی طرف چل دیئے۔

موٹر سینما جانے والی کشادہ سڑک کو چھوڑ کر اس تنگ سڑک کی طرف گھوم گئی جو نصیر آباد کی پہاڑیوں کے دامن سے ہوتی ہوئی اونچائیوں کی طرف دھیرے دھیرے اٹھتی جارہی تھی۔ صاعقہ کے حواس پر اب تک گھبراہٹ اور خوف کی کپکپی طاری تھی۔ ریحان کی جسارت ڈھکے چھپے رازوں کو مشتہر کر دینے کو

کافی تھی۔ اور اس بات سے جن کے نتائج کے ظہور پذیر ہونے کی توقع تھی صاعقہ ان کے خیال ہی سے سہم گئی تھی۔ ریحان اسکی قلبی کیفیت سے آگاہ تھے۔ دو تین بار بلانے پر بھی وہ نہ بولی۔ تو ریحان سرشار اور مخمور نگاہوں سے اسے مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگے۔ صاعقہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پہاڑیوں کے اٹھتے ہوئے سلسلے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ ریحان نے دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ زیر لب مسکراتے ہوئے لاتعلقی سے اسٹیرنگ تھامے بیٹھے رہے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔؟" وہ سراسیمہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"ہوش میں آگئیں۔" ریحان نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہا۔

"آپ نے بہت برا کیا۔" وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

"کیا۔؟"

"سب کے سامنے۔"

"تمہیں بھگا لایا۔"

صاعقہ انھیں گھور کر رہ گئی۔

"ڈر رہی ہو۔" قدرے توقف کے بعد۔ ریحان نے پھر چھیڑا۔ صاعقہ پلکیں جھپکا کر انھیں دیکھ کر رہ گئیں۔

"بزدل۔" ریحان مخمور سے نظر آ رہے تھے۔

"وہ سب کیا کہیں گے۔؟"

"میں بتاؤں۔" صاعقہ انھیں شاکی نظروں سے گھور رہی تھی۔

"بتاؤ کیا کہیں گے سب۔" ریحان چھیڑنے کی موڈ میں تھے۔

"جو بھی۔" صاعقہ کی خفگی میں بھی لگاوٹ تھی۔

"بتا دوں۔؟"

"نہیں۔!"

"کیوں۔؟"

"میں جانتی ہوں کیا کہیں گے سب۔" اور پھر وہ مغموم سی ہو گئی۔ افسردہ آواز میں بولی۔ "اک قیامت کھڑی ہو جائے گی۔"

"ہونہہ" ریحان کی گرفت اسٹیئرنگ پہ مضبوط ہو گئی۔ سنجیدہ اور کھوکھلی آواز میں بولے۔ "اس قیامت سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔"

صاعقہ اس آواز کے کھوکھلے اور سنگین استحکام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

سنجیدہ راستے پر آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔

کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد صاعقہ نے گوشۂ چشم سے ریحان کی طرف دیکھا وہ ابتک خاصے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"آپ کس طرف جا رہے ہیں۔؟"

"کیوں۔؟"

"سینما نہیں جا رہے۔؟"

"بڑا شوق ہے فلم دیکھنے کا۔!"

"نہیں تو۔!"

"پھر چپ بیٹھی رہو۔"

"کچھ پتہ بھی تو چلے۔!"

"مجھ پہ اعتماد کرو۔!"

"یہ میری بات کا جواب نہیں۔"

"تمہاری اوٹ پٹانگ باتوں کا کیا جواب دوں۔"

صاعقہ مسکرا کر انہیں دیکھنے لگی۔

اک پیدہ موٹر سے کچھ فاصلے پر کھلی جگہ میں ریحان نے گاڑی روک دی۔ سیاہ چشمہ آنکھوں پر تھا۔ کیمرہ کندھے پر ڈالا۔ اور دوسری طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے "آؤ۔!"

صاعقہ اس معمول کی طرح جو عامل کے اشارہ ابرو پر ناچ اٹھتا ہے گاڑی سے نکل آئی۔ موسم انتہائی رنگین تھا۔ اونچے لانبے درختوں میں الجھی ہوئی پچھلے پہر کی دھوپ ہواؤں کی رندانہ چھیڑ سے کانپ رہی تھی۔ پہاڑیوں کے اٹھتے ہوئے طویل سلسلے بڑے جاذب نظر تھے۔ سبز مخملین گھاس پر خودرو پھولوں کے گچھے بڑی بہار دکھا رہے تھے۔ دور پہاڑی ندی الہڑ لغمے گنگناتی مستی کے عالم میں اچھلتی کودتی جا رہی تھی۔ ایک اونچے پتھر پر ریحان صاعقہ کے قریب کھڑے دلفریب مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"آؤ۔" کچھ دیر بعد ریحان پتھر سے نیچے اترے۔

"کہاں۔؟"

"نیچے گھاٹی میں۔!"

"وہاں — وہاں کیا کریں گے۔؟"

"ان مدہوش فضاؤں میں کھو جائیں گے۔"

صاعقہ کے لب مسکرائے جیسے نازک سی پنکھڑیاں ہوا کے ہلکوروں سے کانپ گئی ہوں۔

"واپس چلئے۔!"

"کیوں۔؟"

"سب سینما میں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کرنے دو۔!"

"لیکن ــــ"

"صاعقہ ــــ خواہ مخواہ اس فضول ذکر سے بور نہ کرو۔"

"فضول ذکر ــــ!"

"تو اور کیا۔ دیکھو کتنا مدہوش کن سماں ہے۔ بھول جاؤ سب کچھ بھول جاؤ۔ ان لمحوں کو کسی ڈر یا خوف سے مغلوب نہ ہونے دو۔"

ریحان نے صاعقہ کا ہاتھ تھام لیا۔ اور محتاط قدموں سے گھاٹی میں اترنے لگے۔ نفیس سفید ریشمی لباس میں صاعقہ کتنی حسین دکھائی دے رہی تھی چہرے پر خوشی کے تاثرات بھی تھے اور تفکر کے سائے بھی۔ یہ حسین سا امتزاج اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔

کافی دیر دونوں اس گھاٹی میں گھومتے رہے۔ ریحان نے صاعقہ کی کئی تصویریں لیں۔ درختوں کے گھنیرے سایوں تلے۔ ندی کے کنارے پتھروں پر بیٹھے ہوئے، خودرو پھولوں کے قدرتی تختوں کے درمیان، حسن کے کئی انداز کیمرے کی آنکھ میں مقید ہو گئے۔ دھوپ کے سائے دراز ہونے لگے ہواؤں میں کچھ تیزی آ گئی۔ صاعقہ دل ہی میں کچھ سہمی جا رہی تھی۔ کئی بار واپس چلنے کی استدعا کی تھی۔ لیکن ریحان الجھ پڑے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اسکے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن ریحان تو جیسے وقت، ماحول اور اپنے آپ کو بھول جانے کیلئے آئے تھے۔ وہ سبز گھاس پر ایک پتھر کا تکیہ بنائے نیم دراز تھے۔ سگریٹ کے کش اطمینان سے لیتے ہوئے وہ پاس بیٹھی خوفزدہ سی صاعقہ کو دیکھ رہے تھے۔

"ابھی تک ڈر رہی ہو ــــ؟" انھوں نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔

"اب تو چلیئے ــــ!"

"کیوں ۔؟"

"یہیں رات گزارنا ہے ۔؟"

"عمر گذر جائے تو پروا نہیں ۔!"

"یہ شاعری چھوڑیئے حقیقت کی دنیا میں آیئے۔ سب سنما سے واپس ہونے والے ہوں گے۔ وہ کیا کہیں گے ریحان۔"

"کہیں گے صاعقہ اور ریحان اک اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔" وہ لاپروائی سے بولے۔ لیکن اس بات کے پس پردہ طوفان کا احساس صاعقہ کے رگ و پے میں کپکپی پیدا کر گیا۔

"کیوں صاعقی۔ ٹھیک ہے نا یہی کہیں گے نا سب ۔!"

صاعقہ نے بیچارگی سے ریحان کی طرف دیکھا۔ وہ۔ اچانک کچھ زیادہ ہی مغموم تھی۔ ریحان شگفتہ استفسار کا جواب وہ معمولی سی مسکراہٹ سے بھی نہ دے سکی۔

"صاعقی ۔!"

"جی ۔!"

"کیا بات ہے ۔؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔!"

"ڈر رہی ہو نا ۔!"

"ہاں"

"پگلی ۔"

"ریحان ۔"

"ہوں"

"آپ نے اچھا نہیں کیا۔!"

"کیوں۔؟"

"سب کیا کہیں گے۔!"

"صاعقی اگر میں یہ کہدوں کہ یہ قدم میں نے اٹھایا ہی اس لئے ہے کہ سب کچھ کہیں۔ تو"

صاعقہ حیران سی انھیں دیکھنے لگی۔ ریحان اس کے برابر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دے "صاعقی اب میری برداشت جواب دے گئی تھی۔ کب تک ہم مجرموں طرح ایک دوسرے سے ملتے رہتے پیار کرنا کوئی جرم تو نہیں۔ میں دانستہ آج میں سب کے سامنے یہاں لے آیا ہوں سب جان جائیں۔ کسی کو کوئی غلط فہمی رہے۔"

"سب کا جان جانا ــــ جانتے بھی ہیں کتنا ــــ" اسکے ہونٹ کپکپا گئے آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ سر جھکا کر وہ گھاس کے تنکے مسلنے لگی۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں صاعقی۔ لیکن اپنے عزم میں بھی پوری آن ہے سب سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ تم ذرہ بھر تردد نہ کرو صاعقی کسی بات سے بے خبر نہیں جسے سر نہ کیا جا سکے۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ریحان" وہ گلوگیر آواز میں بولی۔

"میرے ہوتے ہوئے بھی۔!"

ریحان نے اس کی ٹھوڑی کو چھو کر اس کا چہرہ اپنی طرف کر لیا۔ صاعقہ نے ریحان کی نظروں سے نظریں ملائیں۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ ریحان اس کے لئے ایک سہارا ہیں۔ جو خاندان تو ایک طرف زمانہ بھی ٹکرا جائے تو لرزیدہ نہ ہو

"میرے ہوتے ہوئے ڈرتی ہو صاعقہ ــــ" ریحان نے پھر پوچھ لیا

"نہیں۔" صاعقہ نے سحر زدہ کی آواز میں کہا۔ ریحان کو جیسے اس نے جہان بھر کی خوشیاں دے دیں۔ خوشی سے سرشار ہو کر جھوم گئے۔

"کسی کی پروا نہ کرو۔ کسی کے بارے میں نہ سوچو۔ بھول جاؤ سب تلخیاں بھول جاؤ۔ ان لمحوں کو ڈر یا خوف سے ملوث نہ کرو۔ ہنسو۔ مسکراؤ۔ گاؤ۔ ایک دوسرے کی قربت میں گزارا ہوا ایک ایک لمحہ حاصل زندگانی ہے صاعقی۔!"

میں تو صرف یہی جانتا ہوں۔ بھول جاؤ۔ سب کچھ بھول جاؤ۔" اور صاعقہ جیسے سب کچھ ہی بھول گئی۔ ریحان سنگیت میں مسکرانی رہی۔ ہنستی رہی اور زندگی کی شادمانیوں سے اپنی جھولی بھرتی رہی۔ ریحان نے گانے کی فرمائش کی۔ اور اس کی جاں گداز آواز سے فضائیں مرتعش ہو گئیں۔ وہ دلفریب انداز میں ریحان کے قریب بیٹھی حسین نغمے سناتی رہی۔

شام ہو رہی تھی۔ جب ان متوالوں کو وقت کا احساس ہوا۔ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے بلندی کی طرف چڑھنے لگے۔ بڑے بڑے پتھروں کو پھلانگتے ہوئے ریحان ایک نشیبی جگہ پر آ کر رک گئے۔

"تمہیں ایک یادگار دکھاؤں۔" ریحان نے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔ یہ ابا مرحوم کی یادگار ہے۔" وہ عقیدت سے سر جھکا کر بولی۔

"تم پہلے کبھی یہاں آئی ہو۔؟"

"اکثر۔!"

"اکیلی۔؟"

نہیں۔ آپا کے ساتھ۔ اس نے بتایا تھا۔ یہاں ابا مرحوم نے

گر کر جان دی تھی۔

"وادی حضور نے یہاں پتھر چنوا دیئے تھے تاکہ یادگار رہے۔"

دونوں چند لمحے خاموشی سے ان بے جان پتھروں کو عقیدت سے دیکھتے رہے جن سے اک شہید وفا کی داستان وابستہ تھی۔

سیما میں ریحان کا بھی انتظار کر رہے تھے۔ لیکن کیمرا کے انتظار کی نوعیت جدا تھی۔ گھبراہٹ، خوف اور پریشانی کے ملے جلے جذبات سے وہ انتظار کر رہی تھی۔ ریحان صاعقہ کو ساتھ لے گئے تھے۔ کیمرا نے انکی یہ حرکت انکی شرارت سے تعبیر کی تھی۔ لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اسکی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ فلم شروع ہو گئی۔ لیکن کسی نے دلچسپی سے فلم نہ دیکھی بلکہ گوشیا ہوتی رہیں۔ نعیم، نوید دی۔ فرخ، شاہدہ وغیرہ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ سدا اطمینان سے سگریٹ پیتے ہوئے انھیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وقفہ ہوا۔ سب لڑکے اٹھ کر باہر نکل گئے۔ سگریٹ کی طلب سے کہیں زیادہ انھیں ریحان کے متعلق کرید تھی۔

"ابھی تک دونوں لاپتہ ہیں۔!"

"کہاں گئے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"قصہ کیا ہے۔؟"

"اگر ریحان مذاق کے موڈ میں ہیں تو سراسر زیادتی ہے۔"

سگریٹ پھونکتے ہوئے سب قیاس آرائیاں کر رہے تھے، اسد بڑی لاتعلقی سے سگریٹ کے کش لے رہے تھے۔

"کیا قصہ ہے صاحب؟" فرید نے اسد سے پوچھا۔

"میں کیا جانوں۔" اسد راکھ جھاڑتے ہوئے بولے۔

"کچھ تو جانتے ہو۔"

اسد نے سن کر نفی میں سر ہلا دیا۔ لیکن ہنسی اتنی معنی خیز تھی کہ سب الرٹ گرد ہو گئے۔

"کیا بات ہے، کچھ تو بتاؤ۔"

"میں کیا بتاؤں؟"

"جو جانتے ہو۔"

"صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کا سینما کا پروگرام نہیں تھا۔"

"میں؟؟؟" شش و پنج کی نگاہیں اسد کی طرف اٹھ گئیں۔

"حیرانگی کی کیا بات ہے؟" اسد نے سب کو چپ دیکھ کر پوچھا۔

"کیا پروگرام تھا ان کا۔؟"

"کہیں سیر و تفریح کا۔"

"صاعقہ کے ساتھ؟؟" فرخ نے طنزیہ ہنس کر کہا۔

"ہنسنے کی کیا بات ہے فرخ۔"

"عجیب کی بات ہے۔"

"عجیب کیوں۔؟"

"ریحان اور صاعقہ ــــ صاعقہ ــــ اور ــــ ریحان۔"

"کبھی کبھی انہونی بھی ہو جاتی ہے۔"

"یہ بات ہے"؟

"کیا واقعی۔؟"

چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"چلو تمھیں اس سے کیا۔ معاملہ ریحان اور صاعقہ کا ہے۔" اسد ہنسا کر بولے، لیکن سب حیران سے کھڑے تھے۔ فرخ تو اب بھی یقین کرنے کو تیار نہ تھے، فرید البتہ خوش ہوئے تھے، انکشاف حیران کن تھا، لیکن دلچسپی کا پہلو لئے ہوئے ضرور تھا۔ بات چیت کا موضوع بدل گیا۔

"محبت غیر اختیاری جذبہ ہے۔" ریحان کی مثال سامنے رکھ کر اچھی خاصی بحث ہونے لگی۔

"کہیں یہ کسی مذاق کی تمہید تو نہیں" فرخ ہنس کر بولے۔

"نہیں" اسد بولے۔

"ریحان سنجیدہ ہیں" نعیم نے پوچھا۔

"پورے خلوص کے ساتھ" اسد نے جواب دیا۔

"واقعی۔؟"

"ہاں"

"چند دنوں سے مجھے کچھ شبہ ضرور ہو رہا تھا" شاید کچھ سوچ کر بولے۔

"ریحان کا بدلا ہوا رویہ میں نے بھی محسوس کیا"

"اس دن دیکھا نہیں۔ صاعقہ جب تک چمن میں آئی نہیں جناب نے کھیل نہیں شروع کیا۔

اور اس دن جب بڑی ممانی نے اسے منحوس کہا، تو کس طرح انکے پیچھے پڑ گئے تھے۔

"یہ جو اکثر غائب رہتے تھے میں بھی کریدیں تھا۔"

"کچھ کھٹک مجھے ضرور ہو رہی تھی، لیکن اتنا سوچ بھی نہ سکتا تھا۔"

"اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے اور کیوں کر ہو گیا۔؟"

"اچانک۔ بالکل اچانک۔ آناً فاناً۔" اسد ہنس کر بولے۔

"مجھے دلی خوشی ہوئی" فرید بولے "واقعی۔ اب تو صاعقہ کی مظلومیت سے دل کٹ جاتا تھا۔"

"میرا تو دل سہم گیا ہے۔ خوشی کیسی۔" فرخ بولے۔

"کیوں۔؟"

"خدا ہی خیر کرے۔ ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔"

"یہ تو ہو گا ہی۔!"

"ثانی حضور اپنی آن کی خاطر اور وقار کیلئے بھلا دبھی بن سکتی ہیں۔ انھوں نے تو کچھ اور سوچ رکھا ہے۔"

"ہوں۔"

سب کچھ کچھ متفکر سے نظر آنے لگے۔ شاید سلسلہ گفتگو طوالت کھینچتا لیکن دروازے کی گھنٹی بج چکی تھی۔ سب کیبن کی طرف مڑے۔

"میرا تو جی نہیں چاہ رہا۔ واپس گھر چلیں۔" نعیم نے کہا۔

"نہیں۔" فرید نے جواب دیا۔

"وہ نہیں آئیں گے۔" شاہد بولے۔

"کیوں۔؟" سمیرا نے جلدی سے پوچھا۔

"ان کا پروگرام کچھ اور تھا۔" شاہد ہنس کر بولے۔ اسد نے آنکھ کے اشارہ سے روکا۔ لیکن وہ اشارہ مجھے نہ ملا۔

کیسا پروگرام؟" سمیرا بیتابی سے بولی۔

شاہد شاید وضاحت کر دیتے لیکن اسد نے بڑھ کر انکی مگر میں ٹھوکا دیا، بتیاں بجھ گئیں، اندھیرے میں اسد نے شاہد کے کان مڑوڑتے ہوئے وضاحت کرنے کی کوشش روک دی۔ باقی سارا وقت کسی کا بھی دل فلم دیکھنے میں نہیں لگا۔ کھسر پھسر ہوتی رہی سمیرا نے بہت کان دھرے لیکن پلے کچھ نہ پڑا۔ اسکی الجھن بے قراری بن گئی۔ بار بار دل کو سمجھایا خود ہی دل کو تسلیاں دیں صاعقہ اور ریحان کو ازل و ابد کے سر سے مان کر سوچا، دو مخالف راستے خیال کیا لیکن ہر قسم پر دل بیٹھا ہی گیا۔ شاہد کی بات سے تو دو سو سے کچھ تشویشناک ہو گئے تھے۔ واپسی پر بھی باتیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ خاموش تھی۔ گھر پہونچنے تک طبیعت اچھی خاصی خراب ہو چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھی ریحان کی رہائش گاہ کی طرف گئی۔ ملازم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک نہیں آئے۔ وہ صاعقہ کے کمرے کی طرف گئی۔ آیا سے پوچھا۔ لیکن صاعقہ بھی ابھی تک نہ آئی تھی اس کی بے قراری بڑھتی گئی۔ معاملہ سوچ کی حدود سے باہر تھا لیکن دل اس واقعے کی سنجیدگی کی گواہی دے رہا تھا۔

ریحان، صاعقہ، بار بار دونوں نام اسکے ذہن میں تلاطم بپا کر رہے تھے۔ ریحان کو وہ اپنا بہت کچھ مان چکی تھی۔ گو کبھی انکی طرف سے اظہار محبت کی طرف قدم نہیں اٹھایا گیا تھا۔ تاہم وہ انکی دلچسپی سے بے بہرہ نہ تھی۔ اور پھر گھر والوں کے خیال سے بھی تو آگاہ تھی۔ دادی نے جو کچھ سوچا تھا، اسکی بھنک بھی تو کانوں میں پڑ چکی تھی۔ شام کے دھندلکے گہرے ہو چکے تھے وہ بیتابی کے عالم میں بیرونی برآمدے میں ٹہل رہی تھی وہ ان دونوں کی واپسی

کا انتظار کر رہی تھی۔ کافی دیر ٹہلنے کے بعد اس نے تھک کر ستون کا سہارا لیا اسکی نظریں الحمراء کے گیٹ پر لگی تھیں خاصہ اندھیرا پھیل چکا تھا جب ریکی کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی گھبراہٹ سے سمیرا کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا جلد سے وہ برآمدے کے ستونوں کے ساتھ لپٹی ہوئی بیلوں کی اوٹ میں ہو گئی۔ ریحان گاڑی پورچ کی طرف لائے۔ تیز روشنی میں ریحان کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر سمیرا کا دل ہی تو ٹوٹ گیا۔ اور جب انھوں نے ہاتھ کے سہارے سے صاعقہ کو گاڑی سے باہر آنے میں مدد دی تو اس کا دل تو چلتے چلتے جیسے تھم ہی گیا۔ ریحان نے جھک کر اس کے کان میں جانے کیا کہا۔ وہ کترا کر ایک طرف کو ہٹی اور پھر شرما کر بھاگی۔ سامنے والے دروازہ میں داخل ہوتے وقت ایک بار بڑی ادا سے مڑ کر ریحان کو دیکھا، اور پھر اندر غائب ہو گئی۔ سمیرا کی جیسے کسی نے ساری قوت سلب کر لی، وہ بیلوں کی آڑ میں کسی بے جان بت کی طرح کھڑی تھی ریحان گاڑی واپس لے گئے۔

سمیرا نے رات جیسے انگاروں پر لوٹتے ہوئے کاٹی صاعقہ اور ریحان کی انوکھی محبت کا انکشاف ہی دل جلا دینے کو کیا کم تھا۔ اس پر صاعقہ کا انداز سے قیامت تھا، رات کھانے کے کمرے میں جاتے وقت برآمدے میں اسکا صاعقہ سے سامنا ہو گیا تھا، زہر بھرے طنز سے اس نے پوچھا تھا "کونسی فلم دیکھی آج؟" لیکن جواباً صاعقہ نے اسے دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا تھا کس شان استغنا سے وہ اسے نظر انداز کرتی کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔

سمیرا کے زخموں پر یہ نمک پاشی۔ رات اس نے تلملاتے ہوئے گزاری وہ اس شعلے کی طرح بھڑک اٹھی جس کی ہر لپک میں کسی کا خرمن جلا دینے کی بیقراری سے کروٹیں بدلنے کے لئے وہ معمول سے کچھ پہلے ہی بستر سے اٹھ بیٹھی۔ دل گھبرا رہا تھا۔ روح میں جلن محسوس ہو رہی تھی۔ ریحان سے زیادہ اسے صاعقہ پر غصہ آ رہا تھا، اس ذلیل اور منحوس لڑکی کی جسارت پر وہ زہریلی ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔

اس نے اپنا گاؤن پہنا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا نے اس کے تپتے ذہن کو سکون دیا، لیکن، اس کی سوچ سے وہی آگ کی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ ستون سے ٹیک لگا کر وہ کافی دیر کھڑی رہی، ہر گزرنے والا لمحہ اسے صاعقہ سے متنفر کر رہا تھا۔ انتقامی آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ یونہی گھومتی، پھرتی رہی۔ بے قرار — بے چین — وہ کافی دور نکل گئی، دریا کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ سورج ابھر رہا تھا، دریا کی سطح پر سنہری کرنوں کا جال سا پھیلا تھا۔ سمیرا اس حسین منظر کو دیکھ کر چند لمحوں کے لئے کھو سی گئی۔

دریا کی رو پہلی لہروں پر ایک گلابی کشتی بڑی روانی سے بہی چلی جا رہی تھی۔ سمیرا کی محویت اس کشتی کو دیکھ کر ٹوٹ گئی۔ سمیرا غور سے کشتی کی طرف دیکھنے لگی۔ اتنی دور سے کشتی کو شناخت کرنا تو ممکن نہ تھا۔ لیکن اسکا دل بے طرح دھڑک کر آگہی دینے لگا کہ یہ صاعقہ اور ریحان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کامیابی کا آنچل ہوا سے لہرا لہرا کر لڑکے کے کندھے سے چھو رہا تھا۔ سمیرا نے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے، جیسے یہ منظر دیکھنے کی تاب نہ رہی ہو۔

کشتی ایک روانی کے ساتھ بہی چلی جا رہی تھی سمیرا نے کچھ دیر بعد

کھول دیں کشتی کو حسرت سے دیکھتے ہوئے اس نے دل کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے، اسد اور گلرخ کیوں نہیں ہو سکتے، انھیں تو کشتی کی سیر کا جنون ہے، طفل تسلیوں سے وہ اپنے دل کو بہلانے لگی۔ کشتی درختوں کے جھنڈ کے پیچھے روپوش ہو گئی۔

وہ کتنی ہی دیر انتظار میں کھڑی رہی کشتی پھر نظر نہ آئی۔ مایوس ہو کر وہ وہاں سے ہٹی، اور آہستہ آہستہ اس جگہ پہونچی جہاں محل کے سائیسوں کی تفریحی کشتیاں بندھی رہتی تھیں۔ بوڑھا نگہبان چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا، سمیرا کو دیکھتے ہی مؤدبانہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کشتی کھول دوں سرکار" اس نے انکسارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" اللہ سمیرا نے سوچ میں کھوئے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ بوڑھا کسی استفسار کا منتظر رہا۔

سمیرا نے دریا کی سمت نظر دوڑائی۔ کشتی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ تجسس اپنی جگہ بدستور اکسا رہا تھا۔ آخر اس نے پوچھ ہی لیا "گلابی کشتی میں کون سیر کے لئے گیا ہے؟"

بوڑھا نگہبان خاموش تھا۔ سمیرا نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ بوڑھے نے لاعلمی کا اظہار کیا، جب ریحان اور صاعقہ گئے تھے، بوڑھا اپنی کوٹھڑی میں تھا۔

"شاید اسد میاں گئے ہوں، اکثر وہی اس کے سیر کیلئے کشتی لے کر جاتے ہیں۔" لیکن جانے انجانے سے کون سی آواز اٹھ رہی تھی، جو بوڑھے کے ان الفاظ کو جھٹلا رہی تھی سمیرا کے چہرے سے بے اطمینانی جھلک رہی تھی وہ محل کی طرف جانے کی بجائے دریا کی سمت مڑ گئی۔ کنارے کے ساتھ درختوں کے گھنے جھنڈ میں وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی، وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کشتی میں کون ہے انتظار

جان لیوا ہی سہی۔ لیکن وہ اس کوفت سے دوچار ہونے کیلئے اپنے زخم خوردہ جذبات تسکین جو چاہتے تھے وہ سامنے دریا کی سطح پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

ایک فقرئی قہقہے نے اسے چونکا دیا اس نے جلدی سے دیکھا۔ گلابی کشتی کنارے کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی تھی، وہ درختوں کی اوٹ میں نہ ہوتی تو شاید ریحان کی نظر اس پر پڑ ہی جاتی، دھڑکتے دل سے اس نے پھر کشتی کی طرف دیکھا وہ پتھر کے ساتھ ساتھ ہو کر گزر رہی تھی، صاعقہ کا چہرہ بشاش تھا جانے اس نے کس بات پر قہقہہ لگایا تھا۔ کشتی گذر گئی۔ سمیرا کا دم سینے میں رکنے لگا، وہ وہیں بیٹھی کشتی دیکھتی رہی کچھ ہی دور کشتی ایک ہموار جگہ پر کنارے سے جا لگی۔ پہلے ریحان اترے۔ اور پھر ہاتھ کا سہارا دے کر انھوں نے صاعقہ کو اتارا، صاعقہ ان کے بازو پر لچکیلی شاخ کی طرح جھول گئی۔

اور سمیرا نے گھبرا کر آنکھیں زور سے بند کر لیں، قوت برداشت کہاں تک ساتھ دیتی، کچھ دیر وہ بے سہارا ناؤ کی طرح ڈولتے جذبات کی کشمکش میں مبتلا رہی، پھر اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں، اور اس طرف دیکھا جس طرف ریحان کے بازو پر صاعقہ لچکیلی شاخ کی طرح جھول گئی تھی۔ ریحان کشتی کا رسہ درخت سے باندھنے کے لئے کھینچ رہے تھے، اور صاعقہ انھیں باندھنے میں مدد دے رہی تھی۔ چند لمحوں بعد دونوں وہاں سے جانے کیلئے مڑے شانہ بشانہ چلتے ہوئے مخمور و شاداں وہاں سے درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ سمیرا انھیں حسرت سے دیکھتی رہی اور اس کے سینے میں ناکامی کی آگ کا دھواں اٹھتا رہا۔ وہ اس شکست خوردہ سپاہی کی طرح نظر آ رہی تھی، جس کے اعصاب پر شکست جھنجھلاہٹ اور افسردگی بن کر چھا جاتی ہے۔ ناشتے کی میز پر جب سمیرا پہونچی تو

ریحان کی عدم موجودگی پر دادی بڑی برہم ہو رہی تھیں۔

"یہ بھی کوئی وقت ہے سونے کا۔ اس عمر میں اتنی سستی کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں، یا تو ناشتے کے وقت آئے گا ہی نہیں۔ یا اتنی دیر سے پہونچے گا کہ سب انتظار دیکھ دیکھ کر تھک چکے ہوں، نیند نہ ہوئی نشہ ہو گیا۔ ہوش ہی نہیں آتا، آج بھی دیکھ لو۔ جناب ابھی تک سو رہے ہوں گے۔

"سو کہاں رہے ہیں دادی حضور" کمیرا دادی کے سامنے ہی تو بیٹھی تھی، موقعہ پاتے ہی زہر اگلنے کو تیار ہو گئی۔

"سو نہیں رہا تو ناشتہ کے لئے آیا کیوں نہیں۔؟"

"کشتی کی سیر کی تھکن اُتار رہے ہوں گے" کمیرا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ دزدیدہ نظروں سے صاعقہ کی طرف دیکھا۔ کانٹا بے اختیار اس کے کانپتے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا، اس نے کمیرا کی بات سنی اور پھر صاعقہ کی طرف دیکھا فق چہرہ، لرزتے ہاتھ، سفید ہونٹ۔ حاضر دماغی سے کام لے کر آنکھوں نے فوراً محسن بانو کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ باتوں میں یوں الجھایا کہ وہ اور کوئی بات کمیرا سے کر ہی نہ سکیں ورنہ۔ کوئی عجب نہ تھا کہ کمیرا اسی وقت کوئی ایسی بات اگل دیتی جو ریحان و صاعقہ کے تعلقات کو مشتہر کرنے کو کافی ہوتی۔ اور دادی کا عتاب بربختی کی بہن کر صاعقہ کی تقدیر پر اسی وقت ثبت ہو جاتا۔

صاعقہ سہمی ہوئی میز پر بیٹھی رہی، کمیرا کی بات اور بات کرنے کے طریقے سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اس نے ریحان کو اور اسے کشتی میں جاتے دیکھ لیا ہے وہ بیچاری تو ریحان کی کل کی جسارت سے سہمی ہوئی تھی، اس پر یہ انکشاف خود اس کے سراپا پر مچا کیوں نہ جاتا۔

کمیرا صاعقہ کی طرف دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی، اسکی دگرگوں حالت

اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھی، مسرور تھی کہ اس نے صاعقہ پر واضح تو کر دیا کہ وہ انھیں کشتی کی سیر کرتے دیکھ چکی ہے، اور یہ دیکھ لینا ہی انکے حق میں قیامت بن سکتا ہے ان کے خوابوں کی اک لمحہ بے تعبیر بنا سکتا ہے۔

یہ سب اٹھتے وقت صاعقہ و سمیرا کی نگاہیں ملیں، سمیرا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی مسکراہٹ جس میں ناکامی کی راکھ بھی تھی، اور انتقام کی آنچ بھی، صاعقہ اس مسکراہٹ سے بے طرح سہم گئی۔

محل کی بالکنی میں فوزیہ کھڑی تھی، وہ باغ کی طرف دیکھ رہی تھی نگاہیں شوق اور دلچسپی کی غماز تھیں۔ کسی کام کی غرض سے ادھر سے گزر ہوا تھا نگاہ اچانک نیچے باغ کی طرف گئی اور وہیں کی ہو کر رہ گئی۔ وہ جالی دار کٹہرے کو پکڑے دلچسپی سے نیچے دیکھنے لگی۔ پچھلے پہر کی دھوپ کے لانبے سائے خوبصورتی سے گھاس پر پڑ رہے تھے، اونچے اونچے درخت۔ پھیلی پھیلی بیلیں۔ اور رنگ برنگے پھولوں سے مہکتی ہوئی روشیں، مرمریں فواروں سے چھوٹتی ہوئی پھوار۔ سہ پہر کے لانبے سایوں والی دھوپ میں دست باغباں سے نکھرا ہوا باغ بڑا دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن۔ فوزیہ کو نہ باغ کی مہکتی فضا نے متوجہ کیا تھا۔ نہ فواروں کی دلکش اور مترنم پھوار نے۔ اس کی توجہ کا مرکز دو درختوں کے عقب میں دوڑتے ہوئے لڑکی اور لڑکا تھے، ریحان کو اس نے دور ہی سے پہچان لیا تھا۔ کچھ دیر پہلے براؤن سوٹ میں وہ اس کے پاس ہی تو بیٹھے تھے۔ اور لڑکی سرمگیں آنچلوں والی لڑکی اس نے سمیرا سمجھ لی تھی۔

جوانی کے معصوم کھیل کو وہ دلچسپی سے دیکھ رہی تھی، لڑکی آگے آگے بھاگ رہی تھی اور لڑکا اسے پکڑنے کو لپک رہا تھا۔

ریحان کے ہاتھ میں آنچل کا سرا گیا، فوزیہ زیر لب مسکرادی وہ کسی انجانے جذبہ کے تحت وہاں سے ہٹنے کو تھی کہ۔

"امی!" پشت سمیرا کی آواز پر وہ چونک گئی، ایک دم پلٹ کر اسکی طرف دیکھا۔

"تم — تم؟" وہ ہکلا سی گئی۔ جلدی سے پھر اس نے نیچے باغ میں دیکھا ریحان نے سارا دوپٹہ اپنے ہاتھ پر لپیٹ لیا تھا، لڑکی درخت سے پشت ٹکا کر کھڑی ہو گئی، اس کا صرف دایاں بازو ہی نظر آرہا تھا۔

"دادی حضور آپ کو بلا رہی ہیں۔" سمیرا نے آہستہ سے کہا۔ فوزیہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ افسردگی کا رنگ لئے ہوئے تھا۔

"تم کہاں تھیں؟" اس نے پلکیں جھپکا کر بیٹی کو دیکھا۔

"دادی حضور کے پاس!"

"میں سمجھی ریحان کے ساتھ باغ میں ہو۔" وہ بڑبڑائی۔ سمیرا نے ایک گہرا سانس لیا۔ فوزیہ کی نظروں سے اس کی بے چینی چھپی نہ رہ سکی۔

"وہ کون ہے؟" فوزیہ نے پوچھا۔

"کہاں؟" افسردہ آواز میں جواباً پوچھا۔

"وہ فوزیہ نے باغ کی طرف اشارہ کیا۔ ریحان کے ساتھ۔؟"

سمیرا نے نیچے دیکھا، درخت کے ساتھ لگی لڑکی کا بازو نظر آرہا تھا۔ ریحان دوپٹہ ہاتھ پر لپیٹے ہوئے آگے کو جھکے تھے، سمیرا کا رنگ متغیر ہو گیا۔

"کون ہے وہ —؟" فوزیہ نے بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا؛

"صاعقہ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔" سمیرا پلٹی، اسکی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

"صاعقہ" فوزیہ اس انکشاف سے گنگ ہو گئی، اس نے اس بات کی وضاحت کے لئے سمیرا سے کچھ پوچھنا چاہا۔"

سمیرا آنچل سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ وہ کسی شکستہ عمارت کی طرح چور چور نظر آ رہی تھی۔ فوزیہ نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر نیچے باغ کی طرف صاعقہ و ریحان ہاتھ میں ہاتھ دیئے ٹہلتے ٹہلتے تختوں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اور فوزیہ مرقع حیرت بنی وہیں کھڑی رہی۔

"بیگم صاحبہ" کنیز کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"ہوں!"

"بڑی بیگم صاحبہ یاد فرما رہی ہیں۔"

"سمیرا کہاں ہے۔؟"

"نیچے اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔"

"خالہ جان سے کہہ دو میں کچھ دیر بعد آؤں گی!"

کنیز چلی گئی۔

فوزیہ کچھ لمحے سوچ میں ڈوبی کھڑی رہی سمیرا کے چہرے کی افسردگی آنکھوں کے آنسوؤں نے اسکی ناکامی کی داستان کہہ سنائی تھی، اپنی ہی نازوں کی پالی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اس کا صبر و قرار لٹتا کیوں کر نہیں وہ سمیرا کے احساسات و جذبات سے آگاہ تھی، ریحان کو وہ دل سے چاہتی تھی، لیکن اب یہ قصہ نیا۔ فوزیہ کچھ سمجھ نہ پائی، وضاحت کے لئے اسے سمیرا سے ہی سب کچھ پوچھنا تھا! تیز قدموں سے وہ سمیرا کے کمرے کی طرف چل دی۔

سمیرا اپنی مسہری پر تکیہ میں منہ دیئے پڑی تھی، کل سے وہ سارا

دادی کے گوش گزار کرنے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ لیکن دادی کے رعب و دبدبے کے سامنے زبان پر یہ قصہ لاتے کترا رہی تھی۔ کیسے کہے۔ کیوں کر کہے؟ یہی سوچ رہی تھی، فوزیہ کمرے میں آئی۔ بیٹی کو یوں نڈھال پڑے دیکھ کر دل بیٹھ ہی تو گیا۔ "بیٹی" پیار سے اس نے سمیرا کا کندھا ہلایا سمیرا ماں کی ہمدردی اور محبت سے پگھل گئی۔ سر اٹھایا نہیں، تکیئے میں منھ دیئے دیئے رونے لگی۔

"کیا بات ہے سمیرا۔ مجھے بھی تو کچھ بتاؤ۔ تمھاری بات کی کچھ سمجھ ہی میں نہ آئی صاعقہ تھی، ریحان کے ساتھ ــــ یہ کیا قصہ ہے۔؟"

وہ پیار سے بیٹی کو بہلاتی پھسلاتی رہی سمیرا سسکتی رہی، یہی طریق تھا جس سے ماں پر وہ اپنی ناکامی ظاہر کر سکتی تھی، ماں کا دل کٹا جا رہا تھا۔

"یہ سب ہوا کیوں کر ــــ ریحان تو اس کے سائے سے بدکتے تھے۔ سب سے زیادہ نفرت انہیں ہی تھی اس سے۔ قصہ کیا ہے؟"

بڑی دیر کے بعد سمیرا آنسو پونچھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ ماں بے قرار تھی سمیرا نے موقع غنیمت جانا۔ دادی سے تو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی ماں سے سب کچھ کہہ دیا۔ ریحان اور صاعقہ کی جتنی ملاقاتیں علم میں تھیں، بڑھا چڑھا کر بیان کیں، فوزیہ بت بنی بیٹھی رہی تھی۔

سمیرا تکیئے پر گر گئی، وہ سسکنے لگی، فوزیہ گنگ سی اسے دیکھنے لگی، اسکا شعور لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب گیا، برسوں پہلے کچھ اسی کیفیت سے وہ بھی دوچار ہوئی تھی طاہر اور نانی کی رنگین ملاقاتوں کا حال جب اسے معلوم ہوا تو وہ بھی یوں ہی سسک سسک کر روئی تھی۔ وہ سمیرا کی طرف دیکھ رہی تھی، اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سمیرا نہیں، وہ خود سسک رہی ہے، ناکامی کی آگ میں جل رہی ہے۔ کیا ہو رہا ہے آپ کو وہ سمجھ نہ پائی۔ اسکے ذہن میں یہ سوال اٹھا۔ بے چین ہو کر وہ اپنی

بیٹی پر جھک گئی، اسے پیار کیا، تسلیاں دیں۔ وہ بیٹی کو بہلا پھسلا رہی تھی اور اس کا ذہن زہریلی گیسوں کا سا اثر قبول کر رہا تھا، سسکتا ہوا ماضی نظروں کے سامنے آ رہا تھا۔ ناجی ذہن میں تھرک رہی تھی، ناجی جس نے محبت کے مقابلہ میں اسے شکست فاش دی تھی۔ فوزیہ ذہن میں تھرکتی ہوئی ناجی کو دیکھ رہی تھی اسے یوں محسوس ہوا جیسے ناجی مسکرا رہی ہو۔ اسکی ابدی۔ ناکامی پر مسکرا رہی ہو۔ اس کی شکست پر ہنس رہی ہو۔ فوزیہ نے گھبرا کر سمیرا کی طرف دیکھا، وہ اب بھی سسک رہی تھی، فوزیہ کا کلیجہ شق ہو گیا۔

ناجی، ناجی نے اسے شکست دی اور اب ناجی کی بیٹی اسکی بیٹی کو شکست دے رہی ہے۔

نہیں۔ نہیں — وہ ایسا کبھی نہ ہونے دے گی، وہ اپنی مرحوم محبت کا بھی ناجی کی بیٹی سے انتقام لے گی، وہ سمیرا کی جھولی آنسوؤں سے بھر دے گی وہ صاعقہ کی بہاروں کو ویران کر دے گی، فوزیہ رات بھر نہ سو سکی۔ اسکا ماضی وقت کی دھول تلے دبا پڑا تھا، لیکن آج سمیرا کے ان آنسوؤں سے دھول ایک لمحہ میں دھل گئی۔ ماضی کے خدوخال واضح ہو گئے، فوزیہ کے لئے ہر چبھن تازہ ہو گی۔ ماضی حال کی صورت میں پھر پلٹ آیا تھا۔

ناجی کی بیٹی اس کی بچی کو سرنگوں کرے، اس احساس سے ہی اس کا جوش رقابت خوفناک حد تک چھونے لگا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے ماحول میں ناجی کے تمسخرانہ قہقہوں کی گونج ہے وہ پاگل سی ہو اٹھی۔ رات بھر وہ زہریلی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی۔ اسکے سینے میں آگ سلگتی رہی، برسوں پہلے کی خوں چکاں داستانیں سر اٹھانے لگیں، سمیرا کے دل کا درد اسے اپنے درد کی طرح دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنی ناکامی سہہ گذری تھی، لیکن اپنی بچی کی حسرتوں

کے جنازے دیکھنے کی اس میں ہمت کہاں تھی، اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ صاعقہ کے خوابوں کو چکنا چور کر دے گی۔ اس عمل کے لئے اسے خون کی ہولی بھی کھیلنا پڑی تو وہ دریغ نہ کرے گی انتقام کی اینٹ سے اینٹ بجانا پڑی تو وہ چوکے گی نہیں۔

فوزیہ کمرے سے نکل رہی تھی۔ اور صاعقہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ دونوں کی ٹکر ہوتے ہوتے بچی، فوزیہ کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے وہ گر گئے صاعقہ جلدی سے اٹھانے کو جھکی۔

"آنکھوں میں چربی آ گئی ہے، کچھ دکھائی نہیں دیتا، ہوش میں رہا کرو، دماغ ٹھکانے پر لے آؤں گی۔ بہت کچھ سمجھنے لگی ہو اپنے آپ کو۔"

شکر کے کسی کلمے کی بجائے صاعقہ کے ہاتھ سے کپڑے لیتے ہوئے فوزیہ برس پڑی۔ "مجھے کیا پتہ تھا۔ چچی جان۔ آپ اندر ہی سے آ رہی ہیں۔" سکلاتے ہوئے صاعقہ صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

"ہاں۔ ہاں! تمھیں تو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا سب کچھ اپنے آپ ہو جاتا ہے۔ (بڑبڑاتے ہوئے) بنتی ہو، تمھارے سب کرتوت میں جانتی ہوں خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے فوزیہ بولی۔ "سنبھل کر رہو ورنہ ــــ"

فوزیہ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اور صاعقہ وہیں بت کی طرح کھڑی رہ گئی فوزیہ نے کبھی اس سے اچھا سلوک نہیں کیا، اپنے ہوش میں اس نے کبھی اس سے محبت نہیں پایا تھا۔ لیکن ــــ آج ــــ آج ــــ تو اس کے تیور

ہی اور تھے ۔ آنکھوں میں آگ تھی اور یہ آگ وہ الفاظ کی صورت میں اس پر برسا بھی گئی تھی۔

رات بھی اس نے یہ آگ فوزیہ کی آنکھوں میں دیکھی تھی، کھانے کی میز پر وہ بار بار اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی، صاعقہ کا دل سہم گیا تھا ساری رات وہ ان نظروں سے کھاتے ہوئے خوف سوچ رہی تھی کہ فوزیہ کی ان نظروں کا مطلب کیا ہے۔

سمجھ تو وہ رات ہی گئی تھی، لیکن اب اس ٹکراؤ کے معمولی سے واقعے نے بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ صاعقہ کے لئے اس واقعہ سے یہ اخذ کرنا مشکل نہ رہا تھا کہ فوزیہ اس کی محبت کے راز سے واقف ہو چکی تھی۔

فوزیہ جیسی کینہ پرور عورت کے ہاتھ میں اتنا بڑا راز آجانے سے جو قیامت جنم لے سکتی ہے۔ صاعقہ اس کے خیال سے ہی اپنی جان ہوا ہوتے محسوس کرنے لگی، سمیر اور ریحان کی نسبت ٹھکرائی جانے والی تھی یہ اڑتی اڑتی خبر اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، لیکن ریحان کی محبت کا سیلاب ہر بات کو بہا لے گیا تھا۔ وہ حقائق کی دنیا سے دور ہو گئی تھی، اپنے آپ کو بھول گئی تھی، اپنی نحوست کو بھول گئی تھی۔

صاعقہ کا دماغ گھوم رہا تھا، اور بے ہنگم کی سوچیں اسے نڈھال کیے جا رہی تھیں، ریحان پر اعتماد بھی۔ ان کی محبت میں استحکام بھی پھر بھی وہ سوچتی تھی کہ دادی کا آہنی اور اٹل فیصلہ اپنی جگہ رہے گا اور فوزیہ اپنی بیٹی کے لئے اس پر مظالم ڈھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گی۔

اپنی محبت کے حسرتناک انجام سوچ کر وہ تڑپ گئی، افسردگی اور مایوسی کی دبیز چادر نے اسکی ساری ہستی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اپنی تقدیر کی

ہونا کیوں کا تصور ذہن میں لہرا تا رہا۔ اور وہ ریحان کے حسین وعدوں اور آیا کی خوشگوار تسلیوں کے باوجود کسی اچھے انجام کی متوقع نہ رہی ہر طلوع ہونے والا دن اس کی مایوسیوں میں اضافہ کا باعث بنتا گیا۔ "ڈر و خوف نے اسکی ہستی کا سارا رس نچوڑ لیا۔ اسکی حالت اس انسان کی سی تھی، جو توپ کے دہانے پر کھڑا ہو۔ اور کسی بھی لمحے توپ سے نکلنے والا گولہ اسکی ہستی کو ریزہ ریزہ کر سکتا ہو۔ فوزیہ کی نگاہیں دن بدن خوفناک ہوتی جارہی تھیں معمولی معمولی باتوں پر بڑے بڑے طنزیہ جملے کہنا اس کا معمول بن گیا تھا۔

اس دن آیا کی طبیعت کچھ خراب تھی، صاعقہ صبح ہی سے اسکے پاس بیٹھی تھی، دس بجے کے قریب تکلیف بڑھ گئی ڈاکٹر کو فون کرنے کیلئے جلدی سے گئی۔ راستہ مختصر کرنے کیلئے وہ دریا نی کمروں میں سے ہوتی ہوئی ٹیلیفون کرنے جارہی تھی، بائیں کمرے میں فوزیہ اور سعدیہ بیٹھی تھیں۔

صاعقہ دونوں کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی۔ جلدی سے کمرے سے نکل جانا چاہا

"بڑی جلدی میں ہو؟" سعدیہ نے یونہی کہہ دیا۔

"ملاقات کا وقت نکلا جارہا ہوگا" فوزیہ نے طنز کیا۔

اور صاعقہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اسکے قدموں تلے سے زمین سرک گئی ہو۔

"کیسی ملاقات" سعدیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اسی سے پوچھ لو" فوزیہ نے تیر چھوڑا۔

"کیا معاملہ ہے؟" اب سعدیہ سنجیدہ تھی۔

صاعقہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں سے پسینہ چھوٹ گیا، سارا کمرہ گھومتا ہوا محسوس ہوا، جانے کے لئے وہ کرسی سے ہٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ نکلتے ہوئے اس نے فوزیہ کے زہر آلود جملے سن ضرور لئے، کم ظرف سے اچھائی کی توقع

فضول ہوتی ہے، کس ماں کی بیٹی ہے۔ ماں نے عشق لڑایا تھا بیٹی کیوں بچھے رہتی۔ وہ اور کچھ نہ سن سکی، لیکن جو سن لیا تھا، وہی اتنا تھا کہ اس کا وجود اسے سہارنے کا متحمل نہ تھا۔ برآمدے میں رکھی ہوئی کرسی پر وہ گر سی گئی۔ ہارا اصول گھوم رہا تھا تو پہ کے دہانے سے آگ برسنے کا وقت اب آگیا تھا، صاعقہ کے حواس جواب دیئے جا رہے تھے۔

جانے کتنی دیر وہ وہیں پڑی رہی، خادمہ اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آپہونچی، آیا نے اسے بلا بھیجا تھا۔

بمشکل حواس مجتمع کر کے وہ اٹھی، ڈاکٹر کو فون کیا۔ اور آیا کے کمرے کی طرف چل دی۔ اس دن وہ بڑی دیر تک آیا کے سینے پر سر رکھے روتی رہی بیمار آیا اس کی اس حرکت کو اپنے ساتھ بے پناہ محبت سے تعبیر کر رہی تھی، لیکن اس کی تسلیوں و تشفیوں سے صبر کے ٹوٹے بندھن جوڑے نہ جا سکے۔

اسی شام سعدیہ کی کنیز خاص اس کے کمرے میں آئی۔

"سرکار آپ کو بلا رہی ہیں۔"

کنیز کا یہ جملہ کسی بم کی طرح اس کے حواس پر گرا بے حس و حرکت وہ کنیز کا منہ دیکھے گئی۔ کنیز نے دوبارہ اور سہ بارہ اپنے جملے کی وضاحت کی۔ اور جب وہ سعدیہ کے کمرے میں لرزتے دل اور کانپتے وجود کو لئے داخل ہوئی، سعدیہ چند لمحے اسے ساکت نظروں سے دیکھتی رہی۔

صاعقہ نے اسے دیکھا، اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی بیقرار شعلہ سعدیہ کے قلب میں مقید ہو۔

"میں تمہارے اور ریحان کے تعلقات کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں تم سے کچھ پوچھنے کی گنجائش ہے نہ ضرورت، صرف اتنا کہنے کے لئے تمہیں

بلایا ہے کہ تمھاری ماں اس خاندان کے وقار و عزت کو سرنگوں کر چکی ہے، اب تم
اس روش پر چل نکلی ہو ۔۔۔ لیکن ابھی وقت ہے سنبھل جاؤ ۔ میں نہیں چاہتی
کہ ایک بار پھر وہی طوفان اٹھ کھڑا ہو جس کے اثرات اب تک ہمارے خاندان
پر ہیں ۔ تمھیں معلوم نہیں، تو یہ بھی بتائے دیتی ہوں کہ ریحان و سمیرا کی نسبت
کا فیصلہ ہو چکا ہے، ۔۔۔ میرے بیٹے کے راستے سے ہٹ جاؤ ۔۔۔
ورنہ انجام ۔۔۔ شاید تم اس انجام کا تصور بھی کر سکو ۔ بس جاؤ ۔ صرف اتنا
ہی کہہ دینا کافی ہے کہ تم اپنے آپ کو بھولو نہیں ۔"

صاعقہ اس تذلیل پر کٹ کر رہ گئی، ندامت سے اس کا سر جھکا جا رہا تھا
سارے بدن میں سنسناہٹ ہو رہی تھی بے بسی آنسو بن کر آنکھوں میں امنڈ آئی ۔
لیکن جذبۂ ترحم کسی دل میں تھا ۔ سو یہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر نفرت سے
منہ پھیر کر بولی ۔

"تم ان آنسوؤں سے ہمدردی جتنے کی توقع نہ رکھو ۔ مجھے جو کہنا تھا کہہ چکی یہ
بھی میری شرافت سمجھو کہ جو تمھیں بلا کر معاملے کی نزاکت سمجھا رہی ہوں ۔ میں چاہتی تو
سارا معاملہ تمھاری دادی کے گوش گزار بھی کر سکتی تھی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا
میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو ۔ سمجھیں ۔۔۔ جاؤ ۔۔۔ سوچ سمجھ
سے کام لو چاند چھونے کی کوشش فضول ہوتی ہے ۔

صاعقہ کسی زندہ لاش کی طرح اسکے کمرے سے نکلی اور اپنے کمرے کی طرف چل
دی ۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کرے ایک طرف بلکتی ہوئی
محبت تھی اور دوسری طرف چنگھاڑتا ہوا خاندانی وقار ۔ ریحان سے علیحدگی کا تصور
بھی اس کے لئے مشکل تھا ۔ لیکن انھیں پا لینا بھی ان حالات ناممکن تھا ۔

صاعقہ برآمدے کے در میں کھڑی تھی، رات کا اندھیرا گہرے ہو رہے تھے، ہوائیں بھیگ رہی تھیں، وہ گم صم سی کھڑی سوچوں کے دھارے پر بہہ رہی تھی، آج شاہ سعدیہ کے کہے ہوئے الفاظ اب تک اسکے کانوں میں سیال آگ کی طرح ٹپک رہے تھے۔

وہ واقعی اپنے آپ کو بھول گئی تھی اس خاندان میں اپنی حیثیت کو بھول گئی تھی چکوری بھی تو اپنے بال و پر کی کمزوری کو بھول کر چاند کی طرف اڑنے کی کوشش کرتی ہے، دیوانی! وہ بھی دیوانی تھی چکوری کی طرح۔

جذباتی کشمکش نے اسے نڈھال کر دیا تھا مسلسل رونے سے اسکی آنکھیں سوج گئیں، صبح سے شام تک کتنے لرزہ خیز واقعات کا تصادم ہو چکا تھا۔ تباہی اسکی طرف بڑھ رہی تھی، وہ بے بال و پر پرند کی طرح صرف پھڑپھڑا رہی تھی اس تباہی سے بچاؤ کی کوئی تدبیر اسکے ذہن میں نہ آ رہی تھی۔

"صاعقہ" ریحان کی آواز پر وہ چونکی۔

"کتنا انتظار کروایا تم نے، بارہ دری میں آئیں کیوں نہیں۔؟"

صاعقہ خاموش رہی، اندھیرے میں ریحان اسکے تاثرات نہ دیکھ سکتے

"آؤ۔!" لیکن صاعقہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

"سو رہی کیا؟" ریحان نے اس کا کندھا ہلایا۔

"ریحان" وہ خوفزدہ سی آواز میں بولی۔

"کیوں؟"

"میں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اسکی آواز سے گھبراہٹ عیاں تھی۔"

"کیا بات ہے۔ آؤ نا ادھر چلیں۔" بائیسکل کی طرف۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

"کیوں؟"

"کوئی دیکھ لے گا ریحان۔"

"تمہارے دماغ پر تو یہی بھوت سوار رہے گا۔ پگلی۔ چلو آؤ۔"

ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن اس نے گھبرا کر جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے صاعقہ۔!"

"کچھ نہیں۔"

"تو چلتی کیوں نہیں ہو۔"

"کوئی دیکھ لے گا۔"

"دیکھ لے گا تو کیا ہو گا۔" جھلا کر ریحان بولے۔

"طوفان کھوٹ پڑے گا۔" وہ سہمی ہوئی بڑبڑائی۔

"کھوٹ پڑنے دو۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

ریحان نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا، ہونٹوں میں سگریٹ دبایا۔ اور پھر سگریٹ کیس واپس رکھتے ہوئے لائٹر سے سگریٹ سلگایا۔ لائٹر کے دم بھر کے خفیف سے شعلے میں انھوں نے صاعقہ کا چہرہ دیکھا۔ انھیں کچھ شبہہ سا ہوا۔ دوبارہ لائٹر جلایا۔ صاعقہ نے منہ پھیر لیا۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے صاعقہ؟"

لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ ریحان آگے بڑھے، اسکا ہاتھ تھام کر برآمدے کی سیڑھیاں اترنے لگے۔ وہ مسحور سی انکے ساتھ چل دی، اسے ہوش تک نہ رہا کہ ابھی ابھی وہ

کن مایوس سوچوں میں ڈوبی تھی، ریحان بازو کے سہارے اسے باغ میں لیکر چل رہے تھے، صاعقہ خاموش تھی، ریحان کا دم اس خاموشی سے الجھنے لگا۔

"صاعقی" انھوں نے چلتے چلتے کہا۔

"جی!"

"تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"اپنے آپ کو بھول گئی ہوں"

"پیار میں اپنے آپ کو بھول جانا تو بہت بڑی سعادت ہے۔ ریحان اپنی لے میں کہہ گئے، صاعقہ چپ رہی دونوں بارہ دری تک آ پہونچے، صاعقہ سیڑھیوں پر ہی بیٹھ گئی۔

"اپنے آپ کو بھول گئی ہو" ریحان بشاش لہجے میں بولے "اس اعتراف کے باوجود پریشان رہتی ہو — بتاؤ گی نہیں کس بات سے پریشان ہو" وہ ایک پاؤں سیڑھی پر رکھ کر گھٹنے پر بازو رکھ کر صاعقہ کی طرف جھک گئے۔

"صاعقہ"

"جی!"

"چپ کیوں ہو" تمھاری خاموشی میری تشویش بن رہی ہے، کئی دنوں سے تمھیں پریشان دیکھ رہا ہوں۔ ہر وقت کھوئی رہتی — تمھارے کچھ نہیں" کہنے کے باوجود تمھاری سراسیمگی چھپی نہیں رہتی۔

صاعقہ سر جھکائے اپنی نحروطی انگلیاں عالم اضطراب میں مسلتی رہی۔ ریحان دیکھ رہے تھے، چند دنوں سے صاعقہ کبھی کبھی، ڈری ڈری رہتی ہے اس میں پہلی سی شوخی ہے نہ طراری — وہ انداز سپردگی بھی نہیں۔ ناز و ادا بھی نہیں۔ کبھی کبھی تو انھیں وہم سا ہونے لگتا کہ وہ ان سے خوش نہیں ہے۔

صاعقہ سر جھکائے بیٹھی رہی، ریحان کے دل میں پھر وہی جو کبھی کبھی انھیں پریشان کیا کرتا تھا، سر اٹھانے لگا۔

"صاعقہ!"

"ہوں۔"

"کبھی کبھی عجیب سا وہم آنے لگتا ہے۔"

"جی۔"

"سوچتا ہوں تم شاید مجھ سے خوش نہیں ہو۔"؟

"ریحان!" صاعقہ پارے کی طرح مضطرب ہو گئی۔

"صاعقہ یہ حقیقت ہوئی، تو۔۔۔ تو۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیا کروں گا۔"

"ریحان۔ خدا کسی غلط فہمی میں نہ پڑیئے!"

ریحان اس کے قریب بیٹھ گئے، صاعقہ نے انکے ہاتھ پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھ دیا۔ ریحان نے اسکا ٹھنڈا کپکپاتا ہوا ہاتھ دبایا آہستگی سے بولے۔

"مجھے معاف کر دو صاعقہ، یونہی تمھیں چپ چاپ دیکھ کر یہ بے ہنگم سا وہم دل میں آجاتا تھا۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ریحان!" وہ بیتابی سے بولی۔

"کس سے۔؟"

صاعقہ پھر چپ تھی۔

"گھر والوں سے؟" ریحان نے پوچھا۔

"نہیں۔"

ریحان حیران ہو کر بولے "پھر کس سے ڈرتی ہو؟"

اپنی تقدیر سے۔"

اس کے رقت انگیز لہجے سے ریحان سر تا پا کانپ گئے، اسے بہلانے کو ہنس کر اس کا ہاتھ دبا کر بولے "پگلی!"

"سچ کہتی ہوں ۔ میں ازلی بدنصیب ہوں" اپنی تقدیر سے ڈر لگتا ہے۔

تقدیر نے کبھی مجھ سے اچھا"

"تمہاری تقدیر میں ہوں صاعقی۔ مجھ پر اعتماد کرو، یہ فضول سے وسوسے دل سے نکال دو۔ میرے الفاظ پر یقین نہیں تمہیں۔ کتنی بار سمجھا چکا ہوں۔"

صاعقہ کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے گرتی دیوار کو سنبھالا دے دیا ہو بڑی عقیدت سے اس نے ریحان کے ہاتھ پر اپنا سر ٹکا دیا ہو۔ اور اسکی آنکھوں سے آنسو ٹوٹی ہوئی مالا کے موتیوں کی طرح گرنے لگے۔

آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے ریحان تڑپ اٹھے، اپنا ہاتھ جلدی سے کھینچ کر انھوں نے صاعقہ کا چہرہ اونچا کیا، گمبھیر آواز میں بولے "یہ آنسو تمہیں زیب نہیں دیتے!" صاعقہ تمہاری رگوں میں نواب بہادر دالدین کا خون ہے جو اپنے پیار کی خاطر دالدین اور زمانے تک سے ٹکرانے گئے تھے!"

"میں کیا کروں ریحان۔ چاروں سمت محاذ ہی محاذ ہیں۔ میں کس کس کا مقابلہ کروں۔" صاعقہ بے بسی کے عالم میں روتے ہوئے کہہ گئی۔

ریحان ان الفاظ کو سن کر مبہوت سے رہ گئے۔ اور پھر اس سے ان چاروں سمت محاذوں کی تفاصیل پوچھنے لگے، صاعقہ ڈری سہمی، کترائی لیکن ریحان کے پراسرار استفسار پر اس نے سب کچھ کہہ دیا، سمیرا کے متعلق ۔۔۔ فوزیہ کے بارے میں اور آج شام سعدیہ چچی کی کہی ہوئی باتوں کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔

ریحان کی طبیعت قابل دید تھی، گھر والوں کا سلوک صاعقہ سے اچھا نہیں

تھا، وہ یہ جانتے تھے، لیکن بہیمیت ان حدود کو چھو جائے گی، انھیں گمان نہ تھا، غصّے سے ان کا رنگ سرخ ہو گیا، سینے میں رنج و غم سے ابال اٹھنے لگے صاعقہ رو رہی تھی۔ لیکن وہ اس طرح مشتعل تھے، کہ صاعقہ کے بہتے آنسو، پونچھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ تسکین کا کوئی کلمہ بھی نہ کہہ سکے۔

"زندگی نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ ریحان" صاعقہ سسکتے ہوئے بولی۔

"اب کچھ دیا ہے تو یہ لوگ چھین لیں گے، — میں — میں کیا کروں ریحان — میں کیا کروں —؟"

اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ بے اختیار رونے لگی۔

"چپ ہو جاؤ" وہ انتہائی افسردہ آواز میں بولے۔

صاعقہ روئے گی۔ تم نے اتنے دکھ اکیلے ہی جھیل لئے، مجھے پہلے سب کچھ کیوں نہ بتایا۔!" بڑی سوگوار آواز میں ریحان کہہ رہے تھے۔

چند لمحے خاموشی رہی، صاعقہ کی دبی دبی سسکیاں اسی خاموشی میں ابھرتی رہیں، ریحان بڑی ہی سنجیدگی سے کچھ سوچ رہے تھے۔

"صاعقہ آنسو پونچھ ڈالو۔ ہمیں حالات کے مقابلے کے لئے تیار ہونا ہے یوں رو رو کر زندگی اجیرن نہ بناؤ۔" ریحان نے تسلی دی، بہلایا، حسین وعدوں کی یاد دہانی کرائی۔

"میں جانتا ہوں، طوفان اٹھے گا، لیکن اس سے ٹکرانے کا میں پورا عزم کر چکا ہوں۔ حالات کو میری مرضی کے مطابق ڈھلنا ہوگا۔ میں اس طوفان کا ہر لمحہ انتظار کرتا ہوں، یاد ہے اس دن میں تمھیں سینما کی بجائے گھاٹی کی طرف لے گیا تھا۔ میں نے یہ قدم دانستہ اٹھایا تھا، میں چاہتا تھا کہ ہمارے پیار کا

ناگزیر ہو جائے بات بڑوں تک پہونچ جائے میں نہیں جانتا تھا کہ یہ افتاد اکیلے تم پر ہی پڑے گی، خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا میں کل ہی دادی حضور سے خود ساری بات کہہ دوں گا۔"

"ریحان۔!" صاعقہ کانپ گئی۔ "نہیں ان سے۔ کچھ نہ کہئے گا۔" اور تاخیر برداشت نہیں کی جا سکتی!" ریحان کے لہجہ میں اتنی گونج تھی کہ صاعقہ مرعوب ہو گئی۔

"ہمارا قصور کیا ہے۔ صاعقہ۔ کیوں سسک سسک کر مر جائیں۔ پیار کرنا جرم تو نہیں، خاندان حائل کیوں ہوتا ہے، ہم اپنی زندگی کی راہیں خود استوار کریں گے، کسی کا ناجائز دخل برداشت نہیں کیا جا سکتا۔" ریحان اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے!۔

"مایوسی گناہ ہے صاعقی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اس طرح مایوس نہیں ہو گی اگر پھر بھی تم نے افسردگی و مایوسی کو اپنے اوپر مسلط کیا، تو میں سمجھوں گا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں۔"

صاعقہ نے ریحان کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اس لمس نے ریحان پر آشکارا کر دیا کہ اسے ان پر کتنا اعتماد تھا۔ ریحان اسے طوفانوں سے لڑنے اور حوادث سے ٹکرانے پر آمادہ کرتے رہے، صاعقہ سہمی ہوئی انکی باتیں سنتی رہی۔ رات خاصی بھیگ چکی تھی پچھلی تاریکیوں کا چاند فلک کے کسی کنارے پر نمودار ہو رہا تھا۔ دونوں وہاں سے اٹھے۔ شانہ بشانہ چلتے برآمدے کی طرف آئے، دو پورچ میں جلنے والی برقی روشنی کا عکس اندھیروں کو چاٹ رہا تھا۔

ریحان نے ہلکی ہلکی روشنی میں صاعقہ کا بھیگا ہوا چہرہ دیکھا۔ "بزدل" وہ مسکرائے، صاعقہ نے سر جھکایا۔

ریحان نے آہستگی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "آج تمہارے وہم و تردد کی آخری رات ہے، صبح میں دادی حضور سے۔!"

صبح نہیں ریحان۔

"کیوں؟"

پرسوں آپ کی سالگرہ ہے نا۔"

"تو کیا ہوا۔؟"

"یہ تقریب تو بخیریت گذر جانے دیں۔"

دادی کا چھینا اور منظور نظر ہونے کی وجہ سے ریحان کی سالگرہ بڑے تزک و احتشام سے منائی جاتی تھی، جشن کا سارا انتظام دادی اپنی نگرانی میں خود کرواتیں، یہ دن عید سے بھی زیادہ خوشی و مسرت سے منایا جاتا تھا۔

اس دن ناشتے کے بعد پورا کنبہ دادی حسن بانو کے کمرے میں جمع ہوتا یہ ایک رسم سی بن گئی تھی، دادی حسن بانو نے ایک سونے کی زنجیر بنوا رکھی تھی ہر سالگرہ کے دن وہ اس زنجیر میں سفید قیمتی موتی پرو دیا کرتیں، پھر وہ زنجیر واپس ہی مخملیں صندوقچی میں رکھ دی جاتی۔

اس کے بعد وہ سب سے پہلے اپنا تحفہ ریحان کو دیتیں، ریحان مسہری پر ان کے قریب بیٹھے ہوتے، سارا کنبہ ان پر ٹوٹا پڑتا، تحفہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تعریفیں ہوتیں، مبارک سلامت کا شور اٹھتا، چھینا جھپٹی ہوتی اس دن دادی کے رعب و دبدبہ میں خاصی لچک آجاتی، شور و غل اور چھینا جھپٹی جیسے عام حالات

ہیں وہ کبھی گوارا نہ کر سکتیں نظر انداز کر دیتیں۔

پھر سارا دن خوشی و مسرت کے بھرپور جذبات سے گزر جاتا۔ رات جشن میں رشتہ دار، دوست احباب شرکت کرتے اور رنگ و بو کی یہ محفل آدھی رات تک جاری رہتی۔

زنجیر میں موتی پرونا حسن بانو کی رسم تھی جسے ہر سال بڑے اہتمام سے پورا کرتیں۔ موتیوں کی مالا یہ ریحان کی نگنی پر اس کی دلہن کو پہنانے والی تھیں کتنی یادگار چیز تھی یہ۔

صاعقہ بچپن میں اس رسم کو بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی گو اسے بہت کم ایسے موقعہ پر ٹھہرنے دیا جاتا تھا، منحوس جو تھی وہ پھر وہ کسی نہ کسی طرح اس موقعہ پر وہاں پہونچ جاتی۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں چھپ چھپ کر یہ رسم دیکھا کرتی۔

"جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اور نظروں کی بیزاری کو سمجھا تمرد خ کیا تھا۔ وہ دانستہ کترا جایا کرتی تھی ہاں انجم چھوٹی تھی اکثر اسے بلا کر لے جاتیں، صاعقہ انکے مجبور کرنے پر کبھی کبھی چلی بھی جاتی تو مسند کے قریب جانے کی بجائے پرے ہٹ کر بیگانہ سی کھڑی رہتی۔

معمول کے بعد آج بھی ناشتہ کے بعد سب زرق برق لباسوں میں دادی حسن بانو کی نشستگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ مسند پر دادی سفید لباس میں اک تمکنت کے ساتھ بیٹھی تھیں انکے بوڑھے چہرے پر سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا، دونوں بیٹے اظہر اور فخر دائیں بائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے، سعدیہ اور فوزیہ، حسن آرا، آغا مرزا بھی مسند پر بیٹھی تھیں۔ ریحان دادی کے دائیں ہاتھ بیٹھا تھا، وہ کسی افسانوی شہزادے

کی طرح دکھائی دے رہے تھے کتنی وجاہت تھی ان میں ۔۔۔ سعدیہ تو بیٹے کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھ رہی تھی، عباد انظر لگ جائے یہی حال دادی کا تھا دل ہی دل میں بلائیں لے رہی تھیں۔

آج ریحان نے صاعقہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس رسم کے موقع پر ضرور دادی کے کمرے میں آئے گی، اس نے بہت ریحان سے معذرت چاہی تھی لیکن وہ کسی صورت ماننے کو تیار نہ تھے، صاعقہ کو وعدہ کرنا پڑا تھا۔ اور اسی وعدہ کو نبھانے کے لئے وہ دھڑکتے دل اور سن ہوتے ہاتھ پاؤں لئے دادی کی نشست گاہ کی طرف جا رہی تھی۔

دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی جانے کہاں سے فوزیہ آن دھمکی کدھر منہ اٹھائے چلی جا رہی ہو ۔۔۔ معلوم نہیں ہے سالگرہ کی رسم ہونے والی ہے، یہ منحوس سایہ جو کہیں دور دفان کرو۔ کسی رسم میں نہ رہنا۔ اور صاعقہ کا دل چاہا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے، اتنی تذلیل۔

اف ۔۔۔ وہ ریحان سے کیا ہوا وعدہ بھول کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

ریحان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار سر اٹھا کر دیکھ رہے تھے مسند کے گرد کافی سا جمع ہو گیا تھا، چھوٹے بڑے خوش تھے، چہک چہک کر باتیں کر رہے تھے۔

"سمیرا نہیں آئی ابھی؟" حسن آرا نے فوزیہ سے پوچھا۔

فوزیہ نے گرد و پیش دیکھا، سمیرا نہیں آئی تھی، اس نے جلدی سے دروازے میں کھڑی کنیز کو بلا کر بھیجا ۔۔۔ لیکن کنیز واپس آ گئی، سمیرا نے اپنا طبیعت کا [illegible] بہانہ کیا تھا۔

فوزیہ کے چہرے پر بشاشت سا چھا گیا۔ سمیرا کے نہ آنے کی وجہ اسے معلوم

بی تھی۔ ریحان کا انتظار شدت اختیار کر گیا۔ تقریباً سبھی لوگ آ پہنچے تھے۔ وہ بے قرار سے نظر آنے لگے۔

دادی حسن بانو نے مخلین صندوقچی اپنے سامنے رکھی۔

"ٹھہریئے دادی حضور" ریحان اٹھتے ہوئے بولے۔

"کیوں۔"

"میں ابھی آیا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"بس ابھی آیا۔" کہتے ہوئے وہ بمشکل جگہ بنا کر باہر نکل گئے۔

صاعقہ کی عمدہ شکنی پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ سیدھے اس کے کمرے میں پہنچے۔ وہ کھڑکی میں کھڑی باہر خلاؤں میں گھور رہی تھی، رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ پلکیں اب تک بھیگی ہوئی تھیں، رخسار و کی سرخی بھی نم آلود تھی۔ ریحان نے اسے دیکھا۔ صاعقہ آہٹ پر پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ اس کے سامنے آ گئے۔ چپ چاپ اسے دیکھتے رہ گئے۔ صاعقہ نے سر جھکا لیا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ امنڈتے آنسوؤں کو آنکھوں ہی میں پی جانے کی کوشش کرنے لگی۔

"آج بھی رو رہی ہو۔؟" بڑی افسردہ سی آواز میں ریحان نے کہا۔ اور صاعقہ کا پیمانۂ صبر چھلک گیا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا، اور روتے ہوئے بولی۔ "میری تقدیر میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے کچھ نہیں مل سکتا۔۔۔ یہ آنسو۔۔۔ ہی ملیں گے۔"

"صاعقی" ریحان نے اس کے ہاتھ [illegible] چہرہ سے ہٹا دیئے [illegible] سے بولے۔

"کچھ ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں! مجھے چھوڑ دیجئے! میں نہیں جاؤں گی وہاں۔"

"کیوں نہیں جاؤ گی۔ کسی نے کچھ کہا۔؟"

صاعقہ روتی رہی۔ بتاتی کیوں نہیں۔ کسی نے کچھ کہا۔؟" ریحان غصے سے کانپ کر بولے۔

صاعقہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔ ریحان کے چہرے پر غصے کے تاثرات اور آنکھوں کی خشمناک سرخی دیکھ کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس وقت پردہ کسی طوفان کو اسٹنڈ نے نہ دینا چاہتی تھی۔

"کسی نے کہا کچھ؟" ریحان نے سختی سے پوچھا۔

"کسی نے بھی نہیں۔" وہ دانستہ جھوٹ بول گئی۔

"پھر کیا ہوا ہے۔؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں رو رہی ہو۔؟"

"دل بھر آیا تھا، اب نہیں روؤں گی۔" وہ مسکرا دی۔

"پھو پھر۔!"

"نہیں۔ نہیں ریحان آپ جائیے، چھوٹی سی بات کے لئے آپ ضد کیجئے!" ریحان کے بار بار اصرار کرنے پر وہ لجاجت سے انکار کرتی رہی۔

"جائے گی کیا وجہ ہے، صرف اتنا بتا دو!"

"کوئی راز نہیں۔"

"پھر بھی۔"

"بتاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہے۔ ایسے موقعوں پر میری تحریر زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔"

سمجھی جاتی ہے۔" بالآخر وہ کہہ اُٹھی۔

"صاعقہ!" ریحان غصے سے کانپتے ہوئے چیخے صاعقہ بمشکل مسکرائی۔

"یہ احساس تمھارے ذہن سے کب مٹے گا صاعقہ۔ میری انتقام کی تو خیر بھی ناکام رہی۔" جانے وہ کیا کیا کہتے رہے لیکن صاعقہ انکے ساتھ جا نہ حامی نہ بھر سکی۔

فوزیہ کا خوفناک لہجہ کانوں میں زہر گھول رہا تھا، اگر وہ اب وہاں گئی تو کیا عجب سب کے سامنے وہ اسکی تذلیل کرے، بھرے مجمعے سے دھکے دے کر نکال دے، وہ اپنی تحقیر سے ڈرتی تھی۔

صرف اتنا بتا دو تمھیں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

صاعقہ نے صبح کا سارا واقعہ انھیں کہہ سنایا، احساس کے تاثرات پر طنز کا پہرا ؤ۔ ریحان خاصے مشتعل نظر آنے لگے۔ ریحان کی طرف دیکھ رہی تھی انکی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا کمرے میں بیتابانہ ٹہلتے ہوئے وہ فوزیہ کے متعلق سوچ رہے تھے، اس وقت وہ انکے سامنے ہوتی، تو شاید وہ کوئی گستاخانہ حرکت کر بیٹھتے۔"

صاعقہ کھڑکی کی طرف پھر مڑ گئی، خلاؤں میں گھورتے ہوئے وہ سوچوں میں ڈوب گئی۔

"صاعقی!" ریحان کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"آؤ!" وہ سنگین آواز میں بولے۔

"نہیں!" وہ گھبرا گئی۔

ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "آؤ دیر ہو رہی ہے۔"

صاعقہ نے انکی طرف دیکھا، کتنی سنگین سی سنجیدگی ان پر مسلط تھی، وہ

گئی۔ کوئی ہنگامہ پھوٹ پڑے گا، اس کے دل سے صدا اٹھی۔
اپنا ہاتھ چھڑا کر وہ پرے ہٹ گئی "یہ تم نہیں جاؤ گی؟" سنگین سنجیدگی میں افسردگی کا عنصر بھی تھا۔
"بھری محفل میں ذلیل ہونے کی مجھ میں ہمت نہیں ریحان" وہ ڈبڈبائی سی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔
"میرے ہوتے ہوئے بھی ایسا ہوگا؟"
"زہریلی نظریں تو ہوں گی۔"
"تم کسی کی پروا نہ کرو!"
"نہیں ریحان"
"میری خاطر سب کچھ گوارہ کر لینا۔"
"ضد نہ کیجئے ریحان — رسم ہو جانے دیں۔ پھر — پھر —"
"رسم تمہارے بغیر کیسے ہوگی!"
"جیسے ہمیشہ ہوئی ہے۔"
"ہمیشہ اور اب میں کوئی فرق نہیں؟"
"آپ کے سوا شاید کسی کے لئے بھی نہیں!"
"تمہیں میری خوشی دیکھنا ہے صاعقہ"
گھبرا کر صاعقہ نے انکی طرف دیکھا، لیکن ڈر و خوف اس پر اس طرح مسلط تھا کہ وہ حامی نہ بھر سکی۔ ریحان چند لمحے منتظر رہے۔ لیکن صاعقہ جانے کو تیار نہ ہوئی، ریحان کی کشادہ جبین پر سلوٹیں سی آگئیں، بے مہری کا گلہ نکا ہوں نے چھلکا بغیر کچھ کہے وہ پلٹے۔ صاعقہ انھیں یوں جاتے دیکھ کر بے قرار ہو گئی۔ دوڑ کر ان کے سامنے آگئی۔ بیساختہ ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"آپ خفا ہو گئے؟"

"میں نہ جانتا تھا کہ میری خوشی کی خاطر اتنی سی بات گوارہ نہ کر سکو گی۔"
وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے اور جانے کے لئے قدم اٹھایا۔ صاعقہ تڑپ اٹھی۔
ریحان کو اداس دیکھنا اس کے بس میں نہ رہا، اپنی ذلت کا خوف اور رسوائی
کا ڈر سب کچھ بھول گئی۔ انکی طرف دیکھا۔ اور پھر سر جھکا کر بولی: "چلئے میں
آپ کے ساتھ چلتی ہوں، میں کسی سے نہیں ڈروں گی۔ فوزیہ چچی بھرے
مجمعے میں مجھے دھکے دے کر بھی ذلیل کریں تو میں آپ کی خاطر گوارہ کروں گی۔"

"صاعقہ" ریحان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔
اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ، دھوپ چھاؤں
کا حسین امتزاج اس کے چہرے کو کتنا پرکشش بنا رہا تھا۔
ریحان قدرے جھکے اور مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر سرگوشی کی: "اب آئی راہ راست پر۔"
صاعقہ آنکھیں بند کئے مسکرا دی۔

ریحان کی خوشنودی کی خاطر صاعقہ ان کے ساتھ چل تو دی، خوف اب
تک اس کے حواس پر مسلط تھا، دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا، ہاتھ
پاؤں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی، ٹانگیں لرز رہی تھیں، نظریں بہک رہی تھیں
کتنے بڑے خطرے سے ٹکرانے جا رہی تھی وہ — آج وہ طوفان پھوٹ پڑے
گا جس کی ہلاکت آفرینی روز روشن کی طرح عیاں تھی، لیکن اسکے باوجود

وہ ریحان کے ساتھ جا رہی تھی، دادی کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی، بالکل ایسے جیسے کوئی معمول کسی عامل سے لگا بندھا چلا جا رہا ہو۔

کمرے میں خاصہ شور تھا، حسن بانو کی مسند گھر کے افراد سے گھری ہوئی تھی کوئی بیٹھا تھا، کوئی کھڑا تھا، کوئی کسی کے سہارے جھکا تھا، شانے سے شانہ ٹکرا رہا تھا، ہر کوئی مسند کے قریب تر ہونے کی کوشش میں تھا۔ خوب خوب باتیں ہو رہی تھیں۔ دادی حسن بانو آج دل کھول کر ہنس رہی تھی۔

صاعقہ کمرے میں داخل ہوتے ہی سہم کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ ریحان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ تعمیل حکم کے لئے آگے بڑھی!۔

"جگہ دو اسد!" ریحان نے اسٹول پر بیٹھے ہوئے اسد کی کمر میں ٹھوکا دیا اسد نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ریحان نے صاعقہ کی طرف اشارہ کر کے جگہ خالی کرنے کو کہا۔ اسد ریحان کی جسارت پر گنگ سے رہ گئے۔

"منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جگہ تو دو۔" کچھ آداب بھی سیکھو!" ریحان مسکرا کر بولے۔ اسد اٹھ کھڑے ہوئے۔"

"آؤ بیٹھو صاعقہ" انھوں نے اسٹول قدرے آگے کو دھکیلا۔

صاعقہ سحر زدہ سی بیٹھ گئی، وہ کسی مجسمے کی طرح تھرائی تھرائی سی تھی، ریحان آگے بڑھ کر مسند پر دادی کے دائیں ہاتھ جا بیٹھے صاعقہ کی طرف دیکھ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرا دئے۔ لیکن صاعقہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں مسکراہٹ کا کیا اثر لیتی، اس کا تو رسوائی کے خوف سے دم نکلا جا رہا تھا، فوزیہ کی طرف صرف ایک دفعہ دیکھا تھا، وہ آنکھیں، جن میں انتقام کی شعلوں کی لپک تھی، کس طرح بے قراری سے اس نے پہلو بدلا تھا مجسم برہنہ نظر آ رہی تھی، جو کسی کا

آشیانہ بھسم کرنے کے لئے مچل رہی ہو اس کے بعد وہ کسی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کر سکی، نظروں کے تیر وہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی، دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا تھا، دم ہوا ہو رہا تھا۔ چہرہ فق تھا اور ہونٹ سفید پپڑ چکے تھے۔

دادی محسن بانو کی اللہ جانے نظر ہی نہ پڑی تھی۔ یا مزاج میں آج ہی اتنی لچک آگئی تھی، کہ اس کی موجودگی کو گوارہ کر لیا تھا۔ فخر چچا اسے دیکھ کر خوش ضرور ہوئے۔ جانے انھوں نے کیا کہا، صاعقہ کے کانوں میں صرف سائیں سائیں کا شور تھا، ان کی بات سمجھ میں نہ آسکی، نہ ہی کچھ جواب دیا۔

ریحان دادی سے چونچلے کر رہے تھے، سب کی توجہ انہی کی طرف بندھ گئی تھی۔ "اب نکالئے بھی زنجیر" ریحان نے مخملیں صندوقچی دادی کے ساتھ رکھ دی!"

دادی نے بسم اللہ پڑھ کر صندوقچی کو کھولا۔ زیر لب دعائیہ کلمے کہتے ہوئے سرخ مخملی ڈبی میں پڑی ہوئی زنجیر نکالی۔

"واہ، واسبحان اللہ" کا شور بلند ہوا۔ سفید موتی طلائی زنجیر میں بڑی آب و تاب سے چمک رہے تھے۔"

"کتنے ہوئے ہیں؟" ریحان نے مالا ہاتھ میں لے لی۔

"چھبیس ہوں گے" کسی نے کہا۔

"ہاں۔ آج ماشاء اللہ تم ستائیس سال کے ہو گئے۔ یہ اب ستائیسواں موتی ہے۔"

دادی نے بسم اللہ کا نام لے کر ڈبی میں سے سفید موتی اٹھایا، دعائیں پڑھتے ہوئے زنجیر میں پرو دیا۔

مبارک سلامت کا شور برپا اٹھا، دادی اماں، پھوپھیوں، چچی، سب نے ریحان کے بالوں پر شفقت سے بوسے دیئے مبارک کہی۔

باپ نے اٹھتے ہوئے ان کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے درازئ عمر کی دعا دی۔ انکی تقلید میں فخر چچا بھی اٹھے، ریحان تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے، فخر چچا نے بڑی محبت سے انھیں لپٹا لیا۔

دعائیں دی جا رہی تھیں، کنیز چاندی کا تھال لے آئی۔ حسن بانو نے کئی طلائی سکے اس میں ڈال دیئے ریحان کا صدقہ اتارا گیا، حاضرین نے حسب استطاعت اس میں نقدی ڈالی کنیز جھک جھک کر سلام کرتے ہوئے تھال واپس لے گئی۔

صاعقہ کے کانوں سے شور ٹکرا ضرور رہا تھا۔ لیکن سمجھنے کی قوت جواب دیتی جا رہی تھی، اظہر اور فخر دونوں بھائی اس رسم کے بعد اٹھ کر چلے گئے۔ پودان کے سامنے ذرا جھک جھک کر تی تھی، آج اس مبارک موقع پر انھیں کچھ تو آزادی ملنا چاہیئے تھی سانکے جاتے ہی محفل میں کچھ حرکت سی آگئی، قہقہے خوشگوار ہو گئے باتوں میں بے تکلفی سی آگئی۔

"یہ موتی کب تک پرو دیئے جائیں گے دادی حضور۔" ریحان نے دانستہ شوخی سے پوچھا۔ حالاں کہ جس مقصد کے لئے یہ مالا بن رہی تھی، وہ جانتے تھے، ہر سالگرہ پر یہی تو دادی وضاحت کرتی تھیں۔

"یہ ستائیسواں موتی ہے۔" دادی نے بڑے فخر سے کہا۔

"بہت ہو گئے اب۔" ریحان نے جلدی سے کہا۔

"اتنے بے صبر نہ بنو" پھوپھی حسن آرا نے اسکے سر پر پیار سے چپت لگائی

"کیوں دادی حضور ــــ بہت لمبی ہو گئی مالا، اب اسے بند کر دیں۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے، یہ آخری موتی ہو گا۔

"پھر کیا کریں گی اس مالا کا؟"

"تمھاری منگنی پر تمھاری دلہن کو دوں گی۔"

"واہ وا۔"

"یہ آخری موتی ہے نا" اسد نے پوچھا۔

"انشاء اللہ" حسن بانو نے جواب دیا۔

"اللہ مبارک کرے۔"

"آمین۔"

کافی دیر یونہی باتیں ہوتی رہیں۔

"دادی حضور!"

"ہوں!"

اجازت ہو تو اس زنجیر کو آگ لگا دوں۔"

"کیوں۔؟" دادی نے پوچھا۔

"اتنی جلدی کس بات کی ہے؟" انجم پھوپھی ہنس کر بولیں۔

"جو کام ختم ہو جائے وہی اچھا ہے ــــ آپ کا کیا ہے، ستائیس کی جگہ اٹھائیس موتی پسند کریں، اور اپنا حساب کتاب اگلے سال میں جا بیٹھے۔"

"اے ہے ــ پگلے ــــ انشاء اللہ اسی سال یہ کام ہو جائے گا۔"

"اسی سال" فرخ نے منہ بنایا۔ "سال بہت ہے نانی حضور۔"

"کیا پاگل ہیں یہ لڑکے، ــــ سال سے مراد بارہ مہینے تو نہیں۔"

"پھر؟"

"یہی دو تین ماہ بعد ــــ عید کے چاند میں انشاء اللہ منگنی کی رسم ادا کر دی جائے گی۔

"واہ ـــ واہ ـــ واہ ـــ" ریحان کے ہم جلیسوں نے نعرے لگائے۔

"تو پھر لائیے میں زنجیر کو آج ہی گرہ لگا دوں۔"

"ابھی کیا ضرورت ہے۔"

"نہیں دادی حضور ـــ پوری ضرورت ہے۔"

سب ہنس دیئے۔ ریحان نے کھینچا تانی کی۔ ماں نے ڈانٹا بھی لیکن دادی نے ٹوک دیا۔ اور رہتے ہوئے زنجیر ریحان کے ہاتھ میں دے دی۔

"لو اپنی خوشی پوری کر لو۔"

ریحان نے سرا کا کنڈا ذرا سا کھینچا اور دوسرے سرے میں اٹکا کر دبا دیا۔

"یہ لیجئے مالا مکمل ہو گئی۔" انھوں نے ہاتھ سے قدرے اوپر اٹھایا۔

مبارک ـــ مبارک کا طوفان تھا۔ تالیوں کی گونج تھی۔ خوشی و مسرت کا ہنگامہ تھا۔

"لائیے اب" دادی نے مالا ریحان کے ہاتھ سے لیکر صندوقچی میں رکھنا چاہی

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"یہ آپ نے میری دلہن کے لئے بنائی ہے نا؟"

"ہاں۔ تو۔؟"

"میں اپنی دلہن کو دے کیوں نہ دوں۔"

"ریحان۔" سعدیہ نے ڈانٹا۔

"کیوں دادی حضور ـــ" ریحان مسکرا کر دادی کی طرف دیکھ کر بولے

"اس کار خیر سے ابھی کیوں نہ فارغ ہو جائیں۔"

"اتنے بیتاب کیوں ہو رہے ہو" پھوپھی حسن آرا نے چھیڑا۔
"پگلا ہے نا" دادی پیار سے بولیں "اتنا شاندار جشن منواؤں گی، اپنے بیٹے کی منگنی کا کسی نے دیکھا سنا نہ ہوگا، اس دن یہ مالا دوں گی۔ تمہاری دلہن کو ــــ سمجھے"
"نہیں دادی حضور۔ ریحان ضد کر بیٹھے۔ جشن جتنا جی چاہے شاندار منا لیجئے لیکن یہ مالا تو میں ابھی پہناؤں گا، اپنی دلہن کو"
ریحان نے مالا ہاتھوں میں تھام لی۔ سب اس کی ضد پر ہنس رہے تھے تو زیبہ البتہ خاصی پریشان نظر آ رہی تھی، کچھ یہی حال سعدیہ کا تھا۔ اور صاعقہ کی حالت تو ناگفتہ بہ تھی، دل رک جانے کی حد تک دھڑک اٹھا تھا۔
"پہناؤ گے کیسے!" دلہن تو یہاں ہے ہی نہیں، پھوپھی حسن بانو نے میرا کی عدم موجودگی کا اشارہ کیا۔
"ہے کیوں نہیں" ریحان نے ترچھی نظروں سے صاعقہ کو دیکھا۔
صاعقہ نے ایک لمحہ کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں سے چھلکتا ہوا عزم دیکھ کر اسکے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ ہاتھ پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں آ گئیں۔ ہاتھ پاؤں برف کی طرح ٹھنڈے ہو گئے۔
"اجازت ہے دادی حضور؟" ریحان نے پھر پوچھا۔
"لیکن دلہن کہاں ہے" حسن آرا نے پھر شوخی سے پوچھا۔
"یہ رہی ــــ" وہ اٹھے اور بڑے ڈرامائی انداز میں بڑھ کر وہ مالا صاعقہ کے گلے میں ڈال دی!
صاعقہ اٹھ کر بھاگ جانے کی کوشش میں تھی، لیکن ریحان نے بیل کی اور مالا اسکے گلے میں ڈالدی۔ تعجب خیز سی سناہٹ سارے کمرے میں پھیل

گئی۔ اور اس کے بعد ایک جامد سناٹا۔ جو حقیقت حال سے باخبر تھے وہ بھی ریحان کی جسارت پر گنگ رہ گئے۔ اور جو بے خبر تھے اسے ریحان کا مذاق سمجھ کر چپ ہو گئے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے ریحان" چند لمحوں کا جامد سناٹا دادی کی گونج سے ٹوٹ گیا۔

"کیوں دادی حضور"

"مذاق حد سے بڑھ جائے تو بیہودگی ہوتی ہے"

"لیکن یہ مذاق کہاں ہے دادی حضور۔" ریحان نے اس سنجیدگی سے کہا کہ دادی حسن بانو پلکیں جھپکا جھپکا کر انھیں دیکھتی رہ گئیں۔

"ریحان ــــ اسد نے جلدی سے انھیں پکارا۔

"ہوں!" وہ مڑے اور پھر تیزی سے لپک کر آگے آئے، صاعقہ اسٹول سے گری جا رہی تھی، اسد نے دونوں ہاتھوں سے اسے سنبھالا دے رکھا تھا۔

"بیہوش ہو گئیں" اسد نے آہستگی سے کہا۔

"صاعقی" ریحان نے اس پر جھکتے ہوئے پکارا۔

"اس کی آنکھیں بند تھیں، اور سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا، برف کے تودے کی طرح ٹھنڈی تھی۔

"صاعقی۔ صاعقی۔ ریحان نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

"ہوش میں نہیں ہیں" بیگم اس پر جھکتے ہوئے بولی۔

"کہیں لٹا دو" فرید قریب آ کر بولے۔

"گری جا رہی تھی سنبھالو تو اسے" بیگم کچھ بھی کہا آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ریحان کے مذاق پر انھیں غصہ بھی آ رہا تھا۔ ان لوگوں کی بے حسی پر دل تلملا اٹھا لیکن۔ جب ریحان نے بڑھ کر صاعقہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور تیزی کے ساتھ

کئے بغیر کمرے سے نکل گئے، یہ تو سب کے ساتھ انجم پھوپھی بھی حیرت زدہ سی ہو گئیں۔

صاعقہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے ریحان دادی کی نشست گاہ سے نکل گئے لیکن پیچھے ایک ہنگامہ چھوڑ گئے، انکے مالا ڈالنے کی جسارت ہی کیا کم تھی اس پر بیہوش صاعقہ کو یوں اٹھا کر کسی کی پروا کئے بغیر جلتی دنیا جلتی پر تیل ڈالنے کے مترادف تھا۔ دادی کے لئے یہ انکشاف نیا بھی اور حیران کن بھی سب کچھ اتنی جلدی اور غیر متوقع طور پر ہو گیا کہ وہ بوکھلا سی گئیں۔

"یہ قصہ کیا ہے؟" بڑی دیر چپ رہنے کے بعد حسن بانو نے جیسے سب سے سوال کیا۔

"ماں کا مقام بیٹی نہ لے گی ــــ" فوزیہ غصے سے بل کھا رہی تھی۔ آخر ابل پڑی۔

دادی نے پلٹ کر فوزیہ کی طرف دیکھا، وہ سراپا شعلہ بنی تھی۔ معاملہ سنجیدہ تھا، دادی نے سب بچوں کو کمرے سے نکل جانے کا حکم دیا سب آگے پیچھے سر جھکائے کمرے سے نکل گئے، دادی کے حضور کسی قسم کا تبصرہ کرنے کی جرأت نہ تھی، اس واقعے سے بھی متاثر نظر آتے تھے۔

کمرے میں حسن بانو اپنی دونوں بیٹیوں اور بہوؤں سمیت رہ گئیں فوزیہ کی حالت قابل دید تھی، سعدیہ بھی پیچ و تاب کھا رہی تھی۔

حسن آرا، انجم آرا، ماں کی طرح بے خبر تھیں، وہ کچھ حیرت زدہ سی دونوں بہنوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ قصہ کیا ہے آخر میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ حسن بانو بولیں۔
"سمجھ میں نہ آنے والی بات بھلا کونسی رہ گئی ہے۔" فوزیہ تلخی کی آواز میں بولی۔
"وہ تو ٹھیک ہے۔" حسن آرا تانت سے بولیں۔ "لیکن سمجھ میں نہیں آرہا" یہ بات ہوئی کیسے ۔۔؟" ریحان تو اسکے سائے سے دور بھاگتا تھا۔ اسے ستانے میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے تو کبھی سیدھے منہ اس سے بات نہ کی تھی۔" سعدیہ سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولی۔
"اب تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے، میں نے کچھ جھوٹ تو نہ کہا تھا" یہ فوزیہ سعدیہ سے مخاطب تھی۔
"اسی بات کی حیرانگی ہے۔" سعدیہ نے جواب دیا۔
"بڑی انہونی بات ہے۔" حسن آرا کہہ رہی تھیں۔
"جو بھی سمجھو، حقیقت تو یہ ہے کہ انہونی ہوگئی۔" فوزیہ غصے سے بولی کافی دیر اسی بات پر لے دے ہوتی رہی، پھر حسن بانو کے استفسار پر فوزیہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔
"بات یہاں تک بڑھ چکی ہے ۔۔" حسن بانو کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
"تو اور کیا۔ بات یہاں تک بڑھی نہ ہوتی تو ریحان آج آپ کے سامنے اتنی جرأت کر سکتا تھا۔" فوزیہ نے ان کے غصہ کو جانچ کر کہا۔
سعدیہ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ انجم آرا خاموشی سے سب کچھ سنتی اور دیکھتی رہیں۔ باتیں ہوتی رہیں ۔۔۔ ریحان سے زیادہ صاعقہ کو کوسا گیا جتنی بد دعائیں دی جا سکتی تھیں، دی گئیں اس کی ماں کے قصے کو از سر نو عریاں کیا گیا۔ یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد بھی دلوں کی آگ سرد نہ ہوئی۔
"مجھے تو اپنی بچی کا خیال آتا ہے۔" فوزیہ آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بولی۔

"اتنا سا منہ نکل آیا ہے اس کا، خواہ نام لے لیا تھا۔ ریحان کے ساتھ رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے۔ خدا جانے اس کا کیا حشر ہوگا۔"

"فوزیہ نے ساری بات ہمیں پہلے کیوں نہ بتائی" حسن بانو فوزیہ کے رونے سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھیں۔

"کیا بتاتی۔ تقدیر میں دکھ ہوں تو انھیں کون بدل سکتا ہے، ہمیں پر بعد پھر وہی صدمہ دیکھنا پڑتا ہے۔" وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ سب سر جھکائے سوچ میں ڈوبے تھے۔ حسن بانو نے سر اٹھایا۔ بھانجی کی ہچکیاں سینے میں تلاطم بپا کر رہی تھیں اس کا دکھ انھیں اپنا دکھ محسوس ہو رہا تھا۔

"سدرہ فوزیہ میرے رہتے ہوئے اتنی مایوس کیوں ہو۔ میں ریحان کی تقدیر کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ اور دیکھوں گی کہ یہ فیصلہ بدلنے کی کس میں مجال ہے تم بچی کو تسلی دو۔ تاکہ انگارہ رو کر اسے جیتے جی مار ڈالو گی۔"

"لیکن امی حضور" انجم آرا پہلی دفعہ بولیں، تقدیروں کے فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں۔"

"اے ہے۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟" حسن بانو نے انجم کو ڈانٹ دیا حالات کا پوری طرح جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کریں۔

"آپ تو خوش ہیں نا؟" شروع ہی سے ان کی حمایت کرتی آئی ہیں" فوزیہ نے طنزیہ کہا۔

"وہ بھی اپنا ہی خون ہے، حمایت کرنے میں برائی کیسی؟"

"آپ تو یہی چاہیں گی کہ وہ منحوس میری بچی کے سینے پر مونگ دلتی رہے۔"

"ناممکن۔ ایسا میری زندگی میں نہیں ہوگا۔" سعدیہ نے تیزی سے کہا "میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہو چکا۔ اسے بدلا نہیں جا سکتا۔" حسن

نے نرمی سے کہا۔

"ڈائن ہمارے ریحان ہی کے لئے تو رہ گئی ہے۔" حسن آرا بولی۔

"آپا آپ بھی تو غضب کرتی ہیں۔ کہاں ریحان کہ اولاد نرینہ میں بلا پیدا ہوتے ہی ابا حضور کو کھا گئی، خاندان پر آفتیں ہی ٹوٹ پڑیں۔

"میں تو اس کا سایہ نہ پڑنے دوں گی اپنے بیٹے پر" سعدیہ غرائی۔

"بیٹا تو لٹو ہے اس پر۔" فوزیہ تلخی سے بولی۔ کس طرح ہاتھوں پر اٹھا کر لے گیا، دادی سے بھی شرم نہ کی، بڑوں کا کچھ لحاظ بھی ہونا چاہیئے"

"سب ٹھیک کر لوں گی۔ سب ٹھیک کر لوں گی" حسن بانو گردن ہلا کر کہنے لگیں، میرے لاڈ پیار سے اس نے بیجا فائدہ اٹھایا ہے، لیکن ناسمجھ ہے میری سختی سے بالا نہیں پڑا۔"

"سختی نے ہمیشہ کام بگاڑا ہے" انجم آہستگی سے بولیں۔

"تمہارا کیا مطلب ہے انجم۔ اسے من مانی کرنے دوں؟"

"پیار سے سمجھا دیجئے مان جائے تو اچھا، ورنہ سختی نہ کیجئے۔"

"اور اس نحوس بلا کو ہمیشہ کے لئے اس کے پلے باندھ دوں؟" حسن آرا بولی۔

"جی تو مطلب ہے ان کا" فوزیہ پھر روہانسی "میرے مطلب سے کیا ہے فوزیہ، انجم کو بھی غصہ آ گیا۔ دیکھنا تو لڑکی کی مرضی ہے، جبراً کسی سے رشتہ میں راضی نہ ہوگا۔

"میری بیٹی عمر بھر بیٹھی رہے" فوزیہ روتے ہوئے بولی۔

"یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر لڑکی کا نصیب ایک سا ہو گیا ہے۔ انجم نے کہنے آرا کر بولی "ہر لڑکی کو آنا ہی چاہیئے"

"یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، بخم!" سعدیہ نے گلے آمیز لہجہ میں کہا۔
"میری بچی کو چپ لگ گئی ہے، اور آپ کے لئے یہ اثر لینے والی بات سی نہیں" فوزیہ بولی۔

"میں ابھی زندہ ہوں فوزیہ" حسن بانو نے غمگین آواز میں کہا۔
"وہ سارا دن اسی قصے کو دہراتے ہوئے گزر گیا۔ رات جشن خاصہ بدمزہ رہا۔ اہل خانہ ہی کے مزاج درست نہیں تھے۔ مہمانوں کی آمد بھلا کہاں تک ماحول کو خوشگوار بناتی۔ جوں توں کر کے وہ دن گزرا فوزیہ نے ہر ممکن کے اشتعال کو بھڑکایا۔ آنسوؤں کے چھینٹے دے کر آگ پر تیل کا کام کیا۔ حسن بانو کی آن، وقار اور رکھ رکھاؤ کو پھنکارتے ہوئے ٹھکرا دیا۔ دوسرے دن صبح ہی صبح انھوں نے ریحان کو اپنی نشست گاہ میں بلا بھیجا۔ ریحان آئے، ان کے چہرے پر نہ پریشانی کے آثار تھے نہ ملامت کے طوفان سے ٹکرانے کو تیار نظر آ رہے تھے۔

حسن بانو کی مسند کے قریب آ کر وہ رک گئے، گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھی حسن بانو کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا، سر تا پا انھیں گھورا لیکن بولنے میں پہل نہ کی

"آپ نے مجھے یاد فرمایا دادی حضور"

"ہوں!"

"فرمائیے!"

"یہاں بیٹھو!"

ریحان مسند کے کنارے پر بیٹھ گئے چند لمحے [illegible] ریحان، حسن بانو کے چہرے سے الجھ رہے تھے۔ دوا کر [illegible] حسن بانو کی طرف [illegible] دیکھا
"ریحان" سنجیدہ اور [illegible] آواز میں [illegible]

"جی" سعادت مندی سے جواب دیا گیا۔

کہنے والوں کے لہجہ کا تناؤ کہہ رہا تھا کہ جھکنے والے دونوں ہی نہیں ہیں۔

"میں نے تمھیں ایک خاص بات کے لئے بلایا ہے۔"

"جی۔"

"میں تم سے کچھ پوچھنا نہیں چاہتی، صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ تمھاری نسبت ہم کمیرا سے ٹھہرا چکے ہیں۔"

"دادی حضور۔"

"اور تمھیں ہمارے فیصلے کا پابند ہونا پڑے گا۔"

"یہ نہیں ہو سکتا دادی حضور۔"

"یہ ہوگا۔"

آواز میں اتنا غضب اور دبدبہ تھا کہ ریحان چند لمحوں کیلئے چپ ہو گئے۔

"دادی حضور۔" وہ وقفے کے بعد لجاجت سے بولے۔

"میں کچھ نہیں سنوں گی۔"

"لیکن مجھے۔۔۔ افسوس ہے۔۔۔ کہ میں آپ کے فیصلے کا پابند نہیں ہو سکتا۔۔۔"

"میں جانتی تھی کہ تمھارا جواب یہی ہوگا، لیکن جذبات کی رو میں نہ بہو سوچ سمجھ لو۔"

"سب سوچ سمجھ کر دادی حضور۔ میرے فیصلے میں کسی کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"بچہ نہ بنو۔۔۔ جاؤ۔ آرام سے سوچو۔ دو چار دن سوچ لو۔ پورے اطمینان سے۔۔۔ تمھیں، میرے فیصلہ کا پابند ہونا ہے نہیں تو انجام کا

خیال خود کر سکتے ہو۔

"دادی حضور ــــ!"

"جاؤ ــــ دو چار دن سوچ لو، پھر جواب دینا۔"

ریحان نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن دادی نے ٹوک دیا وہ جھکے۔ بمنت دادی سے اپنی خواہش کا اظہار کرنے کو لیکن دادی غصہ میں آ گئیں۔"

ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئیں، ریحان ہلتے ہوئے پردے کو دیکھتے رہ گئے۔

اچھا خاصہ ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ریحان اور حسن بانو دونوں اپنی اپنی جگہ ٹس سے مس نہ ہوئے چٹان تھے، نہ دادی جھکنا جانتی تھیں نہ ریحان، گھر کی فضا مکدر ہو چکی تھی ہر دل سہما ہوا تھا۔

انجم آرا ماں کو سمجھاتے سمجھاتے تھک چکی تھیں، لیکن وہ بیٹی کی نصیحتوں پر کان دھرتیں یا بہو کے آنسو دیکھتیں، فوزیہ نے جو محاذ قائم کر رکھا تھا اسے بھی تو دیکھنا تھا۔ دن کا چین اور رات کی نیندیں تقریباً سب کیلئے حرام ہو گئی تھیں بحثیں تکراروں میں بدل رہی تھیں۔ ریحان کے والد نے بند الفاظ میں بیٹے کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا لیکن سعدیہ کو ایک طرف اپنی عزیز بھابی کا خیال تھا دوسری طرف یہ وہم کہ صاعقہ ازلی منحوس ہے، نہ کسی طرح ریحان اور صاعقہ کا بندھن باندھنے کو تیار تھیں۔

فخرو چچا بھی حالات کے پیش نظر ریحان کے حامی تھے، گو اس رد میں اپنی بیٹی

آرہی تھی، تاہم شادی کے معاملے میں جبر کے قائل نہ تھے، بیوی کی ٹکر کے ڈر سے انھوں نے اپنا فیصلہ محفوظ ہی رکھا۔ حسن بانو ریحان کی ضد سے ٹکر لے رہی تھیں، ریحان جتنا اپنی بات پر اڑ رہے تھے، حسن بانو اپنی بات منوانے پر اتنا ہی تل رہی تھیں۔

نوجوانوں کی اکثریت ریحان کی حامی تھی معاملہ خاصہ اُلجھ رہا تھا۔ ریحان کو حق پر سمجھتے ہوئے بھی سب متفکر تھے، دادی سے ٹکرانا کوئی آسان بات تو نہ تھی اپنے وقار ظاہری نام و نمود اور جھوٹی عزت پر وہ بیٹے کو قربان کر چکی تھیں پوتے کو بھلا کیا سمجھتیں۔ ریحان یوں ضد پر نہ آتے تو شاید پھپھی خود نکالا دادی کے نظریئے کو بدلنے میں ممد و معاون ہوتی۔ لیکن یہاں تو ضد کا معاملہ تھا بچوں کے ہاتھ کھلونا بنا دادی کی سراسر توہین تھی، یہ تو ہیں وہ مرگز بھی گوارا نہ کر سکتی تھیں۔ گھر میں جو ہنگامہ مچا ہوا تھا ریحان اس سے قطعاً لاپرواہ تھے، اپنی ناکامی کے متعلق تو انھوں نے نہ سوچنے کی قسم کھا رکھی تھی، (ع) وعدہ اتنا واضح تھا کہ ہر گام پر منزل نظر آتی تھی، انھیں فکر تھی تو صرف صاعقہ کی جوان دنوں اس پھول کی طرح کمھلا گئی تھی، جس کو جھلسا دینے والی گرمی بھی آبیاری نہ ہوئی ہو۔

سارا دن اپنے کمرے میں مقید رہتی، چہرہ زرد ہو گیا تھا، اور زرد کر آنکھیں سوج گئی تھیں، کھوئی کھوئی خوفزدہ سی رہتی، ریحان اسے بہتر سمجھاتے اور تسلیاں دیتے، ہنسانے کی کوشش کرتے جھلا کر غصے بھی ہوتے خفگی کا اظہار بھی کرتے لیکن وہ تو موت سے پہلے مری جا رہی تھی، ریحان کی کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں۔

دادی وضعداری پر جان دینے والی عورت تھیں، رعب و دبدبے سے اپنی من مانی شروع سے کرتی آئی تھیں، حسن بانو نے کئی بار ریحان کو بلا کر ڈانٹنے کا

ارادہ کیا۔

"امی حضور ــــ جوان لڑکا ہے، کوئی ایسی حرکت یا بات کہہ دے گا جس سے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ آپ بھی جانتی ہیں، وہ اپنی ضد کا ہے، اس طرح اور مشتعل کرنا اچھا نہیں ــــ"

حسن بانو کی سمجھ میں یہ نقطہ آگیا۔

"میں خود اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی۔"

"تم کیا سمجھاؤ گی جو اس کی حامی ہو۔"

"آپ کی خوشنودی کی خاطر۔ اسے سمجھانے کی کوشش کروں گی، ورنہ یہ تو فضیحت ہے امی حضور" ــــ مجھے تو یہ بات معیوب نظر نہیں آتی صاعقہ بھی اپنا ہی خون ہے۔"

"بس بس ــــ میں کچھ نہیں سنوں گی ــــ میرا کیا ہوا فیصلہ، پتھر پہ لکیر ہے۔"

"اگر ریحان کسی صورت اس فیصلہ کا پابند نہ ہو سکا؟"

"کیوں نہ ہو گا۔"

"فرض کیجئے نہ ہو سکا تو ــــ؟"

"تو ــــ ....

"ایک بار پھر وہی قصہ دہرایا جائے گا۔ ظاہر کی مثالی آپ کے سامنے ہے میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں بیساختہ طاہر یاد آجاتے ہیں ــــ وہی انداز وہی ضد ــــ" اجم آرا نے اک گہری ٹھنڈی سانس بھری۔

"وہ اپنی من مانی شروع سے کرتی آئی تھیں، صاعقہ سے ہار مان لیتیں تو ماں کی وضعداری کیا ہوتی۔

"ظاہر نے کوئی مستحسن فعل نہ کیا تھا، اب ریحان اسی راہ پر چلنا چاہتا ہے"۔
"ظاہر کا فعل شاید مستحسن نہ ہو، لیکن ریحان کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتیں"
"کیوں؟"
"ظاہر نے ایک ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جسے ہمارا خاندان قبول کرتے ہوئے، ہچکچا سکتا تھا، لیکن صاعقہ اپنی ہی اولاد ہے۔ اپنا ہی خون ہے اپنے مرحوم ظاہر کی بچی ہے، خاندان اسے قبول کرنے میں، ہچکچا نہیں سکتا۔ قادر نام نمود، آن بان کیوں معترض ہوں گی"۔
"لیکن میرا فیصلہ جو ہو چکا ہے" حسن بانو کچھ مرعوب سی نظر آنے لگیں"۔
"وہ وقت گئے امی حضور۔ جب تقدیروں کے فیصلے بلا سوچے سمجھے ہو کر بھی کامیاب ہوا کرتے تھے، آپ دیکھ رہی ہیں کہ ریحان صاعقہ کے بغیر"
"جو کچھ بھی ہے میرا فیصلہ اٹل ہے"۔
بیگم آرا خاموش ہو گئیں، لیکن انھوں نے ماں کو سمجھانے کا خیال چھوڑا نہیں، جس وقت بھی موقع ملتا کوشش ضرور کرتیں، فوزیہ نہ ہوتی تو شاید انھیں کامیابی ہو بھی جاتی۔ لیکن فوزیہ سے نپٹنا مشکل تھا، وہ تو جب بھی حسن بانو کے پاس بیٹھتی رو رو کر ہلکان ہوتی، سمیر ابھی گم صم ہو گئی تھی، دادی جتنا اپنی ضد پر اڑی رہیں تھیں وہ اتنا ہی کامیابی کی امید لگا رہی تھی، بات بڑھتی گئی لڑائی جھگڑے روز کا معمول بن گئے رات گئے تک یہی بحث ہوتی رہی ریحان کو ماری باری کبھی سمجھا چکے تھے جو حامی تھے وہ بھی جو مخالف تھے وہ بھی سارا خاندان جو اس جھگڑے کی لپیٹ میں آیا ہوا تھا، ریحان نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا تھا جس پر سوچنے کی ضرورت ہوتی۔ اپنی بات پر وہ اٹل تھے۔
اسی دن ماں کے ایما پر حسن آرا نے ریحان سے ایک خاصی بحث کی۔ صاعقہ

کی نخوست کے قصّے کو اچھالا۔ اس کی ماں کے فرار کی داستان دہرائی لیکن یہ اوچھے ہتھیار ریحان کو قائل نہ کر سکے۔ ان کا ایک ہی جواب تھا۔

"صاعقہ جیسی بھی ہے، جس ماں کی بھی بیٹی ہے، مجھے منظور ہے۔"

"لیکن تمھاری دادی اماں! یہ بات گوارہ نہیں کر سکتیں۔"

"میں اپنی زندگی کا مختار آپ ہوں۔ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔ دادی حضور کو نہیں۔"

"لیکن یہ بھی تو سوچو، وہ ایک بات زبان سے نکال چکی ہیں، سب جانتے ہیں، کتنی بری بات ہے۔ اور اس کا اثر براہ راست تمہیں پر بھی پڑتا ہے۔"

"قطعاً نہیں۔"

"یہی تو تمھاری ناسمجھی ہے۔"

"میرا عقلمند لڑکی ہے، وہ کسی ایسے شخص کیلئے وبال جان بنا بالکل پسند نہ کرے گی، جو اسے زندگی اور زندگی کی خوشیاں نہ دے سکے۔"

"پھوپھی جان۔ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری لڑکی صاعقہ ہے اس کے بغیر کسی اور کو اپنانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"اس ضد کا انجام جانتے ہو۔؟"

"مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کے بہت سے طریقے آتے ہیں پھوپھی حضور۔ خودسری سب سے بڑا راستہ ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو، میں سب کی خوشنودی چاہتا ہوں۔"

"خاک خوشنودی چاہتے ہو۔ گھر بھر کو تگنی کا ناچ نچا رہے ہو کسی کی سنتے ہی نہیں ــــ میرا میں کیا کیڑے پڑے ہیں۔؟"

"پھوپھی جان ــــ میں اس سے آگے کچھ نہیں سنوں گا۔ میرا اپلاد

آخری فیصلہ وہی ہے، اس میں کسی ٹچک کی گنجائش نہیں، دادی حضور نے برضا
و رغبت میری خواہش کا خیال نہ کیا تو میں ـــــ میں مجبور ہو جاؤں گا۔
مجھے کرنا ہے کسی اور کو نہیں۔ میں اپنے اوپر زبردستی کا فیصلہ مسلط نہیں کروں گا۔"
کافی دیر دونوں میں بحث ہوتی رہی، وہ کل سے دونوں ایک دوسرے کو
قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن قائل کوئی بھی نہ ہو سکا۔ جب یہاں کو
سمجھانے بجھانے کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو پالیسی کو بدلا گیا۔ صاعقہ کو
ڈرایا دھمکایا جانے لگا، فوزیہ تو پہلے ہی اسکی جان کی بیری تھی، اب سعدیہ اور
حسن آرا نے بھی اس کا ناک میں دم کر دیا۔ صاعقہ تو اپنے کمرے میں محصور ہو گئی
تھی۔ بہت کم سامنے آتی حالات جو سنگین صورت اختیار کر رہے تھے، اس سے وہ
بے خبر نہ تھی، اس دن وہ اچانک حسن آرا، اسکے کمرے میں پہونچی، اور بلا تمہید اس
پر برسنا شروع کر دیا۔

"آگ لگا کر تماشا دیکھ رہی ہو، سارے خاندان کو جنجال میں پھنسا دیا ہے۔
ماں کی محبت کم تھی۔ بیٹی اس سے آگے بڑھ گئی، اپنے آپ کو ہی بھول گئی ہو
دماغ عرش پر جا پہونچا ہے جو کچھ تمہاری ماں کی وجہ سے ہوا تھا اب پھر وہی
ہونے والا ہے، بھس میں آگ لگا کر خود الگ ہو بیٹھی ہو۔"

وہ جانے کیا کیا کہہ کر دل کا غبار نکالتی رہی ـــــ صاعقہ پتھر کی طرح
چپ چاپ ان کا منھ تکے گئی، وہ تو اس طرح سکتے میں آ گئی تھی کہ آنکھوں
میں آنسو تک منجمد ہو گئے تھے۔

صاعقہ کی حالت اس مریض کی سی تھی جو پارہ گرمی انتہا کو ششوں اور تسلی دلاسوں کے باوجود موت کو اپنے قریب تر پا رہا ہو۔ نوزیہ کے طعن اور حسن آرا کے طنز و تشنیع سے اسکا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ وہ اب اتنا سمجھ گئی تھی کہ ریحان نے خود سری سے اپنی من مانی کر لی بھی تو بھی۔ خوشیاں اسے اپنے داماد میں نہ ملے سکیں گی، گھر بھر کا تنفر کچھ کم تو نہ تھا۔

حسن آرا طنز کے تیر برسا کر کئی دھمکیاں دے گئی تھی، صاعقہ نے رونے دھونے کے بعد سارے معاملے پر دل جمعی سے غور کیا۔ اسکا آخری فیصلہ یہ تھا کہ وہ ریحان کے راستے سے ہٹ جائے گی، سارے خاندان کو جنجال سے نکالنے کا یہی طریقہ رہ گیا تھا۔ رات ریحان اس کے کمرے میں آئے، وہ اتنی دل گرفتہ، مایوس اور مضمحل نظر آ رہی تھی کہ ان کا دل کٹ گیا۔ انھیں صاعقہ پر غصہ بھی آیا، انکی تسلیوں کے باوجود وہ اتنی ہراساں تھی۔ اور جب اس نے رو رو کر ریحان سے بہت کہا کہ وہ دادی کی بات مان لیں۔ تو ریحان مشتعل ہو گئے۔

صاعقہ نے رو رو کر اصرار کیا: "سارے خاندان میں بھونچال آیا ہوا ہے ریحان ــــ آپ دادی حضور کی بات مان لیں۔"

"صاعقہ" ریحان نے تیخ کر کہا، وہ غصہ میں بھر گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ صاعقہ کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے تیزی سے بولے: "میری ہمت بڑھانے کی بجائے مجھے بزدلی پر آمادہ کرتی ہو۔"

"اسی میں مصلحت ہے ــــ" صاعقہ ان کی مجنونانہ حرکت کو نظر انداز کرتے

ہوئے رو دی۔

"صاعقہ" ریحان نے بھرپور غصے سے جھنجھوڑ کر اسے پرے ڈھکیلا، تم میرے بغیر شاید زندگی گزار لو۔ لیکن میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

وہ مشتعل سے پلٹے، صاعقہ دوڑ کر انکے سامنے آ گئی "ریحان۔ سنو ریحان" وہ بے اختیار ہو کر رو دی۔ ریحان نے اسے بازوؤں میں تھام لیا صاعقہ ان کے کندھے پر سر جھکا کر بے اختیار سی ہو کر ہچکیاں لینے لگی۔ ریحان کا غصہ کچھ دھیما پڑ گیا۔

"مجھے بہت بڑے طوفان سے نپٹنا ہے صاعقی، تم میری ہمت بندھاؤ۔ تمہاری مایوسی مجھے کہیں کا نہ رکھے گی۔"

اسی رات ریحان دادی کے کمرے میں بلائے گئے۔ دادی سے کئی بار الجھ چکے تھے، کئی بار منت و خوشامد سے منانے کی سعی کی تھی، عجز و انکساری سے رام کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ لیکن دادی تو مونگے کی چٹان تھیں، اپنی بات پر پورے جاہ و جلال سے قائم تھیں۔ ریحان کے صبر کے بند بھی اب ٹوٹ گئے، وہ آج طوفان سے آخری بار نپٹنے کے ارادے سے آئے تھے، ان کی چال کی متانت تھی، چہرے پر سنگینی سی بجز گی، مدد نہیں یا خودسری نہیں والا معاملہ نظر آتا تھا۔

دادی اپنے پلنگ پر بیٹھی تھیں، آج ماں سے انھوں نے جھڑپ لی تھی خاصا قائل کر لیا تھا، لیکن سدیہ اور فوزیہ نے وہ طوفان اٹھایا تھا کہ انھیں چپ سرنا پڑا تھا۔

کندھے آہستہ آہستہ دبا رہی تھی، حسن آرا مسہری کے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے زیر بحث دادی موضوع تھا۔

ریحان ایک متانت آمیز چال چلتے دادی کے پلنگ کے قریب آکر کھڑے ہو گئے، سعدیہ کے ماتھے پر انھیں دیکھتے ہی بل پڑ گئے، حسن آرا اور فوزیہ بھی چپ ہو گئیں۔ حسن بانو نے نگاہ اٹھا کر انھیں دیکھا۔

"دادی حضور!"

"میں نے تمھیں طلب نہیں کیا۔"

"کس لئے؟"

"یہ آپ بھی جانتے ہیں۔"

"کسی قسم کی گفتگو سے پہلے جواب دو کہ تم نے کیا سوچا ہے۔"

"عمر بھر بھی سوچتا رہوں تو فیصلہ وہی ہوگا۔ جو آپ کے گوش گزار ہو چکا ہے۔"

"ریحان" سعدیہ نے ڈانٹا، ریحان نے اس ڈانٹ کا کوئی اثر نہ لیا۔

"خود سری پر اتر آئے ہو؟" دادی نے پوچھا۔

"اسی لئے حاضر ہوا ہوں، کہ مجھے آپ خود سری پر آمادہ نہ کریں لہجہ کی تلخی سے دادی بھڑک اٹھیں "تمھارے چچا نے بھی خود سری کی تھی جانتے ہو انجام کیا ہوا تھا۔ وہی حالات پھر پیدا ہو رہے ہیں، سمجھ لو کہ ایک ماں جیسے اپنے بیٹے کی پروا نہ کر سکی، تو تمھاری کیا کرے گی۔ اپنے وقار کی خاطر ہم سب کچھ سہہ گذریں گے۔

"اس میں وقار کا کیا سوال دادی حضور" حسن بانو کے اشتعال کے باوجود ریحان بڑے سکون سے بولے۔

"کیوں نہیں؟"

"کیا صاعقہ آپ کی پوتی نہیں۔؟" ریحان نے مسہری کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دادی کے گھٹنوں کو پکڑ لیا۔ انکی آواز میں گلہ بھی تھا التجا بھی! احتجاج بھی اور استغاثہ بھی

دادی کچھ بوکھلا سی گئیں، صاعقہ کو پوتی تسلیم کرنے سے انکار کیونکر کرتیں۔ حسن آرا نے جلد ہی بات سنبھالی "پوتی ــــ ہونہہ۔ ڈائن ہے ڈائن ــــ"

"چھوٹی جان" ریحان چیخے۔

"ریحان ــــ تمیز کی حدود سے باہر مت نکلو" سعدیہ نے پھر ڈانٹا۔

"ڈائن جو کہہ دیا اس کی چہیتی کو" فوزیہ غرائی۔

"ڈائن نہیں تو اور کیا ہے، پیدا ہوتے ہی ابا حضور کو نگل گئی" حسن آرا نے پھر وار کیا۔

"وہ پیدا نہ ہوتی تو دادا حضور نے دنیا نہ پائی تھی" ریحان نے غضبناک لہجے میں کہا۔

"ریحان" دادی کی آواز میں ڈانٹ تھی۔

"جی"

"تمہاری ان باتوں کا کیا مطلب؟"

"آپ لوگوں کی توہم پرستی نے صاعقہ کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ یہ خود ساختہ باتیں ــــ"

"خود ساختہ!!" فوزیہ تنگ کر بولی۔

"تو اور کیا ــــ صاعقہ کا ان سے کیا تعلق ــــ دادا جان فوت ہو گئے۔ گناہگار صاعقہ، چھوٹی جان کو فضائی حادثہ پیش آیا، مورد الزام وہ بیچاری۔ گودا موں میں آگ لگی چوکیدار کی غفلت سے، عتاب صاعقہ پر ٹوٹا"

ریحان نے جوش میں آکر کئی واقعے دہرا دیئے۔

"ذرا تو ٹھنڈے دل سے سوچئے، نحوست کو اسکی ذات سے وابستہ کرنے

ہیں آپ سب کہاں تک حق بجانب ہیں۔"

"مجھے اس تکرار میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔" حسن بانو جیسے کترانا چاہتی تھیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا، کہ وہ جب سے پیدا ہوئی ہے ہمارے خاندان پر آفتیں ہی ٹوٹی ہیں۔"

"کیا اس کی پیدائش سے پہلے خاندان کسی آفت سے دوچار نہ ہوا تھا؟" ریحان نے دادی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"ریحان!!" سعدیہ نے ٹوکا۔

لیکن ریحان اپنی دھن میں جوش میں آکر بولے۔ "دادی حضور آپ کے جوان سال بھائی مینار سے گر کر ہلاک ہوئے تھے؟ اور وہ جو قیمتی کاغذات اور دستاویزیں جلنے کا ناقابل تلافی نقصان ہوا تھا وہ بھی صاعقہ ہی کی پیدائش کے بعد کی بات ہے کیا؟ آراضی کے جھگڑے میں کئی مزارعے جانِ بحق ہوئے تھے، یہ قصہ بھی تو صاعقہ کی پیدائش سے پہلے کا ہے۔

ریحان نے جوش سے بھڑکتے ہوئے کئی مثالیں دے ڈالیں۔ انکار ممکن کہاں تھا، دلائل سے سب دم بخود سے ہو گئے۔ سعدیہ بار بار بیٹے کو ڈانٹ رہی تھی، لیکن جوش میں وہ بھی کچھ سن نہیں رہے تھے۔ حسن بانو چپ تھیں۔ ریحان کی تقریر کا اثر جو تھا سو تھا، آج دوپہر سے ہی کبھی کبھی نظر آرہی تھیں۔ اس پر انجم نے جو جھڑپ لی تھی، حقائق کو نظر انداز کرنا ناممکن نظر آرہا تھا، انکے اندر کی عورت کسمسا اٹھی تھی شاید صاعقہ سے بھی سامنا ہوا تھا۔ اسکی پریشانی دیکھ کر تو ایک بار دل بیٹھ سا گیا تھا فوزیہ اور سعدیہ واہ ویلا نہ کرتیں تو شاید آج شام کی شفقتوں کے گہوارے دامن صاعقہ کے لئے خود بخود پھیل جاتے، جب سے اب تک ضمیر برابر ملامت کر رہا تھا

"اور پھر ان سب آفتوں کو صاعقہ ہی کی ذات کر جانے کیوں وابستہ کیا جاتا ہے۔

کیا اسکے بعد کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تھا، فرید ماموں کی موت الٰہی سے کیوں وابستہ کی جاتی ہے، میرا سے کیوں نہیں، جو ان دنوں صرف چھماہ کی تھی فریدوں سے کیوں نہیں جو صرف دو سال دن کے تھے؟"

فوزیہ اس زبردست چوٹ سے تلملا اٹھی، سعدیہ اور حسن آرا بھی آتش زیر پا نظر آئیں۔

لیکن حسن بانو چپ تھیں۔ فوزیہ انھیں چپ دیکھ کر غصے سے بھڑک اٹھی، سب کی سب ریحان کے پیچھے پڑ گئیں۔ انجم پرے کھڑکی میں کھڑی سب کچھ خاموشی سے دیکھتی رہیں۔۔ ریحان چند لمحے خاموشی سے سنتے رہے۔

"جو کچھ بھی ہے۔ تم اس کی نحوست سے انکار کر سکتے ہو۔ لیکن اتنا بھی جانتے ہو، اسکی ماں کون تھی؟" فوزیہ نے جیسے سب سے بڑا وار کیا۔

"جو بھی تھی" ریحان متانت سے بولے "اتنی واضح، رفیع و اعلیٰ تو ہو گی کہ اس کے لئے ظاہر جہاز زمانے سے ٹکرا گئے۔"

"ریحان بہت بڑھتے جا رہے ہو" سعدیہ نے سرزنش کے طور پر ڈانٹا۔

"سوچ کر بات کرو" حسن آرا غرائیں۔

دادی اب بھی چپ تھیں، شاید انکے اندر کی عورت کچھ کسمسا رہی تھی۔ ریحان کسی کی پروا کئے بغیر پھر دادی سے مخاطب تھے۔ "دادی حضور۔۔ آپ اتنی سنگ دل کیوں ہو گئیں!"

ریحان کے لہجہ کی رقت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا۔

"ظاہر جہاں پر پابندی لگاتے ہیں بیشک آپ حق بجانب تھیں ہماری خاندانی روایات مجروح ہونے کا سوال تھا۔ لیکن صاعقہ کے بارے میں آپکا ایسا رویہ کیوں ہے وہ تو آپ ہی کا پوتا ہے دادی حضور آپ کے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے"

صاعقہ

عالم جنوں میں ریحان دادی کے گھٹنے بار بار جھنجھوڑ رہے تھے۔

"یتیم بچی آپ کے ہوتے ہوئے بھی ساری عمر آپ کے سایۂ عاطفت سے محروم رہی ہے، ہزاروں یتیم آپ کی ذرہ نوازی کی بدولت زندگی کی لوٹ رہے ہیں، آپ کی نگرانی میں یتیم خانے چل رہے ہیں، لیکن آپ کے ہی آپ کا اپنا خون آپ کی محبت و شفقت کے لمس تک سے محروم ہے۔ بتائیے آپ نے پیار کی نظر سے کبھی اسے دیکھا ہے۔ کیا یہی فرمانِ خدا وندی ہے دادی حضور۔ کیا یتیموں سے ایسا ہی سلوک روا رکھنا چاہیئے؟"

ریحان جوشِ جذبات سے ابل رہے تھے، آنکھیں سرخ تھیں، بال پیشانی پر آ گئے تھے۔

ان کے سیاہ کوٹ کے کندھے پر ابھی تک صاعقہ کے آنسوؤں کے داغ تھے ریحان بولتے گئے۔ ان کے الفاظ جادو کے سانچے میں ڈھلتے گئے، حسن آرا سویرا کو انھیں ٹوکنے کی جرأت نہ ہوئی۔

پتھروں میں دراڑیں پڑنے لگی، سب کے سر جھکے جا رہے تھے، اک تو تھی جو ان جھکے سروں میں اپنی شکست کی ہار دیکھ کر غصے سے چور کھڑی تھی۔

"آپ سب کتنے متقی القلب ہیں، آپ نے کی جیتی جاگتی زندگی موت سے ہمکنار کر رکھا ہے۔ آپ نے بھائی رویئے سے ہیں اسکے زخموں پر نمک چھڑکا ہے کبھی کسی نے پچھا یار رکھنے کی کوشش کی یہ کیا داستان نہیں؟" اس کے سینے میں دل نہیں، وہ ماں کے پیار کی تمنا نہیں رکھتی وہ باپ کی شفقتوں کی تمنائی نہیں، آپ نے اسکی روح اور اسکی خواہشوں کو مٹا دیا ہے۔ کیا ماں باپ کی بچی کو پیار کی محبت سے کہاں تک نوازے اس کو اماں تک پورا کیا ہے جو آپ کے بیٹے کی وفات سے پیدا ہو گئی تھا

نے اپنے مرحوم بیٹے کی روح کی آسودگی کے لئے ابتک کیا کیا ہے، کیا۔ طاہر چچا کی روح اب تک بھٹک نہ رہی ہوگی۔ کیا اسے اس حالت میں قرار آسکتا ہے دادی حضور ــــ دادی حضور ــــ" ریحان ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے دادی کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ نڈھال ہوکر۔

"آپ نے اپنے اندر کی عورت کا گلا کہاں گھونٹ دیا دادی حضور" ریحان نے پھر سر اٹھا کر مجنونانہ انداز میں دادی کے پاؤں جھنجھوڑ لئے"

"چھوٹی آن ــــ ظاہر داری اور تفنن کے لئے اس عورت کو کہاں سلا دیا ہے دادی حضور۔ جس کے سینے میں "ممتا" بھرا دل دھڑکتا ہے"

ادھر ریحان زار زار رو رہی تھی، حسن آرا اور سعدیہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا رہی تھیں۔ حسن بانو بدستور سر جھکائے بیٹھی تھیں، وہ تو جیسے پتھرا ہی گئی تھیں انکے ہونٹوں پر جامد چپ تھی، ریحان بار بار انھیں جھنجھوڑ کر اپنی بات کا جواب مانگ رہے تھے۔

"آپ نے عمر بھر اسے کچھ نہیں دیا، ہر دل میں اس کی طرف سے نفرت و حقارت کا لاوا بھرا ہے بچوں کے ذہن آپ سب نے مسموم کئے، ہر کوئی اسکے سایہ سے ڈرتا تھا، وہ نیک دل آیا نہ ہوتی تو بعید نہ تھا آپ جیسے بھلا دو لوگ، اسے زندہ دفن کر دیتے، گلے میں پھندہ ڈال کر ختم کر دیتے۔ آپ اب بھی اسے کچھ نہیں دینا چاہتیں، اسکی خوشیوں کے گلے گھونٹنے سے بہتر ہے کہ آپ اسی کا گلا گھونٹ دیں ــــ ایک لمحہ کی صورت سے ایک بار ہی مار ڈالیں"

ادھر پھر جانے ریحان کو کیا ہوا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے، جوش میں چیختے ہوئے بولے "آپ اسے کچھ دینا نہیں چاہتیں، تو میں اسے ابھی لے آتا ہوں یہاں آپ اپنے ہاتھوں سے اسکا گلا گھونٹ دیں، تڑپا تڑپا کر مارنے سے ایک

بار ہی ختم کر ڈالیں۔ میں اسے ابھی لاتا ہوں، ابھی لاتا ہوں" وہ دیوانہ وار کمرے سے نکل گئے ۔۔۔ اور۔

چند ہی منٹوں بعد وہ صاعقہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لیکر کمرے میں آئے۔ صاعقہ جو بدحواس تھی، چہرہ فق تھا، آنکھوں میں آنسو جم گئے تھے، شاید کچھ بھی نہ سمجھ پائی تھی۔ ریحان نے پلنگ کے قریب پہونچ کر اسے دادی کی طرف ڈھکیل دیا۔ "یہ لیجئے اپنے ظلم کے شکار کو۔" ابھی آپ کا دل ٹھنڈا نہیں ہوا تو مار ڈالئے اسے ۔۔۔ گلا گھونٹ دیجئے"

ریحان ایک دم رک گئے، حسن بانو نے صاعقہ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹ لیا تھا، انکی بوڑھی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں تھا۔

"میرے بدنصیب طاہر کی مظلوم بچی ۔۔!" وہ اسے دیوانہ وار سینے سے لگائے رو رہی تھیں۔

حسن آرا اور سعدیہ بھی یوں رو رہی تھیں جیسے طاہر آج سے بیس سال پہلے نہیں ابھی ابھی مرے ہوں، اور ان کی بے بار و مددگار بچی ان کے سامنے پڑی بلک بلک کر رو رہی ہو۔

نظارہ اتنا رقت انگیز تھا کہ ریحان کی آنکھوں کے گوشے بھی نم ہو گئے ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے انھوں نے منھ دوسری طرف پھیر لیا۔

ماحول بدل چکا تھا ۔۔۔ اور۔

اس کے ساتھ صاعقہ کی تقدیر بھی، دادی اسے سینے سے بھینچے بے اختیار ہی اور درد سے آنسو بہا رہی تھیں، پچھلی تلخیاں خود بخود دھل رہی تھیں۔

صاعقہ روتے روتے بے دم ہو گئی تھی، آج زندگی میں پہلی بار اس نے دادی کی شفیق گود کی پناہ پائی تھی، وہ اس گود میں تحلیل ہو جانا چاہتی تھی۔

آہ محبت و شفقت کو ترستی ہوئی پیاسی روح!"

بہار کی نشیلی ہواؤں کی طرح جھومتی صاعقہ اپنی خوابگاہ کی طرف بڑھی! شام کے غیر متوقع واقعے نے اسکی زندگی کے رخ اچانک کافرانیوں کی طرف موڑ دیئے تھے، مسرور جذبے اسکے سینے میں ہلچل مچا رہے تھے، اس واقعے کے بعد ابھی تک وہ آپے میں نہ لی تھی۔ آیا ۔۔۔ جو اسکی حقیقی مونس و غمگسار تھی۔

"آیا! وہ مکرے میں داخل ہوتے ہی وہ مسرت سے چلائی، لیکن بی بی کہتے ہی وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

جسے آیا سمجھ کر چلائی تھی وہ آیا نہیں فوزیہ تھی۔ اتنی رات گئے فوزیہ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک جانا قدرتی امر تھا۔ فوزیہ نے سر تا پا اسے گھورا۔ صاعقہ اور سہم گئی، اسکا ننھا سا دل بے طرح دھک دھک کرنے لگا۔

"آ گئی ہور رنگ رلیاں منا کر" وہ کچھ دیر سے اسے دیکھتے ہوئے رخت آواز میں بولی۔

صاعقہ گنگ کی دیوار سے کے قریب کھڑی فوزیہ کو دیکھتی رہ گئی، وہ کمرے کے بیچ و بیچ دونوں ہاتھ پیچھے کر کے باندھے کھڑی تھی، چہرے سے خفگی کے آثار صاف نمایاں تھے، آنکھوں میں ہلاکو کی چمک تھی جو لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی۔

"آج بہت خوش ہو ۔۔۔ میدان مار لیا ہے نا ۔۔۔ گھر والوں کے دل جیت لیے ہیں ۔۔۔" فوزیہ تلخی سے مسکرائی۔

صاعقہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھے جا رہی تھی، زبان گنگ تھی اور گھبراہٹ سے

پسینہ آ رہا تھا۔

"تم جانتی ہو، سمیرا اور ریحان کی نسبت ٹھہرائی جا چکی تھی؟" فوزیہ نے بلا تمہید تنک کر سوال کیا۔ صاعقہ نے سر جھکا لیا، لیکن کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکی۔

"تم اگر نہیں جانتیں تو میں بتائے دیتی ہوں، یہ نسبت قرار پا چکی تھی اور تمہاری آگہی کے لئے یہ بھی کہہ دوں کہ یہ نسبت میری بیٹی کی زندگی کی خوشیوں کی ضامن تھی" فوزیہ نے اک قہر آلود نگاہ صاعقہ پر ڈالی۔ صاعقہ سر تا پا کانپ گئی۔ تمہارے وجود نے حائل ہو کر ساری بساط ہی پلٹ دی ہے، اور آج کے واقعے نے تو میری بچی کی تقدیر پر ابدی ناکامی کی مہر لگا دی ہے۔"

آج سے بیس اکیس برس پہلے بھی یہی ہوا تھا، تمہاری ماں نے میری نغمگی کی بہاریں لوٹ لی تھیں — اور آج تم — تم وہی کردار ادا کر رہی ہو — لیکن ایسا نہیں ہو سکتا —" فوزیہ تڑ تڑ بارش کی طرح کڑکی!"

"چچی حضور —" کانپتے ہوئے جسم کو بمشکل سنبھالے صاعقہ مدھم آواز میں صرف اتنا کہہ سکی۔

"تم بہاریں لوٹو — اور میری بچی کانٹوں سے لہولہان ہو — میں جیتے جی یہ برداشت نہیں کر سکتی، میں اپنی بیٹی کا دامن مسرتوں سے بھر کے رہوں گی۔ تمہیں اس کے راستے سے ہٹنا ہوگا۔"

فوزیہ دو قدم آگے بڑھی۔ اس کی آواز میں خوفناک گونج تھی: "تم اس کے راستے سے اب بھی ہٹ جاؤ۔ نہیں تو یاد رکھنا ایک ماں محرومیوں کی اذیت سے آشنا ماں اپنے لختِ جگر کی مسرتیں لوٹانے کیلئے بھیانک سے بھیانک قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔

صاعقہ کا رنگ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید تھا۔ پٹ کا سہارا لیے کھڑی تھی لیکن ٹانگیں سہارے کے باوجود اس کے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر نظر آ رہی تھیں۔

مدعا عدہ کرو۔"!! فوزیہ آنکھوں سے شعلے برساتے ہوئے بولی "کہ تم ریحان اور کیمرا کے راستے سے ہٹ جاؤ گی۔"

"جی حضور۔" صاعقہ نے سراپا درد بن کر اسکی طرف دیکھا۔ لیکن خونخوار نظروں میں رحم کا شائبہ تک نہ تھا۔ صاعقہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔

"مجھے آنسو سے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میری بات کا جواب دو۔" وہ چند لمحے رکی — پھر غرائی۔ "تم مصالحت پہ آمادہ نہ ہوئیں تو میں دوسرا طریقہ بھی استعمال کر سکتی ہوں۔"

صاعقہ نے سر اٹھا کر دیکھا، اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ فوزیہ کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کی نال کا رخ صاعقہ کی طرف تھا، جان۔ اپنی جان عزیز ہے تو وعدہ کرو۔ نہیں تو میں ایک لمحہ میں تمہیں ختم کر دوں گی۔ میری بچی اگر ناکامی کا دکھ جھیلے گی تو تم بھی بہاریں لوٹنے کے لئے نہ رہو گی۔ بولو — جواب دو — ورنہ —"

تڑاخ ایک ہاتھ لپکا۔ بجلی کی سرعت سے فوزیہ کی ہاتھ پر جھپٹا اور پستول چند گز کے فاصلے پر جا گرا۔ صاعقہ اور فوزیہ نے بیک وقت ادھر دیکھا۔ جھپٹنے والی آیا تھی، جو صاعقہ کے ڈریسنگ روم سے اچانک ہی نکل آئی تھی۔ آیا کی مداخلت پر فوزیہ کا اشتعال اور بڑھ گیا، وہ چیتے کی طرح پستول پر جھپٹی۔ لیکن آیا نے تیزی سے بڑھ کر پستول اٹھا لیا۔

صاعقہ بت بنی وہیں کھڑی تھی، اس کی ساری ہمت جیسے کسی نے سلب کر لی تھی، ایک بے جان تماشائی کی طرح آنکھیں کھولے ہوئے تھی۔

"پستول مجھے دیدو!" فوزیہ نے جھلائے لہجے میں کہا۔ آیا دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"میری راہ میں حائل نہ ہو آیا — ورنہ جان لے کر میرے انتقام کی آگ

تجھے بھی ساتھ ہی بھسم کر ڈالے گی۔" — "فوزیہ خونخوار لہجہ میں بولی۔

آیا نے فوزیہ کی طرف دیکھا — چند ثانیے دیکھتی رہی — اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھوں میں چمک آ گئی — سانس پھول گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا طوفان اسکے سینے کی ہڈیوں سے ٹکرا رہا ہے۔ فوزیہ پستول پر جھپٹی۔

"ہٹے جاؤ!" آیا نے اسے دھکا دیکر ادھر ہٹا دیا۔

"تم کون ہو میرے معاملہ میں دخل دینے والی؟" فوزیہ چیخی۔

"میں — میں —" طوفان پھٹ پڑنے کو بیتاب نظر آیا۔

"میں تباہی دوں کہ میں کون ہوں — میں تیرے سینہ میں بیس سال سے گڑی ہوئی میخ ہوں، میں تیری شکست کی آواز ہوں۔"

صاعقہ نے ششدر ہو کر آیا کی طرف دیکھا۔ فوزیہ خونخواری کے باوجود کچھ بھونچکی سی نظر آئی۔

"بکواس بند کرو۔" فوزیہ پھر آیا سے پستول چھیننے کو لپکی۔

"پرے ہٹ جاؤ فوزیہ۔ کہیں میری بے صبر و بے ہنگام جبلتیں تجھ پر پستول آزمانے پر مجبور نہ کر دیں۔

"تم بہت بڑھ رہی ہو آیا۔ زبان بند رکھو!" فوزیہ غرائی۔

"آج یہ زبان بند نہ رہ سکے گی — زبان بند رکھنے کا عرصہ ختم ہو گیا آج آج میری ریاضت کو ثمر مل گیا فوزیہ — آج میری زبان بند نہیں رہ سکتی۔"

"بیہودہ بدتمیز کیا بک رہی ہے —" فوزیہ آیا پر جھپٹی۔

آیا نے پورے زور سے دھکا دیا، فوزیہ گرتے گرتے بچی۔

"آیا!" فوزیہ ناکامی سے جھلا کر چیخی۔

"آیا نہیں — مجھے ناجی کہو — ناجی —" آیا کے سینے کا نشیب و فراز

طوفان کو روکنے سے قاصر تھا، طوفان پھوٹ پڑا، صاعقہ نے حواس باختہ ہو کر
آیا کی طرف دیکھا۔ اور کچھ دیر کیلئے فوزیہ بھی شل سی ہو گئی لیکن آیا کو ناجی سمجھنا
فوزیہ کے ادراک سے دور تھا۔ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی

"دیکھو ۔۔۔ غور سے دیکھو ۔۔۔ پہچانو مجھے ۔۔۔ میں کون ہوں"

فوزیہ جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔ اور صاعقہ۔ اسکی حالت
کا کفیل یہ تھی، جانے اب تک جو اس پر قابو کیسے پائے ہوئے تھی۔ "تم کہاں
جا رہی ہو گی مجھے ۔ تم تو محو حصہ ہوا مجھے نیست و نابود کر چکیں، لیکن میں سائے
کی طرح تم سے چمٹی رہی"

فوزیہ نے خشمناک نظروں سے آیا کو گھورا۔

"میں اپنی پہچان کروانے کو تیرے دیئے ہوئے لاتعداد داغ دکھا سکتی ہوں۔
ان مظالم کی داستانیں سنا سکتی ہوں، جو تو نے مجھ پر ڈھائے تو نے میری زندگی
کو شمشان بنایا۔ اور اب میری بچی ۔۔۔ کی بہاریں لوٹنے آئی ہے میں تیری
اس کوشش کا منہ توڑ جواب دینے کو زندہ ہوں"

صاعقہ کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے، اس میں اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ
بڑھ کر آیا سے لپٹ ہی جاتی۔

"میں وہ آیا ہوں فوزیہ، جس نے اپنی بچی کی حفاظت نامساعد
حالات میں بھی کی ۔۔۔ اب تو حالات بھی بدل چکے"

"تم ناجی ہو؟" فوزیہ گھورتے ہوئے بولی۔

"تمہارے شکوک رفع کرنے کو میرے سینے کے داغ اب بھی جل رہے ہیں۔
ظالم ڈائن مجھے برباد کر کے تسکین نہ ہوئی۔ جو اب میری مامتا پھوٹنے آئی ہے"

"تم ناجی ہو؟" فوزیہ دیوانوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

آیا اس کی بوالحواسی پر طنزیہ ہنسی دی؟" یقین نہیں تو سینے کے داغو کے ساتھ پیٹ کے وہ داغ دکھا سکتی ہوں، جو صاعقہ کی پیدائش پر آپریشن سے بچنے کے ضامن ہیں۔"

اس ہنسی — طنزیہ ہنسی نے جیسے بارود کو آگ دکھا دی، فوزیہ کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

"تو ناجی ہے۔ اگر واقعی تو ناجی ہے تو میں آج صاعقہ کے ساتھ تجھے بھی ختم کر دوں گی۔ اپنی انتقام کی جلتی ہوئی آگ تم دونوں کے خون سے بجھاؤں گی — تو ناجی ہے۔ تو میں تجھے مار ڈالوں گی —"

بپھرے ہوئے جذبات لئے وہ پاگلوں کی طرح آیا۔ پر جھپٹی، اس کے ہاتھ سے پستول چھیننے کی کوشش میں وہ خوفناک سے خوفناک تر ہوتی گئی آیا پوری قوت سے مدافعت کر رہی تھی۔

اسی ہاتھا پائی میں فوزیہ کا ہاتھ پستول کی لبلبی پر پڑا، اس نے تیزی سے لبلبی دبا دی۔ ایک گولی چل گئی۔ بارود کی دھماکے سے کمرہ لرز گیا، اور سوئی چنگیں اس دھماکے میں ڈوب گئیں۔

گولی کی آواز سن کر محل کا ہر فرد ہڑبڑا اٹھا، سب حیران پریشان کمروں سے نکل کر برآمدے میں آ گئے، دوسری گولی چلنے کی آواز پر سب حواس باختہ ہو کر آواز کی سمت لپکے، صاعقہ کی خوابگاہ میں سب سے پہلے داخل ہونے والے ریحان تھے کمرے کا دھندلا منظر دیکھ کر انکا دماغ چکرا گیا۔ صاعقہ دروازے کے پاس

بیہوش پڑی تھی، آیا اور فوزیہ گتھم گتھا تھیں، دونوں کے ہاتھ پستول پر تھے فوزیہ وحشیانہ طریق سے چیخ رہی تھی ۔ "تو ناجی ہے تو میں تجھے ختم کر کے دم لوں گی ۔ تجھے مار ڈالوں گی ۔ مار ڈالوں گی ۔!"

چند ثانیوں میں کمرہ محل کے افراد سے بھر چکا تھا۔ اطہر نے بڑھ کر فوزیہ کو آیا سے الگ کیا۔ اس کی حالت دیوانوں کی سی تھی، وہ اطہر کے مضبوط ہاتھوں سے بھی نکلی جا رہی تھی، آیا کو کچا چبا جانا چاہتی تھی۔

بمشکل فوزیہ کو دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ آیا سنبھل کر بیٹھی صاعقہ کو بستر پر لٹا کر ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگیں۔ ہر فرد حیران تھا صورت حال سے ناآشنا۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا ایک دوسرے سے ایک ہی نوعیت کے سوالات پوچھے جا رہے تھے۔ پستول میں باقی چار گولیاں تھیں دو گولیاں چھت کے مختلف حصوں میں سوراخ ڈال چکی تھیں۔ حسن بانو بھی موقعہ پر پہونچ گئی تھیں، ہر کوئی حالات سے آگہی پانے کو بیتاب نظر آ رہا تھا ناجی کا ذکر کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ آیا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اسکے انداز اب بھی چیخ رہی تھی ۔ "ناجی کو میں مار ڈالوں گی ۔"

صاعقہ کو ہوش آ گیا، اتنے بڑے ہجوم کو اپنے گرد دیکھ کر وہ پھر گھبرا گئی، آنکھیں بند کر لیں اور بے دم سی نظر آنے لگی۔ ریحان پریشان تھے اور بیتابی سے بار بار صاعقہ کا کندھا ہلا رہے تھے، صاعقہ نے کئی منٹ کے بعد آنکھیں کھول دیں۔ اب اس کا خوفزدہ ذہن حالات کو سمجھنے کی اپنے میں صلاحیت پا رہا تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آیا اٹھی اور صاعقہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی، صاعقہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ آیا کی طرف دیکھا۔ آیا کے ہونٹ کانپ رہے تھے، اس

کی آنکھوں میں آنسو تھے، اپنی بیتاب ماتا کو بمشکل قابو میں کئے وہ صاعقہ کی طرف دیکھ رہی تھی، صاعقہ اسے دیکھتی رہی۔

آیا کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں ممتا کی لہریں اٹھنے لگیں۔ لہریں اٹھتی گئیں اور ان میں صاعقہ کا وجود بہتا گیا۔ بہتا گیا، بہتا چلا گیا۔ اور پھر جیسے اسے یہی لہریں کنارے تک لے آئیں۔ وہ اٹھی اور بیتابی سے آیا سے لپٹ گئی۔

"ماں!" وہ اس سینے سے لپٹ گئی، جس سے لپٹنے کی تمنا نے بارہا اسے تڑپایا تھا، ماں ــــ ماں کے ممتا بھرے سینے سے ناجی نے اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ دونوں کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے۔

کوئی حقیقت حال سے آشنا نہیں تھا۔ صاعقہ کے آیا سے یوں لپٹنے نے ذہن اور الجھنوں میں ڈال دیئے تھے۔ لیکن اسکے باوجود ان دونوں کے انداز نے سب کو متاثر کیا تھا، کافی دیر تک جب حواس درست ہوئے اور فضا کچھ کہنے سننے کو سازگار ہوئی تو حسن بانو کے استفسار پر صاعقہ نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ ہر ذہن جیسے مفلوج ہو کر رہ گیا۔ ہر آنکھ ناجی پر لگی تھی، آڑے ترچھے زاویوں سے سوالیہ پرتھا جا رہا تھا۔

یادوں کی راکھ کریدکر کوئی چنگاری نکالنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن ہر کوشش کے باوجود آیا کو ناجی تسلیم کرنے کا خیال ہی مضحکہ خیز معلوم ہوا آیا پر کئی سوالات کئے گئے۔

اس نے جواب دیئے۔ اس نے گھناؤنے مظالم کی داستان دہرائی۔ اس نے طاہر کے ساتھ اس محل سرا میں قدم رکھنے کے بعد کے کئی واقعے بیان کئے سر ندامت سے جھک گئے کیا نے بھی بچپن کی نظر آ رہی تھی نیک خصلت آیا کو کسی کو نادم کرنا مقصود نہیں تھا لیکن اپنا وجود تسلیم کروانے کیلئے یہ

ضروری بھی تو تھا۔

اب اسے ناجی تسلیم نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا، سب حیرت زدہ سے اسے تکے جا رہے تھے۔

جب ذہنی سکتہ دور ہوا تو ناجی پر پھر سوالات کی بوچھاڑ ہوئی "تم روپوش ہوئی تھیں، تمہاری شکل و صورت پر کیا بیتی۔ تم نے اپنے آپ کو ظاہر کیوں نہیں کیا؟"

ناجی پلنگ پر بیٹھے بیٹھے مسکرائی۔ پھر اسکی مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

مختصر الفاظ میں اس نے سب سوالوں کا جواب دیا۔ بہت کچھ کہنے کے بعد وہ بولی "زندگی سے اتنی دل برداشتہ ہو گئی تھی کہ مر جانے کے سوا چارہ نظر نہ آیا، سیاں مجھے باہر لے جانے کی تیاری کر رہے تھے لیکن فوزیہ نے اس رات دھمکی دی کہ اگر میں نے سیاں کو یہاں سے لے جانے کی کوشش کی تو مجھے یہاں نہیں ان کی لاش ملے گی۔"

"کم عمری اور ناتجربہ کاری تھی، جینے سے پہلے ہی بیزار تھی، اس تنبیہ نے رہا سہا سکون بھی لوٹ لیا، اسی رات میں زندگی کا جوا ہارنے کا تہیہ کر لیا۔ سیاں کو سوتے چھوڑ کر میں کمرے سے نکلی۔ اور محل کے پچھواڑے اسی پتھر سے دریا میں کود گئی۔ جہاں اکثر بیٹھ کر اپنے حالات پر آنسو بہایا کرتی تھی۔"

سنسنی خیز واقعات سن کر سب کے سانس اوپر کے اوپر رہ گئے تھے۔

"لیکن موت نہ آئی۔ لہریں مجھے بہا کر دور لے گئیں، جب ہوش آیا تو میں ایک دیہاتی مکان میں تھی۔"

چند لمحے چپ رہی، پھر بڑے دردناک انداز میں اپنی پوری داستان

سناڈالی، اس دیہاتی مکان میں اس پر کیا بیتی۔ اور کس طرح اپنی عزت و آبرو بچانے کے لئے اس نے تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگائی۔

ناجی روتے ہوئے اپنے مصائب کی داستان سنا رہی تھی سب دم بخود تھے۔ دو سال میں ہسپتال میں اپنے زخموں کی چارہ جوئی کیلئے رکھوت نے سر بار مجھ سے آنکھیں چرائیں، ہسپتال میں ڈاکٹر صنید کے مشفقانہ رویے سے میری ٹوٹی ہوئی ہمت بندھی، وہیں میں نے زندگی سے مصالحت کر لی۔ میرا حلیہ سر تا پا بدل چکا تھا، بڑی مدت تک اس تبدیلی سے میں خوفزدہ رہی، اپنی صورت دیکھ کر گھبرا آتی تھی۔ لیکن صورت کی یہی تبدیلی میرے حق میں حفاظت ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر صنید کے ہاں بچے کی آیا کی حیثیت سے ملازم ہو گئی اور جب وہ تبدیل ہو کر اس شہر میں آئے تو میں بھی یہاں آ گئی۔ اپنی مامتا کی تڑپ جو میں نے یہاں آ کر محسوس کی بیان نہیں کر سکتی۔ شاید اس تڑپ ہی نے مجھے میری بچی سے ملا دیا۔ صاعقہ کی آیا بن کر مجھے اپنے سارے دکھ بھول گئے۔" وہ چند لمحے پھر رکی۔ آنچل سے آنسو پونچھے، اور پھر بولی "یہاں کسی نے مجھے پہچانا نہیں — اور نہ ہی اس خوف سے میں نے کسی کو اپنے متعلق بتایا — کہ کہیں ناجی سے دشمن عود نہ کر آئے، اور میں اس سعادت سے محروم ہو جاؤں جو اپنی بچی کو اپنے ہاتھوں پالنے سے میرے نصیبوں میں آئی تھی، سیاں کی موت کا اندوہناک صدمہ جھیل کر بھی میں مطمئن تھی، یہاں سیاں نہیں تھے، لیکن ان کی یادیں ہر چیز سے وابستہ تھیں، ان کی یادگار سب سے بڑی یادگار صاعقہ میرے پاس ضرور تھی اب زندگی تلخ نہیں تھی لیکن ناگوار ضرور تھی۔ آیا کی آواز رندھ گئی، آنسو بیتری سے بہنے لگے۔ صاعقہ اس کے بازو میں سمٹی، ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

آنکھ پرنم تھی، ناجی کے لئے عقیدت ہر دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ اس وفا کے پیکر کو سب احترام سے دیکھ رہے تھے، کچھ دیر سوگوار سی خاموشی رہی پھر یکایک آگے بڑھے ان کے جذبات میں شدید ہلچل تھی، آپا کے سامنے دوزانو بیٹھتے ہوئے اپنا سر اس کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

"آپ کتنی عظیم ہیں" وہ گلوگیر آواز میں بولے "یہ کتنے دکھ جھیلے آپ نے" ناجی نے صاعقہ کی پشت سے اپنا بازو کھینچا، دونوں ہاتھوں سے ریحان کا چہرہ تھام کر جھکا اور ان کی فراخ پیشانی پر محبت سے بوسہ دیتے ہوئے بولی "میرے بچے۔ تجھے ان دکھوں کا اس لمحے ذرہ بھر احساس نہیں آج میں کتنی خوش ہوں، کوئی نہیں جان سکتا"

ناجی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے

"تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں بچی" حسن بانو ناجی کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں یہ ناجی احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور حسن بانو نے اپنی وضعداری کے شکار کو سینے سے یوں لگا لیا جیسے یہی ان کا سرمایہ حیات ہو۔ انکی آنکھیں بھی پرنم تھیں۔

ناجی کی عظمت کے سامنے سب سرنگوں تھے۔ اس رات کوئی نہ سو سکا، خوشیوں اور مسرتوں کی پیغامبر تھی۔ فوزیہ کا دماغی انتشار ختم ہو چکا تھا، صوفیہ نے اسے ناجی کی داستان الم کہہ سنائی سویا ہوا ضمیر جاگ اٹھا، وہ حسن بانو کی نشست گاہ میں آئی جہاں ناجی حسن بانو کے پاس بیٹھی تھی صاعقہ ریحان اسکے دو بیٹے اور حسن آرا نوگی بائیں طرف بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وہ سیدھی ناجی کی طرف اٹھی اسکے قدموں پر جھک گئی آنسوؤں میں رندھی آواز سے اپنے بہیمانہ رویئے کی معافی

چاہنے لگی۔ ناجی نے پاؤں کھینچ کر فوزیہ کو اٹھایا اور گلے سے لگا لیا اور دونوں رو رہی تھیں۔ ایک اپنے جرموں کو سیاہی دھونے کے لئے اور دوسری ان جرموں کی بخشش کے لئے عفو تقصیر کا یہ مظاہرہ اتنا جاں گداز تھا کہ کوئی آنکھ نم ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

ختم شد

خواتین کے لئے پاکیزہ اور اچھے اچھے ناول

• ناہید	رضیہ بٹ	10/-
• وحشی	"	10/-
• عاشی	"	10/-
• نمو	"	5/50
• ہمسفر	ابن حیات	8/-
• مریدہ بیگم	بدر النجم	5/50
• خوفیہ	فرحت یاسمین	6/50
• قدسیہ	ایم اسلم	9/-
• کرن	زبیدہ خاتون	6/50
• ترنم	"	7/-
• کنیز	نذر زیدی	4/50
• فریدہ	بیگم مشتاق علی	12/-
• زنوبیا	بلقیس ظفر	8/-
• دکھ سکھ اپنے	رضیہ بٹ	1/50
• بجھتے چراغ	سعیدہ بیگم	5/-
• ایثار	ابن حیات	5/-
• جزا	"	5/-
• اپنا اپنا نصیب	این اے بیگم	10/-
تیرے جہان میں	سیدہ ناز کاظمی	6/-